پریم ناتھ در

چناروں کے سائے میں

(پریم ناتھ در کے افسانے)

ترتیب و تہذیب

جی. آر. حسرت گڈھ

فنکار کلچرل آرگنائزیشن

۱۵۹۔ ہاؤسنگ کالونی۔ لال بازار۔ سری نگر۔ کشمیر

© ڈی۔پی۔ در۔ ابن پریم ناتھ در

B.20

اشاعت اول : مارچ ۱۹۹۱ء

مطبع : جے، کے آفسیٹ پرنٹرز، دہلی

ناشر : فنکار کلچرل آرگنائزیشن، لال بازار، سری نگر

سرورق : بشیر شورہ

قیمت : -/۵۰ روپے

تقسیم کار

۱۵۹۔ ہاؤسنگ کالونی لال بازار، سری نگر، کشمیر

ترتیب

صفحہ

پیش کلام

شاید یہ واقعہ ۱۹۶۲ء کا ہے جب کہ مرحوم شمیم احمد شمیم ریاستی حکومت میں کلچرل آفیسر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ ان کے دفتر میں ادبی مجلسوں کا اہتمام ہوا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں ایک ادبی مجلس میں مرحوم پریم ناتھ در نے اپنی کہانی 'نیلی آنکھیں' پڑھی اور محفل کی صدارت عرش ملسیانی کر رہے تھے۔ محفل میں کچھ مقامی ادیبوں نے در صاحب پر سخت تنقید کی مگر وہ مسکراتے ہوئے ہر سوال کا جواب دیتے رہے۔ پریم ناتھ در مستقل طور پر اگرچہ دہلی میں ہی رہتے تھے مگر اپنے بچپن کے ماحول کو جو ان کی کہانیوں میں جھلکتا تھا کبھی نہیں بھولے تھے۔ پریم ناتھ در کا تعلق کشمیر کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔ آپ ۲۵ جولائی ۱۹۱۴ء بڈی یار بالا حبہ کدل سری نگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پنڈت رام جو در اس سال میں دنیا سے چل بسے تو ان کی پرورش ان کے چاچا شوجی در نے کی۔ ابھی چھٹی جماعت میں ہی پڑھتے تھے کہ شوجی در فوت ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی دیکھ بھال مادھو جو در نے کی اور مادھو جو در کے مرنے کے بعد پریم ناتھ در کی پرورش نیل کنٹھ در نے کی۔ در صاحب کا کہنا ہے کہ وہ نہایت سخت گیر شخص تھے لیکن جب جوان ہوئے تو نیل کنٹھ در کی بے حد تعریف کرتے تھے اور اکثر کہا کرتے تھے

کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ اُن ہی کی بدولت سے ہوا۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی ماں جے مالا بھی اس دنیا سے چل بسی۔ پریم ناتھ در نے ایس۔ پی مڈل سکول فتح کدل میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد سری پرتاپ ہائی اسکول میں دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا پھر ایس۔ پی کالج سری نگر میں داخلہ لیا جہاں سے فلسفہ، انگریزی، تاریخ اور اردو میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ کالج کے زمانے میں پریم ناتھ در کشمیر کی تحریک حریت کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ اگرچہ اس وقت اس تحریک میں وہاں کے مسلمان ہی پیش پیش تھے پھر بھی پریم ناتھ در نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ جب ۱۹۳۸ء میں مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کیا گیا تو اس وقت جن تعلیم یافتہ کشمیری پنڈت نوجوانوں نے اس تحریک میں حصہ لیا، ان میں پران ناتھ جلالی کشپ بندھو، شام لال صراف، پریم ناتھ بزاز، جیالال کلیم، شام لال زیون، ڈی۔ پی۔ در، جیالال کشمیری، جانکی ناتھ سپرو، روگھناتھ دلشنوی، مصری لعل مصری اور پریم ناتھ در قابل ذکر ہیں۔ اس تحریک کی رہنمائی شیخ محمد عبداللہ کرتے تھے۔ پریم ناتھ در نے ہندو ترقی پسند جماعت کی بنیاد ڈالی اگرچہ اس وقت در خاندان کے کچھ افراد شخصی نظام کے روح رواں مانے جاتے تھے اور اعلیٰ عہدوں پہ کام بھی کرتے تھے اور ساتھ ہی اس تحریک کو کمزور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مگر پریم ناتھ در نے ترقی پسند تحریک کے نظریے کے ساتھ اپنی وابستگی نہیں چھوڑی۔ آپ مارکسی نظریے حامی تھے۔ پریم ناتھ در اپنے ثقافتی ورثے کو ساتھ لے کر ہی ترقی پسند تحریک کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کشمیر کے شاندار ثقافتی ماضی کو میں فراموش نہیں کروں گا جس ثقافتی ماضی کی چھاپ برصغیر کی تاریخ پہ چھائی ہوئی تھی ۱۹۳۸ء میں در صاحب تلاشِ معاش کے لیے لاہور چلے گئے لیکن وہاں پہ وہ تحریک آزادی کے لیے کام کرتے رہے اور نوکری کا خیال اُن کے ذہن سے

اتر گیا۔

جب میں ۱۹۸۶ء میں دہلی مسلم ہوٹل انار کلی لاہور کے مالک سردار عالم خاں سے ملا تو انھوں نے فرمایا کہ کشمیر کی سیاسی آزادی چاہنے والوں میں سے جن حضرات نے سخت تکلیفوں کے باوجود لاہور میں تحریک کے لیے کام کیا ان میں بخشی غلام محمد پریم ناتھ در اور غلام محمد صادق بھی پیش پیش تھے۔ پریم ناتھ در لاہور میں مارکسی نظریہ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ ملتے رہتے تھے اور کشمیر کے سیاسی سرگرمی کے بارے میں اخباروں میں لکھتے تھے۔ شام کے وقت بخشی غلام محمد اور پریم ناتھ در اخباروں کے حاشیے (PRESS CUTTINGS) جمع کرتے تھے۔ سردار عالم کا کہنا ہے کہ لاہور کی گرمی کی وجہ سے سرد علاقوں کے لوگوں کے جسم پر چھوٹے چھوٹے دانے نکلتے تھے۔ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ملتانی مٹی دوائی کے طور استعمال کیا کرتے تھے۔ انہی لوگوں کی کاوشوں سے ہندوستان اور بیرونی ملکوں کے لوگ تحریک آزادی سے روشناس ہوئے۔ اس وقت لاہور میں اردو ادب کے درخشاں ستارے موجود تھے جو مختلف اخباروں اور رسالوں کے ساتھ وابستہ تھے۔ چونکہ خبریں چھاپنے اور حاشیے جمع کرنے کے دوران پریم ناتھ در کا وہاں کے ادبا کے ساتھ بھی رابطہ پیدا ہو گیا۔ جس کی بدولت انھیں اردو کے ساتھ لگاؤ پیدا ہوا۔ پریم ناتھ در کی ذہانت کا اعتراف شیخ محمد عبداللہ نے اپنی سوانح حیات میں یوں کیا ہے۔

> "ہم نے تنظیم کے لیے لال زمین پر سفید ہل والے نشان کا جھنڈا منظور کر لیا۔ اس جھنڈے کا بنیادی ڈیزائن ایک جوشیلے کارکن پنڈت پریم ناتھ در نے پیش کیا۔ جس میں تھوڑی ترمیم کے بعد اسے منظور کر لیا گیا۔"

۱۹۴۰ء کا واقعہ ہے جب دہلی کے رام لیلا میدان میں پریم ناتھ در نے تقریر کی جس سے دہلی میں رہنے والے ایک کشمیری پنڈت کافی متاثر ہوئے اور در صاحب کو اپنے گھر لے گئے جہاں ان کی بیٹی للتا دیوی بھٹ کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپی گئی اس کی وجہ سے ان کے مصائب اور پریشانیوں میں کمی واقع ہوئی اور اتفاق یہ ہے کہ ۹ مئی ۱۹۴۰ء میں پریم ناتھ در نے اسی للتا دیوی بھٹ سے شادی کی۔ کشمیر کی آزادی کی خاطر وہ ہر وقت فکر مند رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سرکاری ملازمت اختیار نہیں کی۔ ۱۹۴۰ء میں ہندوستان ٹائمز کے مدیر دیو داس گاندھی سے ملنے گئے۔ در صاحب کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر مدیر موصوف نے در صاحب کو اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی یہاں انھوں نے برابر چار سال تک کام کیا۔ اس کے بعد اسٹیٹسمین (STATESMAN) سے وابستہ ہوئے۔ ۱۹۴۶ء میں حلقہ ارباب ذوق لاہور کی ایک شاخ کا قیام دہلی میں ہوا جس کے روح رواں در صاحب ہی تھے۔ اس حلقہ کی ہر ایک میٹنگ عربک کالج ہال دہلی میں ہوتی تھی۔ حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد "آنکھیں ترستیاں" میں لکھتے ہیں۔ "جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آ گئے تو دہلی میں جو سب سے پہلے ادبی مجلس جمی تو وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ان دنوں کالج میں پڑھتے تھے۔ وہ پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے ان کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ اس ادبی انجمن کا قیام جنوری ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ اس کے پہلے سکریٹری میراں جی اور نائب سکریٹری اکرام قمر تھے۔ اس کی مجلسوں میں اردو ادب کے نامور ادیب شرکت کرتے تھے۔ جن میں حامد علی خاں، پریم ناتھ در، ظہور الدین احمد، مختار صدیقی، شیر محمد اختر، خورشید الحسن، ضیا جالندھری، پریم ناتھ شرما، محمد حسن عسکری، اعجاز بٹالوی،

اسلام الدین، غلام عباس، راجندر ناتھ شیدا، رفیق خاور، تابش دہلوی، عبادت بریلوی، وقار عظیم، ن-م-راشد، دت بھارتی، آغا بابر، ارشد مختار، امر سنگھ، نریندر ناتھ سیٹھ، جوش ملیح آبادی، اپندر ناتھ اشک، راجہ مہدی علی خاں، شاہد احمد دہلوی۔
مشہور افسانہ نویس مانک ٹالہ "فن اور شخصیت" بمبئی۔ آپ بیتی نمبر میں لکھتے ہیں۔

"ہر اتوار کو حلقۂ اربابِ ذوق کے ہفتہ وار اجلاس ہوتے تھے۔ پریم ناتھ در مرحوم اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو کے ہفتہ وار رسالہ آواز کے ایڈیٹر تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے ہفتہ وار اجلاس ان ہی کی رہائش گاہ پر ہر اتوار کی شام کو ہوتے تھے۔" جناب مانک ٹالہ کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ پریم ناتھ در اس انجمن کے روحِ رواں تھے مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انجمن کی ہر مجلس عربک کالج دہلی میں ہوتی تھی جس کی ہر میٹنگ میں پریم ناتھ در شامل ہوتے تھے اس حلقہ کی ایک مجلس میں در صاحب نے اپنا پہلا افسانہ "غلط فہمی" پڑھا۔ اس مجلس کی کارروائی میراجی لکھتے تھے۔

۱۰ فروری ۱۹۴۶ء اس ہفتہ وار مجلس کی کارروائی۔
چار بجے شروع ہوئی اور چیزوں کے علاوہ پریم ناتھ در نے اپنا افسانہ "غلط فہمی" پڑھ کر سنایا، اس کارروائی میں جو لوگ شامل تھے ان میں میراجی، شاہد احمد دہلوی، حامد علی خاں، ظہیر الدین احمد، خورشید الحسن، ضیا جالندھری، محمد حسن عسکری، ارشد مختار، تابش دہلوی، عبادت بریلوی، افضل اقبال، شمشیر بترا، اعجاز بٹالوی، اسلام الدین، غلام عباس، راجندر ناتھ شیدا اور رفیق خاور قابل ذکر شخصیتیں تھیں۔ اس میٹنگ کی صدارت شاہد احمد دہلوی نے کی اور مجلس کی کارروائی میراجی نے قلمبند کی۔

"پروگرام کی دوسری چیز پریم ناتھ در کا افسانہ "غلط فہمی" تھا۔ تپ دق کا ایک مریض ہے اور اس کی بظاہر محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی۔ لیکن متعلقین کے اصرار کے باوجود وہ اپنا علاج نہ کرانے پر مصر ہے۔ اس کا ایک گہرا دوست علاج کا بیڑا اٹھاتا ہے اور مریض میاں اور اس کی بیوی کو تپ دق کی ایک صحت گاہ میں لے جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلتا ہے کہ مریض کو اپنی بیوی کی وفاداری پر شک ہے۔ یہی شک علاج سے پہلو تہی کا باعث تھا۔ نفسیاتی لحاظ سے مریض کی الجھی ہوئی ذہنیت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ اگر اسے حقیقتِ حال معلوم ہو جائے تو وہ بہت جلد روبصحت ہو جائے گا۔ حقیقت حال اسے معلوم ہو جاتی ہے جو کہ بیوی کی بیوفائی ہے مگر صحت یابی کے متعلق اس کا اندازہ غلط نکلتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ علاج کے اس قلیل وقفے میں دوست اس کی بیوی سے عشق بازی کرتا ہے لیکن اس میں اس کی ناکامی کا سبب وہ گنوار نوجوان ہے جو مریض کی موت کا باعث ہوا۔ بیوی اس گنوار لڑکے کے ساتھ چل دیتی ہے اور دوست اپنے گھر۔

کہانی کے متعلق تبادلۂ خیال کے سلسلہ میں اعجاز بٹالوی کا خیال تھا کہ بیان اور پلاٹ کو دیکھتے ہوئے کہانی میں بہت سی غیر ضروری تفصیلات ہیں۔ میراجی کی نظر میں کہانی موجودہ صورت میں بھی اچھی تھی۔ اعجاز بٹالوی کا کہنا یہ تھا کہ افسانہ نگار نے محبت کے بارے میں جس قسم کا جذباتی اور شاعرانہ انداز رکھا ہے وہ مناسب نہیں۔ لیکن ظہور الدین احمد کو اس سے اختلاف تھا۔ ان کی رائے میں یہ بیان صحیح تھا کیونکہ اسی سے تو طنز اور ستم ظریفی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کی رائے میں بھی یہی بات صحیح تھی۔ کیونکہ اسی پر انھوں نے کہانی کی بنیاد رکھی تھی کہ آخر تک پڑھنے والوں کو محبت ہی کا دھوکا رہے ظہور الدین کی

رائے میں بیوی کی تصویر صاف نہ تھی۔ میراجی کا کہنا ہے یہ تھا کہ دوست اور بیوی نیز گنوار نوجوان آس پاس کے کردار ہیں۔ بنیادی اور مرکزی کردار مریض کا ہے اور اسے افسانہ نگار نے بہت اچھی طرح اجاگر کیا ہے۔ ظہورالدین کی رائے میں کہانی کے انجام کا حصّہ اور وہ حصہ جس میں تپ دق کا بیان ہے نمایاں طور پر کامیاب تھا۔ غلام عباس کی رائے میں کہانی بحیثیت مجموعی کامیاب تھی۔ البتہ عبادت بریلوی کو اعتراض تھا کہ زبان کے لحاظ سے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ اس کی تائید بعض اور حضرات نے بھی کی۔

یہ افسانہ غلط فہمی لاہور کے مشہور اردو رسالہ 'ادبی دنیا' میں شائع ہوا۔ جس کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد تھے۔ رسالے کے اداریہ میں وہ لکھتے ہیں:۔

"پریم ناتھ در ہمارے افسانوی افق پر طلوع ہوتے ہی چمک اٹھا ہے اور اگر وہ نوجوان ہے تو پھر ہمارے موجودہ استادوں کو آگے بڑھائے گا اور فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑے گا۔" اس کے بعد پریم ناتھ در کے افسانے ملک کے مختلف اعلیٰ اور معیاری رسالوں میں چھپتے رہے۔

"ادبی دنیا" کے ایک اور شمارے میں مولانا صلاح الدین احمد لکھتے ہیں۔

"میں نے در کے بارے میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ صحیح ثابت ہوگی۔ کہاں ہیں وہ افسانہ نگار جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے عظیم افسانے لکھے ہیں وہ آئیں اور دیکھیں افسانے یہ ہوتے ہیں (چائے کی پیالی کو) داخلیت اور نفسی تجزیہ کا معیار سمجھنے والے یہ جان لیں کہ اس معیار کے حدود ابھی اور آگے ہیں۔ اس زمانے میں پریم ناتھ در کے افسانوں کا مجموعہ 'کاغذ کا واسدیو'، حلقہ ارباب ذوق کی جانب جنوری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں اردو کے نامور نقاد سید احتشام حسین رقمطراز ہیں:۔

"مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ اگر ہم یوروپین اور امریکی ادب سے

مرعوب ہوئے بغیر اردو افسانہ نگاری پر نظر ڈالیں تو ہمیں کچھ ایسی شرمندگی نہ ہوگی کہ اپنے افسانوں کو — ظاہر ہے کہ بہترین افسانوں کو — دوسری زبانوں کے مقابلہ میں پیش نہ کر سکیں۔ آٹھ دس سال کے اندر اردو افسانہ نویسی میں حیرت خیز تنوع، وسعت اور گہرائی کا ظہور ہوا ہے۔ واقعات اور تجربات، محسوسات اور ذہنی کیفیات کو جتنے خارجی اور داخلی طریقوں سے افسانے کا رول دیا جاسکتا ہے اچھی بری طرح وہ سب آزمائے جارہے ہیں۔ پریم ناتھ در بھی اپنے تجربات اور محسوسات کو دوسرے افسانہ نگاروں سے الگ خاص طرح کے افسانوی ڈھانچے میں نمایاں کرتے ہیں۔" پریم ناتھ در کے بارے میں مرحوم شمیم احمد شمیم مدیر ہفتہ وار "آئینہ" ۱۰ر ستمبر ۱۹۷۶ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:۔

"جب میں درصاحب سے ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس شخص کے وجود میں ایک آگ ہے ایک تڑپ ہے اور ایک عجیب طرح کی بے چینی وہ ایک عجیب قسم کے احساس گناہ میں مبتلا ہے۔ اور وہ اس گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے مضطرب ہے۔"

پریم ناتھ در کی سب سے بڑی کمزوری کشمیر کی خوبصورتی تھی۔ وہ ہر سال موسم بہار اور خزاں میں کشمیر آتے رہتے تھے۔ اس کے بارے میں مرحوم شمیم احمد شمیم نے لکھا ہے:۔

"درصاحب کی دو کمزوریاں تھیں ایک کھانا اور دوسرے بچے۔ وہ صرف اچھا کھاتے ہی نہیں اچھا کھانا پکاتے بھی تھے۔ انھیں کھانا پکا کر دوست و احباب کو کھلانے کے لیے ہمیشہ کسی نہ کسی طرح بہانے کی تلاش رہتی تھی۔ پھر وہ بڑے ذوق و شوق سے پکانے اور کھلانے میں محو ہو جاتے جیسے کہ ان کی زندگی کا یہ ایک بہت بڑا مقصد ہے۔"

۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر ادبی سرگرمیوں کا ایک اہم مرکز تصور کیا جاتا ہے۔ ریاست میں مختلف ادبی انجمنیں قائم ہوئی تھیں اور ان کے وابستہ ادیب، شاعر اور فن کار ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ مرحوم ڈاکٹر برج پریمی کہتے ہیں کہ کلچرل کانگریس بنیادی طور پر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ نظریاتی طور پر وابستہ تھی اور ریاست کے ترقی پسند فن کار اس کے پس دپشت تھے اور ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا۔ لیکن اب اس کا آہنگ کچھ مدھم پڑ چکا تھا اور وہ نعرہ بازی کھوکھلی جذباتیت جس نے ہنگامی ادب کی بنیاد ڈالی تھی۔ کم ہوگئی تھی ـــــ ایسے میں پریم ناتھ در کی کہانی سن کر مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے معلوم ہے کہ در صاحب کشمیری ہے لیکن اُن کا لب و لہجہ ان کے کہنے اور پڑھنے کا انداز کچھ مختلف تھا۔ (ہمارا ادب شخصیات نمبر کلچرل اکیڈمی سری نگر)۔ در اگرچہ ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے مگر وہ کبھی اپنے ماضی کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتے تھے در صاحب نے "نوبھارت ٹائمز" کے نمائندے سے ایک رسمی گفتگو میں کہا تھا۔

"اقدار بدل سکتی ہے، دھارا بدل سکتی ہے لیکن روایت کی بنیاد قائم رہتی ہے۔ تبدیلی کا ایک عمل بنا رہتا ہے۔ انقلاب کے نام پر سب چھلانگ نہیں مار سکتا۔ اسے ایک دھارا کے ساتھ چلنا ہوگا۔ ایسے ایک ادب کی تخلیق کرنی ہوگی، جو عام جنتا کو قابل قبول ہو ـــــ اپنی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بالترتیب آگے بڑھنا ہوگا"۔ ترقی پسند تحریک کا دور اردو کہانی کے احیا کا دور تھا۔ اس دور میں جو ادیب ادبی افق پر ابھرے وہ کافی ذہین تھے۔ اُن کے سامنے ایک اہم مشن تھا۔ انھوں نے جرأت مندی سے نئی ہیئتوں کی ابتدا کی۔ ان ادبا میں میراجی، رفیق خاور، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد علی، مجنوں گورکھپوری، عصمت چغتائی، فیض احمد فیض، سجاد ظہیر، ظ۔ انصاری، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، امر سنگھ کرتار سنگھ دگل، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، عبادت بریلوی، ـــــ

شکیل بدایونی، اختر الایمان، حسرت جے پوری، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پریم ناتھ در کا شمار ترقی پسند ادیبوں کے اس گروہ میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو کو نئی جہتوں سے آشنا کیا اور اس کے ادبی گنجینے میں اپنے شہ پاروں سے اہم اضافہ کیا۔ پریم ناتھ در کے بارے میں م۔م راجندر، جنوری ۱۹۵۲ء "راہی" دہلی کے شمارے میں لکھتے ہیں۔

" ادب میں اچھی سمجھ بوجھ کے آدمی زیادہ نہیں ملتے۔ اس لیے قدرتی طور پر در نے دوسرے ادیبوں کی توجہ جلد ہی اپنی طرف کھینچ لی۔ ان ہی دنوں ان کے مستقبل اور ان کی عظمت کے واضح اشارے مجھے ان کی قریب لے آئے اور میں نے انھیں کہانیاں لکھتے دیکھا وہ گھر کے کسی کونے میں چھپ کر۔ کسی تنہائی میں کہانی نہیں لکھتے اپنے تخت پر چوکڑی مارے بیٹھے ہیں۔ کاغذ پر جھکے ہیں ـــــ کبھی آنکھ ناک مسکرائے گی اور کبھی تمام چہرہ سکڑ جائے گا۔ وہ اپنے کرداروں کی خوشی اور غم میں برابر شریک ہوتے ہیں۔"

ماہنامہ "شعاعیں" دہلی مارچ ۱۹۴۹ء کے شمارے میں جناب پرویز صاحب مرحوم پریم ناتھ در کے بارے میں لکھتے ہیں۔ " در کے افسانوں میں حسن کا یہ تنوع خود اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ در بلا کا صابر ہے۔ وہ ایک افسانہ لکھ کر اس پر چھ ماہ مسلسل غور کر سکتا ہے۔ ایک مشاطہ کی طرح وہ آرائش کے فن سے آگاہ ہے۔ اور جس طرح مشاطہ دلہن کا شب عروسی کے لیے سنگار کرتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی اپنے افسانوں کو دلہن کی طرح آراستہ کرتا ہے ـــ جوش کی طرح وہ اس بات کا قائل ہے کہ خیال وہ ہوتا ہے جو انسان کو لکھنے کے لیے مجبور کر دے اور جب بھی ایسا کوئی خیال اس کے ذہن سے ٹکراتا ہے وہ اسے افسانے کے

سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے۔"

جہاں تک پریم ناتھ در کے ترقی پسند ہونے کا سوال ہے شمیم احمد شمیم اپنے اخبار 'آئینہ' میں لکھتے ہیں۔

"پریم ناتھ در بڑے مذہبی آدمی تھے۔ ان کے دل میں بھگوان کا خوف تھا۔ اور انسان کی طرح پوجا پاٹھ بھی کرتے تھے اور پیروں، فقیروں کو بھی مانتے تھے۔ لیکن اُن کی مذہبیت میں وہ تنگ نظری اور تعصب نہیں تھا کہ جو عام طور پر کٹر ہندوؤں یا کٹر ملاؤں میں ہوتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی سماجی اعتبار سے رسم و رواج کے سخت پابند تھے۔" اس کے برعکس برج پریمی کے "ترقی پسند دور کا ادب ایک نعرہ بازی اور کھوکھلی جذباتیت جس نے ہنگامی ادب کی بنیاد ڈالی تھی۔" سے منسوب کیا ہے۔

برج پریمی جو خود ترقی پسند دور کا پیداوار ہے اور اس تحریک کے ساتھ وابستہ تھے۔

جیسے کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے اور موجودہ دور کے اردو ادب کی بنیاد ڈالی ہے۔ پریم ناتھ در خود بھی اسی کی پیداوار تھے جن کا ترقی پسند ــــــــــــــــ دور کے بارے میں خیال ہے کہ "ترقی پسند کا دور اردو کہانی کے احیا کا دور تھا۔ اس دور میں قابل نوجوان مصنفوں کا ایک اچھا گروپ سامنے آیا وہ کافی ذہین تھے۔ ان کے سامنے ایک اہم مشن تھا۔ انھوں نے جرات مندی سے نئی ہئیتوں کی ابتدا کی۔ اور انھوں نے نئے مسائل کی نشاندہی کی۔ اس دور نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔"

پریم ناتھ در کی کہانیاں ہیئت اور مسائل کے اعتبار سے ایک شاندار

انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ ان کے ہاں تجرباتی دانشوری اور تخیل موجود ہے۔ وہ لفظوں کو چن چن کر استعمال کرتے تھے۔ اس کے اکثر افسانوں میں کشمیری ماحول نمایاں طور پر ملتا ہے اور وہ کشمیری معاشرے کی تصویر کشی کرنے میں ایک انفرادی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی مادری زبان اگرچہ کشمیری تھی مگر اردو اور انگریزی پر دست گاہ رکھتے تھے۔ وہ اچھی اردو اور انگریزی لکھنے میں ادبی اور صحافتی دنیا میں مشہور تھے۔

۲۹ اگست ۱۹۷۱ء کو ٹائمز آف انڈیا۔ نئی دہلی کے نامہ نگار کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے پریم ناتھ در نے کہا۔ "ایک اچھی اردو کہانی میں موزوں، توازن، پلاٹ کردار نگاری اور ماحول ہونا چاہیے۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک ہی کہانی کو اہم نہیں بناتا ہے بلکہ ان کا امتزاج کہانی کی اہمیت کا متحمل ہوتا ہے۔ یہ امتزاج مختلف عناصر کو ملانے سے عمل میں آتا ہے۔"

پریم ناتھ در کے افسانوں میں موضوع کا اتنا اچھا انتخاب ہوتا ہے کہ داد دینی پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب نہایت شگفتہ ہے۔ تحریر میں ایک بے ساختہ بہاؤ ہے۔ ان کی ہر کہانی میں انوکھی اور حسین تشبیہیں ملیں گی۔ جو کہ ایک قاری کو جلد ہی اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کے بارے میں جوش ملیح آبادی نے لکھا ہے۔

"در کے افسانے موجودہ افسانوی خلا میں گونج پیدا کر چکے ہیں۔

پریم ناتھ در کے افسانوں کے کرداروں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان کی کہانیوں میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے کردار ہمارے گرد و پیش کے پیداوار ہیں۔ جن کا خالق زندگی کا نباض معلوم ہوتا ہے۔

پریم ناتھ در کے افسانوں میں کشمیریت کا اظہار ہر طرح سے نمایاں ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ جب جھیل ڈل کا ذکر کرتے ہیں۔ تو وہ جھیل کی خوبصورتی اور دلکشی

کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ "نیلی آنکھیں" کے دیباچہ میں در صاحب نے لکھا ہے۔ "کشمیر کا ایک لفظ ہے "کینہ بوب" یہ ایک کشمیری پھل کا نام ہے جس کا ڈنٹھل جھیل کے پانی سے اوپر اٹھتا ہے ڈنٹھل کے سر پہ ایک گول آنکھ کے ڈھیلے جتنا پھل "کینہ بوب" لگتا ہے ۔ میدانی جھیلوں میں اسے دیکھا نہیں ہے۔ نہ اس کا میدانی نام سنا ہے ۔ اپنے میدانوں کی تو ایک کشمیری کے دل میں شِشر گانٹھ (gecde) کے تصور کو تازہ کرنے میں مدد دیتی ہوگی۔"

در کی کہانی پڑھ کر کشمیر کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ وہ ہر وقت سبحان، عزیزہ، رحمان، رام جو اور گنوتی کی بیکسی اور مجبوری کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور فکر مند ہوتے ہیں کہ کشمیر کے تمام افراد ترقی اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔

۱۹۴۹ء میں پریم ناتھ در کے افسانوں کا پہلا مجموعہ کاغذ کا واسدیو شائع ہوا۔ یہ کتاب حلقہ ارباب ذوق دہلی کی پہلی پیش کش تھی۔ اس کے مرتبین جوش ملیح آبادی، عبادت بریلوی اور اپندر ناتھ اشک تھے۔ انھوں نے عرض ناشر میں میں لکھا ہے۔ کہ "کاغذ کا واسدیو" ایک ایسا دریچہ ہے جس میں سے آپ حلقہ کی سرگرمیوں کو جھانک سکتے ہیں۔ ان کی جامعیت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ حلقہ اپنی سرگرمیوں۔ اپنے مقاصد اور اپنی تحریک کی ایک ٹھوس تصویر پیش کرنا چاہتا تھا ۔ پریم ناتھ در کے افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت اس کا اولین اور گرانمایہ رخ ہوگا۔ کیونکہ حلقہ کے فن کاروں کی کامیابی حلقہ کی کامیابی ہے اور افسانوی راہوں میں اس درخشندہ راہ کو پریم ناتھ در کی اپنی راہ ہے۔"

کاغذ کے واسدیو کے بعد ۱۹۶۰ء میں پریم ناتھ در کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "نیلی آنکھیں" شائع ہوا۔ اس میں در "اپنے منہ" کے زیر عنوان میں یوں لکھتے ہیں:۔

"عنوان میں کشش ہے اسے وہ بھی پڑھیں گے جن کی آنکھیں نیلی ہیں اور وہ بھی جن کی اور رنگوں کی ہیں۔ اسے وہ بھی پڑھیں گے۔ جن کو نیلی آنکھوں کی تلاش رہتی ہے اور وہ بھی جن کو ایسی آنکھوں سے چڑ ہے لیکن پڑھ کر صرف انہی کو مایوسی نہیں ہوگی۔"

پریم ناتھ در کے افسانوی مجموعوں "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر محمد اسد اللہ وانی نے اپنے ایک مقالے "جموں و کشمیر میں اردو افسانہ" مطبوعہ "تعمیر" اگست ۱۹۸۳ء میں لکھا ہے:۔

"پریم ناتھ در نے "آخ بھو" نیلی آنکھیں، کاغذ کا واسدیو افسانے لکھ کر جہاں تشبیہات استعارات، اشاریت اور ابہام سے کام لیا ہے وہاں طنز کے نشتر بھی چبھوئے ہیں۔ جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے ان میں وارداتِ قلب اور نفسیات کا تحلیلی تجزیہ جدگانہ ہے۔ طنز و مزاح کے علاوہ استعارات اور تشبیہات کی مدد سے جس شگفتہ بیانی کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔"

پریم ناتھ در نے افسانوں کے علاوہ ڈرامے میں بھی طبع آزمائی کی انھوں نے زگبرٹ (دو بیٹے) کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں تین ایکٹوں کا ایک ڈرامہ کشمیری زبان میں لکھا ہے۔ جس کا موضوع ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھائی چارہ ہے پریم ناتھ در کی مادری زبان کشمیری تھی مگر وہ ایسے ماحول میں جوان ہوئے جس کے باعث انھوں نے اظہار بیان کے لیے اردو اور انگریزی کا سہارا لیا۔ اسی ڈرامہ کے پیش لفظ میں در صاحب لکھتے ہیں۔ "یہ حقیقت ہے کہ میری کہانیوں کی بڑی تحسین ہوئی اردو میں بھی اور ہندی میں بھی۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا تھا۔ اس میں کشمیر کی مٹھاس تھی دوسری زبان کے الفاظ میں غیر شعوری طور پر آبشاروں کی چھینٹیں اڑتی تھیں۔ ڈل پہاڑیوں کی گودیوں میں مویشیوں کے ریوڑ اچھلتے کودتے دیوداروں کے بیچ میں برف کے گالے مچلتے ہوئے

اگر تے۔ ڈل کی سطح آب پر تیرتے ہوئے کھیت رقص کرتے اور اس عمل میں میری تحریر از خود شیرینی جذب کرتی۔"

برج پریمی کا کہنا ہے کہ اس ڈرامہ میں پریم ناتھ در کے لاشعور میں چھپے فن کار کی اصل معلوم ہوتی ہے۔ ڈرامے میں ان کے اس اعتراف کے باوصف کہ وہ غیر شاعر ہیں شعر ملتے ہیں جو ان کے بقول تک بندی ہی سہی لیکن اس حقیقت پر دال ہے کہ یہ ڈراما جیسا بھی ہے۔ انھوں نے اپنی مادری زبان میں سوچا تھا اور اس کی تشکیل اسی طرح ذہن میں کی تھی۔"

(ہمارا ادب۔ کلچرل اکاڈمی۔ کشمیر)

پریم ناتھ در اردو افسانوی دنیا کی ایک اہم شخصیت تھی۔ ان کا اسلوب بہت شگفتہ ہے اور تحریر میں ایک بے ساختہ پن پایا جاتا ہے۔ کہانیوں میں نادر تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال بھی ملتا ہے۔ پریم ناتھ در طبقاتی اور معاشی کشمکش سے بے خبر نہیں تھے۔ مجھے ان کی ہر کہانی میں ان احساسات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایک حساس مصنف تھے جن کا دل کسی کے دکھ کو دیکھ کر فوراً دکھی ہو جاتا تھا۔

پریم ناتھ در "آواز" کے مدیر سے ترقی کی منزلیں طے کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۵ء تک وہ ریاست جموں وکشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کے مشیر برائے اطلاعات بھی مقرر ہوئے۔

آخر کار ۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو ۶۲ برس کی عمر میں دہلی میں انتقال کر گئے۔

"چناروں کے سایہ میں"، "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" کے افسانوں کے علاوہ ان کے غیر مطبوعہ افسانے بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں سے اگرچہ "چناروں کے سائے میں" کے عنوان کا کوئی افسانہ موجود نہیں ہے لیکن ان کے افسانوں کے پلاٹ، کردار، فضا، ماحول اور موضوع کشمیر ہے۔ اس لیے کتاب کا نام "چناروں کے سائے میں" رکھا گیا

ہے۔ فنکار کلچرل آرگنائزیشن کو اس بات کا فخر ہے کہ وہ اس عظیم افسانہ نگار کے افسانوں کا یہ مجموعہ شائع کر رہی ہے۔

جی۔ آر۔ حسرت گڈّھ
جنرل سکریٹری
فنکار کلچرل آرگنائزیشن
سری نگر۔

۱۵ مارچ ۱۹۹۱ء

(پروفیسر) جگن ناتھ آزاد

پریم ناتھ در

سرزمین کشمیر کو اپنے جن اہل قلم فرزندوں پر ہمیشہ ناز رہے گا ان میں پریم ناتھ در کا نام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ وہ صف اول کے افسانہ نگار تھے اور انھوں نے ایک ایسے دور میں اپنے کمال فن کو بلندی پر پہنچایا کہ خاص و عام سے خراج تحسین وصول کیا جب دنیائے ادب میں اور بالخصوص دنیائے افسانہ میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، آغا بابر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، رویندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے۔ ان کہنہ مشق فکشن نگاروں کی موجودگی میں دنیائے افسانہ میں ایک نو وارد کا اپنے آپ کو منوا لینا بہت بڑی بات ہے۔

پریم ناتھ در میرے دوست تھے۔ قریب قریب ہر روز کا ملنا تھا۔ فرائض منصبی کے اعتبار سے بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ صرف یہی نہیں کہ وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے اور میں پریس انفارمیشن بیورو سے بلکہ کچھ مدت ہم دونوں ایک ہی عمارت، آکاش وانی بھون نئی دہلی میں اپنے اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے، اور ظاہر ہے کہ اس ماحول میں

ہمیں ایک دوسرے کو جاننے پہچاننے کے اَن گنت مواقع میسر آئے ہوں گے اور اِن اَن گنت مواقع کی بدولت، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ پریم ناتھ در کی شخصیت اور فن میں جو مماثلت اور ہم آہنگی مجھے نظر آئی وہ بہت کم اہل قلم حضرات میں نظر آتی ہے۔

پریم ناتھ در کا دل سرزمین کشمیر کی محبت سے لبریز تھا اور یہی محبت ان کے افسانوں میں رچی ہوئی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کشمیر کے اُس حسن کو بھی اپنے افسانوی ادب کے تانے بانے میں سمویا ہے جو قدرت نے فیاضانہ طور پر کشمیر کے لیے وقف کر دیا ہے اور اس افلاس، غریبی، بے کاری اور بے روزگاری کو بھی جس کا مداوا آج تک نہ حکومت ہند کر سکی ہے اور نہ حکومت جموں و کشمیر۔

پریم ناتھ در اور میں جب اکٹھے بیٹھتے تھے تو اکثر کشمیر اور سیاستِ کشمیر بات چیت اور بحث مباحثے کا موضوع بن جاتی تھی اور ہم اکثر اس امر میں باہمی طور پر متفق ہوتے تھے کہ حکومت ہند کو اس معاملے میں یوں نہیں کرنا چاہیے اور یوں کرنا چاہیے، یہ نہیں ہونا چاہیے اور وہ ہونا چاہیے۔ پریم ناتھ در نے اکثر مجھ سے یہ کہا کہ یار، یہ بتاؤ کہ حکومت ہند جو کروڑوں بلکہ اربوں روپے جموں و کشمیر کی ترقی کے لیے حکومتِ جموں و کشمیر کو دے رہی ہے وہ کہاں جا رہا ہے۔ میں اس سوال کا کیا جواب دیتا؟ ہم دونوں اس معاملے میں بے اختیار تھے اور بے بس! لیکن اتنا جانتے تھے کہ جموں و کشمیر کے عمالِ حکومت کا روپے کا صحیح استعمال نہ کرنا اور حکومت ہند کا چشم پوشی کرنا ضرور ایک دن رنگ لائے گا۔

پریم ناتھ در کے افسانے، رومان اور حقیقت کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے دل کش اور خوبصورت نثر میں لکھا ہے۔ اُن کی تحریر "ز دل خیزد بہ دل ریزد" کے مصداق اپنے ہر قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس طرزِ تحریر کی بدولت انھوں نے اپنے فکر

اور اسلوب بیان کو اس طرح ایک دوسرے میں سمویا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہے۔

مجھے یاد ہے کہ شروع شروع میں جب اُن کا کوئی افسانہ "ادبی دنیا"، لاہور میں چھپتا تھا تو مدتوں لاہور کی دنیائے ادب میں اس کا چرچا رہتا تھا۔ "ادبی دنیا" کے مدیر مولانا صلاح الدین احمد کو جن کے نئی نسل کے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں پر ہزاروں احسانات ہیں میں نے اکثر پریم ناتھ در کے ذکر میں رطب اللسان پایا۔

پریم ناتھ در کا جب انتقال ہوا تو میں سری نگر میں تھا۔ انتقال کی خبر سنتے ہی ریڈیو کشمیر سری نگر کے ایک پروڈیوسر میرے یہاں تشریف لائے اور آتے ہی انھوں نے مجھ سے میرے تاثرات کی فرمائش کی۔ میں در کے انتقال کی خبر سنتے ہی سناٹے میں آگیا اور اس وقت انتہائی غم واندوہ کے عالم میں، چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں نے ان کے ٹیپ ریکارڈ میں صدا بند کر دیئے، جو بعد میں ریڈیو کشمیر نے ریکارڈ سے نقل کر کے مجھے بھیجے اور میری کتاب "آنکھیں ترستیاں ہیں" میں شامل ہیں۔ میں انہی تاثرات پر اپنی یہ چھوٹی سی تحریر ختم کر رہا ہوں۔

> پریم ناتھ در کی موت ایک بہت اچھے ادیب، بہت اچھے افسانہ نگار اور بہت اچھے دوست کی موت ہے۔ میرے اور پریم ناتھ در کے باہمی مراسم کی عمر خاصی طویل ہے اور اسی سبب سے میں پریم ناتھ در کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کر رہا ہوں۔
>
> پریم ناتھ در کی شخصیت ہر اعتبار سے دلکشی سے پر تھی۔ ان کی بات چیت، لب ولہجہ، ملنا جلنا، رکھ رکھاؤ، یہ سب ہم لوگوں

کے لیے ہمیشہ باعثِ رشک رہا۔ دفتری مصروفیات کے باوجود اپنے فن کے ساتھ ان کی لگن میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۴۷ء میں مغربی پاکستان سے ادیبوں اور شاعروں کے قافلے اکھڑ کے ہندوستان آئے تو دلی میں سب سے پہلے جو ادبی بزم جمی وہ پریم ناتھ در کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی جو اُن دنوں دہلی کالج میں پڑھاتے تھے، پریم ناتھ در کے گہرے دوست تھے۔ پریم ناتھ در نے ان کے ساتھ مل کے حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد ڈالی۔ یہ ایک طرح سے لاہور ہی کے حلقۂ ارباب ذوق کا تسلسل تھا، ذہنی اور جذباتی اعتبار سے، اور پریم ناتھ در کی کوششوں سے ہر ہفتے حلقۂ اربابِ ذوق کی محفل باقاعدگی سے دلی کالج میں منعقد ہوتی تھی۔ پریم ناتھ در ہمیشہ باقاعدگی سے ہم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے لکھ کے دعوت نامے بھیجتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس میں پریم ناتھ در اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کے علاوہ ساحر لدھیانوی، پرکاش پنڈت، مہدی عباس حسینی، شمیم کرہانی، غلام احمد فرقت، ریوتی سرن شرما، عرش ملسیانی اور بلونت سنگھ ایسے فن کار باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ آج یہ محفلیں منعقد کرنے والا خود ایک یاد بن کے رہ گیا ہے، اور اس وقت کسی پرانے شاعر کا یہ مصرع بے اختیار مجھے یاد آرہا ہے۔

تمھاری نیکیاں زندہ، تمھاری خوبیاں باقی

اور آخر میں یہ کہنا میرا ایک خوشگوار فرض ہے کہ یہ میرے دوست جناب سرت گڈا پریم ناتھ در افسانوں کا مجموعہ "چناروں کے سائے میں" کے زیرِ عنوان

مرتب کر کے حسن ادبی فرض شناسی کا ثبوت دیا ہے اُس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حسرت گڈاصاحب کی یہ کاوش جو ایک ادبی خدمت بھی ہے اور سماجی خدمت بھی، دنیائے ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ایک فارسی شاعر نے کیا عمدہ کہا ہے۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نام نیکت یادگار

جگن ناتھ آزاد

جموں یونی ورسٹی
جموں
۴ مارچ ۱۹۹۱ء

نیلی آنکھیں

یکایک ہوا میں جان سی آگئی۔ جھجکتے سرکتے جھونکوں کی جگہ ہوا کا ایک بالغ سلسلہ ما اطمینان کے ساتھ چلنے لگا اور بید کے کمزور پتے میرے سر پر گرنے لگے۔ پھر چونکہ پانی کو بھی ہوا کی تھپکی مل گئی تھی یہ مریل پتے بھی میرے سر سے ڈھلک کر پانی کی نئی تیزی میں پینترے دکھاتے بہتے گئے۔ اُدھر ڈل کے شمال مغربی کونے سے پہاڑ پھلانگ کر بادل کی ایک چوڑی بیل سی چڑھ آئی تھی۔ جس نے سورج کو ڈھانپ تو نہیں دیا تھا۔ لیکن اس پر ایک آنچل سا ڈالہ دیا تھا۔ جس کی تہیں کہیں گھنی تھیں کہیں ہلکی۔ یوں تو آسمان کا آسمان اتنا صاف تھا۔ جیسے ڈل میں اُتر کر مُنہ دھو کے ابھی ابھی اوپر چلا گیا ہو۔ اور لگتا بھی تھا کہ ڈل اور اس کے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے۔ کیونکہ دیکھتا ہوا آدمی اس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی۔ اتنی ہوا سے ہی پانی کے ہموار پھیلاؤ میں سلوٹیں پڑ گئی تھیں اور اضطراب کی سفید چمک میں بھی نیلاہٹ کی گہرائی اُبھرتی تھی۔

حسنِ جمود کے تماشائی اپنی اپنی کشتیاں نیم جان نالوں کی طرف نکال چکے تھے اور ڈل کا پانی بھاری بھاری پہاڑوں کے عکس کو رقص میں لا چکا تھا۔ شمال مغربی آنچل کی سب نہیں گھنی ہو چکی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ اب ایک آندھی آئے گی اوپر کی نیلاہٹ ڈھک جائے گی۔ نیچے کی پاگل ہو جائے گی اور انسان کی کشتیوں کو ہی کیا جھیل کا پانی میل کے ذرّے ذرّے کو کوسوں پھینکے گا۔ اپنی قوت کو گہرائیوں سے اچھال کر پہاڑوں کو للکارے گا اور قطروں کی یہ متحد شہنشاہی اور اس ہولناک حسن کا نظارہ بید کی پتلی ٹہنیوں کے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی مجھے دیکھنے کو ملے گا اور میں ایک بہتے زلزلے ایک طوفان کی اُمید میں پانی کی وسعت کو کھوجنے لگا۔

دُور پرے کنارے کی دُھندلی لکیر تک بے چین پانی تھا اور کچھ نہ تھا۔ شمال مشرق میں طرف ایک گہرا دھبہ ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ لیکن لگتا تھا کہ بے کار گھاس نہیں جسے ڈل کا پانی اٹھا کے پھینک دے۔ دھبے میں عزم تھا، اپنی حرکت تھی اور کچھ لمحوں کے بعد ہی پانی کی سلوٹوں کو چیرتی ہوئی کشمیر کی ایک ایسی چھوٹی کشتی اُبھر آئی۔ جس پر نہ چھت ہوتی ہے نہ بیٹھنے کا آرام۔ کشمیری شکارے کے سامنے ایسی کو کشتی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ شکارے کے ساتھ اس کا کیا مقابلہ؟ شکارے ایک کشش کو لے کے چلتے ہیں۔ پردوں، گدوں، اسپرنگوں کی لوریاں لیکر، شائستہ سیاحوں کے لئے پُر ذوق شیدائیوں کے لئے، تھکے ہوئے انسانوں کے لئے اور یہ چیز تو ڈل کی محض سبزیاں اٹھانے کو، مچھلیاں لیجانے کو، پانی کا پڑوسی، جھیل کا جفاکش کسان کھُردرے تختوں سے بنا لیتا ہے اور کم بخت اسکے سروں پر نوک تک نہیں رکھتا۔ اسی لئے ایسا لگتا ہے کہ اس پر دونوں سروں سے نہ جانے کس کی مار پڑی ہے۔ اور اسی لئے یہ دُور سے ایک کشتی نہیں ایک دھبہ دکھائی دیتی ہے۔

طوفان کا ایک واضح اعلان تو ہو چکا تھا۔ لیکن طوفان اپنے پہلے قدموں پر ہی جما رہا۔ یوں تو اپنے ایک اشارے سے ہی ڈل نے اپنا میدان خالی کروا دیا تھا۔ لیکن اس چھوٹی سی کشتی کی یکساں تحریک سے ایسا لگتا تھا کہ میل کا یہی دھبہ ایک شفاف زلزلے کو تھام رہا تھا کہ یہی کشتی سلوٹوں کو دما رہی ہے اور انہیں ابھرنے نہیں دیتی۔ اپنا مشین کی طرح چلی آرہی تھی۔ ایک سیدھی لکیر پر،

ڈل کو دو ٹکڑوں میں کاٹتی ہوئی، نہ دائیں نہ بائیں ایک حرکت ایسی نہیں جو کنارے کی طرف جھک جائے، ایک چپو ایسا نہیں جو ناوے کی طرف مڑ جائے ۔۔۔ اتفاق سے وہ سیدھی لکیر اسی کنارے کی طرف چلی آرہی تھی جس پر بید جھوم رہے تھے۔ کشتی کنارے لگی لیکن مجھ سے کچھ دور۔ میں یہ آس لگائے بیٹھا تھا کہ کشتی چلانے والا کوئی منچلا جوان ہوگا۔ لیکن اپنے بید کے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی میں نے کشتی کے سرے پر ایک عورت کو دیکھا۔ عورت! طوفان کا پیٹ چیرنے والی! ایسی کو دیکھے بنا رہا نہ گیا۔ کنارے پر وہ کچھ بیچنے بھی لگی تھی اور ایک آدھ گاہک کھڑا تھا۔ میں نے بھی سوچا کہ دیکھوں کیا بیچنے آئی ہے۔

دیکھا کہ ٹوکری پہ آنکھیں جھکائے بیٹھی ہے۔ پپوٹے اُبھر رہے ہیں اور خاموش ہونٹ ایک تیلی تیلی کسی کسی لکیر پہ پرکھ رہے ہیں۔ لیکن جونہی اُس نے آنکھیں اٹھائیں اسکے پپوٹے دائیں بائیں پھیل کر بیٹھ گئے اور پتلیوں سے دیکھی ہوئی ایک دنیا کے سائے اُٹھے۔ مُنہ کھولا تو لکیر کہاں؟ رسیاں سی ڈھیلی پڑ گئیں۔ اتنا چوڑا منہ اس لکیر کے نیچے کہاں دب گیا تھا اسکی ایک نظر نے میرے دل سے ہونٹوں پہ ہونٹوں کے خیال کو بھگا دیا اور جب میں نے اُسکی باہوں پر کھچی ہوئی نیلی رگوں کو بھی دیکھا۔ میں نے اُسے مائی پکارا اور پوچھا۔ "کہو مائی کیا بیچ رہی ہو؟" "ڈل کا کلیجہ! پانی کی کھیتی میں سے کیا نکلے گا؟ یہ لو بھائی کینہ بوب"۔۔۔ "کینہ بوب"۔ "ارے کینہ بوب"۔ بیس برس کے بعد میں نے ایک اوچھے بچے کی طرح کینہ بوب کو پایا۔ گول گول بھرے بھرے کینہ بوب کے روبرو میری انگلیاں بھری بھری نرمی کو اسی اشتیاق سے دبانے کے لئے بے چین تھیں۔ جیسے بیس کیا تیس برس پہلے موسم کے ہر دن دبا تی تھیں۔ میری زبان کینہ بوب کی مخصوص لذّت کے تصوّر میں بے صبری کے ساتھ اپنے تالو کو چاٹنے لگی اور میں نے بغیر دام چکائے، ٹوکری میں ہاتھ کیا ڈالدیا، نیلی رگوں کو اکسایا اور کینہ بوب والی نے اپنے کاٹھ سے ہاتھ کو میری انگلیوں میں گاڑ دیا۔ دو گول گول بھرے کینہ بوبوں کو ایسی ترشی سے واپس نکالا جیسے انگلیوں میں لگی ہوئی تری کو بھی چھین کر لینا چاہتی ہو۔ وہ ہونٹ کتنے کھلے کہاں کہاں گرے اور کیا کیا [illegible] اُس نے کہا [illegible] سوال نہیں جو یونہی بانٹتی پھرو، کہ تال پہ دام لگے ہیں۔ محنت

لگی ہے۔ ڈل کا پانی دیتا کیا ہے؟ جانیں لے جاتا ہے، کہ دن بھر کی محنت کا پھل یہی ہے، کہ دن بھر کی ضرورتوں کا ذریعہ یہی ہے کہ وہ یونہی راہ چلتی عورت نہیں ہے۔

مجھے لگا کہ عورت وہ ہے کہ ڈل کی بینائی کو بھی روندتی ہے۔ اور شاید اس کا کلیجہ بھی لکالتی پھرتی ہے۔ سوچا کہ کینہ بوب کھانا ہے تو صبر سے کام لو۔ میں نے اپنے پیر پھر پانی میں ڈال دیے اور کنارے پر بیٹھ گیا۔

"تم نے دو کینہ بوب میرے ہاتھ سے اس طرح چھین لئے۔ مجھے سوجھی کہ میں اسے تھوڑی سی شرم دلا دوں پھر آگے چلوں ___

"نہیں چھینتی؟ تم نے مفت کا مال سمجھا تھا"۔ اس نے منہ کو ایک ہی طرف چوڑا کر کے پوری نفرت سے کہا۔

"ارے میں تو کب بنا دام کے کھانے لگا تھا"۔

"دام کب چکائے تھے؟ تم تو کھانے لگے تھے"۔

"کھانے بھی لگا تھا۔؟

"اور نہیں تو کیا"؟ وہ ایسے بولی جیسے نیلی رگوں نے ڈل میں ایک چپوکس کے مارا ہو۔ ایک لمحہ میں اُسے گھورتا رہا۔ اور خاموشی کے اُس لمحے میں اُس کا مُنہ بند ہو گیا۔ ہونٹ ایک پتلی لکیر میں کھچ گئے۔ پپوٹے پھر اُبھر آئے اور جب اُس نے آنکھیں تو چھی کر کے اٹھائیں مجھے ایسا لگا کہ آنکھ کے کونے سے ایک جھر وکہ سا کھلنے والا ہے اور اس نے آنکھیں جو پھر جھکائیں۔ کچھے کچھے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آگئی۔

"مجھے تو ایسا لگا تھا کہ تم چھلکا اتارے لغیر ہی کھا جاؤ گے"۔ اُس نے کہا۔ دیانتداری کا ایک دورہ تھا کہ جھروکہ کھلنے کی امید۔ میں نے اس سے سچ سچ کہا۔ "کینہ بوبوں کے سامنے میں واقعی اتاولا ہو گیا تھا"۔

"کیوں؟ اس نے فوراً پپوٹوں کو گانٹھ سی لگا دی۔

"پورے بیس برس کے بعد آج ان کو دیکھا ہے"۔

"کیوں؟ تم کہاں تھے بیس برس"۔؟

"میں، میں۔" مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ عورت الٹا مجھ ہی سے پوچھ گچھ کرنے لگی ہے۔

"ہاں میں گھر سے دور چلا گیا تھا"۔۔۔ "کشمیر سے دور؟"

"ہاں! مگر کینہ بوب کیسے دیتی ہو۔؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے۔ مگر یہ بتاؤ بیس برس تم کیوں نہیں لوٹے؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے! میری ماں تو چاول کے ٹوٹے سے لیتی تھی مٹھی بھر ٹوٹا دیتی تھی اور نونگن بھر کینہ بوب لیتی تھی"۔

"گئے وہ وقت بھائی آج کل کشمیر کے گنوار تک ثابت چاول کھاتے ہیں۔ ٹوٹا تو چڑیاں بھی نہیں کھاتیں۔ لیکن تم یہ کیوں نہیں بتاتے تم بیس برس کیوں نہیں لوٹے۔ تمہاری ماں نے نہیں بلایا تمہیں؟"

"وہ جب مر گئی تھی تب ہی میں چلا گیا تھا"۔۔۔ کینہ بوب والی نے ایک ہاتھ سے چپو کو گاڑ دیا تھا۔ چپو اچانک ہاتھ سے نکل گرا اور وہ پانی کے بہاڑ سے چپو کر نکالنے کے لیے جھکی اور کشتی کی کشتی ہلی اور کنارے سے الگ ہو گئی۔ پیچھے ڈل کی سلوٹیں اسی حسامت کی تھیں۔ جیسے پہلے لیکن بادل کی چوڑی بیل اب کہیں پر گھنی نہیں تھی۔ یہ تسلی کر کہ اب آندھی نہیں آئے گی۔ دو ایک شکارے بھی نالوں سے نکل کر ڈل پر ہچکولے کھا رہے تھے۔ کینہ بوب والی نے کشتی پھر سے کنارے لگائی۔ اب چپو کو گاڑے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس نے کشتی کے سر کو کنارے پر اتنا بڑھایا تھا کہ جیسے اسکی منزل آگئی تھی۔ اس نے اپنے پھیرن کے چوڑے آستین جو کہنیوں سے اوپر الٹے ہوئے تھے، کھول دئیں اور باہوں کو ڈھک دیا۔ اس نے اپنے دوپٹے کی گانٹھ کو بھی کھولا اور دوپٹہ اسکے کانوں پر سے ہوتا ہوا اسکے کندھوں پر ڈھلک آیا۔

"پورے بیس برس کشمیر سے باہر رہا اور بیس برس میں نے اپنی چہیتی شستر گانٹھ نہیں دیکھی اور اپنا ایک کینہ بوب نہیں کھایا"۔ کینہ بوب والی نے بچپڑی کا ہاہا ابھارا ابھی جیسے اندر اندر

نہ چاول نامنے کا لکڑی کا برتن جس میں ایک وقت ڈیڑھ سیر کے قریب آتا ہے۔ ۲۔

چوس لیا اور میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میری آنکھوں میں میرے جھوٹ سچ کو آنک رہی ہو۔ کمبخت کینہ بوب، چھلکوں کے اندر سے پھوٹ نکلنا چاہتے تھے کیا تنا دُتھا ان کا۔ کیا ڈیل ڈول تھا۔

میں نے ٹوکری سے پھر آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا کہ اسکی آنکھ میں اب نہ دیکھی ہوئی دنیا کے وہ سائے تھے نہ پھٹکار تھی نہ تجسس تھا۔ آنسو کے ایک پھیلے ہوئے قطرے کا پردہ چمک رہا تھا۔

"ارے تم تو رونے لگی"

"کیا کہا۔؟ رونے لگی ہوں؟ تم تو سچ مچ۔ تم تو سچ مچ......" وہ ہنسنے لگی اور میں سمجھ کی اس کوشش میں کھو سا گیا کہ وہ ہنس رہی ہے کہ اپنے شعلوں کو بلا رہی ہے جن سے وہ پھیلتا قطرہ ہی کیا ڈل بھر سوکھ جاتا — "تم تو واقعی بھولے بھائی ہو۔ لیکن تم تو کینہ بوب کی بات کر رہے تھے؟ لو کھاتے کیوں نہیں۔؟ اُٹھاو۔ اُٹھاو۔ اٹھاؤ — جی چاہے جتنے کھالو۔ کھالو تجھے میری قسم ہے۔ کھائے میرا گلا کاٹ دے جو نہ کھائے۔" میں آنکھوں کے کونوں کو دیکھتا رہا جہاں سے جھروکہ کھلنے کی امید ہو گئی تھی۔ مجھے دل کیطرف نظر اٹھائے بغیر ہی موسم میں خوشگوار تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا کہ لیکایک اسکی آواز میں تُرشی آگئی۔ " اٹھاؤ۔ کھاؤ" آنکھوں میں پھٹکار پھر جم گئی تھی اور میں نے ٹوکری میں سے دو ایک کینہ بوب اٹھا لئے۔ کمبخت کینہ بوب ملا تو ایسے ملا جب ذہن میں یہ پریشانی تھی کہ بات کوئی ضرور ہے جو بھرے بھرے پپوٹے جھپکتے ہی سوکھ جاتے ہیں کہ نیلی رگوں نے ہی باہنوں کی گولائی کو گانٹھیں لگا دی ہیں کہ نظروں میں جو ٹھہراؤ ہے وہ پرانا نہیں۔ کہ آنکھوں کے کونوں سے جو کبھی کبھی جھروکہ سا کھل جاتا ہے اُسکے پیچھے کوئی گھُٹ رہا ہے —— کینہ بوب والی مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہو۔ میں ایک چھلے ہوئے کینہ بوب کو بڑی بے رخی اور سستی کے ساتھ منہ میں ایک طرف سے دوسری طرف کو لڑھکا رہا تھا۔ بولی۔

"تم کینہ بوب پہ ٹوٹ رہے تھے؟"

"اب رغبت نہیں!"

"اب کیا بات ہو گئی؟" —— "تم تم........ تم....."

"پورے بیس برس کے بعد آج ان کو دیکھا ہے"۔

"کیوں؟ تم کہاں تھے بیس برس"۔؟

"میں، میں۔" مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ عورت الٹا مجھ ہی سے پوچھ گچھ کرنے لگی ہے۔

"ہاں میں گھر سے دور چلا گیا تھا" ــــ "کشمیر سے دور؟"

"ہاں! مگر کینہ بوب کیسے دیتی ہو۔؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے۔ مگر یہ بتاؤ بیس برس تم کیوں نہیں لوٹے؟"

"کینہ بوب مہنگا ہے؟ میری ماں تو چاول کے ٹوٹے سے لیتی تھی۔ مٹھی بھر ٹوٹا دیتی تھی اور نوگن[1] بھر کینہ بوب لیتی تھی"۔

"گئے وہ وقت بھائی آج کل کشمیر کے گنوار تک ثابت چاول کھاتے ہیں۔ ٹوٹا تو چڑیاں بھی نہیں کھاتیں۔ لیکن تم یہ کیوں نہیں بتاتے تم بیس برس کیوں نہیں لوٹے۔ تمہاری ماں نے نہیں بلایا تمہیں؟"

"وہ جب مر گئی تھی تب ہی میں چلا گیا تھا" ــــ کینہ بوب والی نے ایک ہاتھ سے چپو کو گاڑ دیا تھا۔ چپو اچانک ہاتھ سے نکل گرا اور وہ پانی کے بہاؤ سے چپو کو نکالنے کے لیے جھکی اور کشتی کی ہلی اور کنارے سے الگ ہو گئی۔ پیچھے ڈل کی سلوٹیں اسی حساب ت کی تھیں۔ جیسے پہلے لیکن بادل کی چوڑی بیل اب کہیں پر گھنی نہیں تھی۔ یہ تسلی کر کے اب آندھی نہیں آئے گی۔ دو ایک شکارے بھی نالوں سے نکل کر ڈل پر ہچکولے کھا رہے تھے۔ کینہ بوب والی نے کشتی پھر سے کنارے لگائی۔ اب چپو کو گاڑے رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس نے کشتی کے سر کو کنارے پر اتنا بڑھایا تھا کہ جیسے اسکی منزل آ گئی تھی۔ اس نے اپنے پھیرن کے چوڑے آستین جو کہنیوں سے اوپر الٹے ہوئے تھے، کھول دئیے اور باہوں کو ڈھک دیا۔ اس نے اپنے دوپٹے کی گانٹھ کو بھی کھولا اور دوپٹہ اسکے کانوں پر سے ہوتا ہوا اسکے کندھوں پر ڈھلک آیا۔

"پورے بیس برس کشمیر سے باہر رہا اور بیس برس میں نے اپنی چھینتی شنشر گانٹھ نہیں دیکھی اور اپنا ایک کینہ بوب نہیں کھایا"۔ کینہ بوب والی نے ہونٹوں کا رہا سہا ابھار ابھی جیسے اندر اندر

[1] چاول ناپنے کا لکڑی کا برتن جس میں ایک وقت ڈیڑھ سیر کے قریب آتا ہے۔

SCICLE ۲۰

چوس لیا اور میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے میری آنکھوں میں میرے جھوٹ سچ کو آنک رہی ہو۔
کمبخت کینہ بوب چھلکوں کے اندر سے پھوٹ نکلنا چاہتے تھے کیا تناؤ تھا ان کا۔ کیا ڈیل ڈول تھا۔
میں نے ٹوکری سے پھر آنکھیں اٹھائیں اور دیکھا کہ اسکی آنکھ میں اب نہ دیکھی ہوئی دنیا کے وہ سائے تھے نہ پھٹکار تھی نہ تجسس تھا۔ آنسو کے ایک پھیلے ہوئے قطرے کا پردہ چمک رہا تھا۔
"ارے تم تو رونے لگی"
" کیا کہا۔؟ رونے لگی ہوں؟ تم تو سچ مچ۔ تم تو سچ مچ......" وہ ہنسنے لگی اور میں سمجھ کی اس کوشش میں کھو سا گیا کہ وہ ہنس رہی ہے کہ اپنے شعلوں کو بلا رہی ہے جن سے وہ پھیلتا قطرہ ہی کیا ڈل بھر سوکھ جاتا۔" تم تو واقعی بھولے بھائی ہو۔ لیکن تم تو کینہ بوب کی بات کر رہے تھے؛ لو کھاتے کیوں نہیں۔؟ اُٹھاو۔ اُٹھاو۔ اٹھاؤ۔ جی چاہے جتنے کھا لو۔ کھا لو تجھے میری قسم ہے۔ کھائے میرا گلا کاٹ دے جو نہ کھائے۔" میں آنکھوں کے کونوں کو دیکھتا رہا جہاں سے جھروکہ کھلنے کی امید ہو گئی تھی۔ مجھے دل کیطرف نظر اٹھائے بغیر ہی موسم میں خوشگوار تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا کہ لیکایک اسکی آواز میں تُرشی آ گئی۔" اٹھاؤ۔ کھاؤ" آنکھوں میں پھٹکار پھر جم گئی تھی اور میں نے ٹوکری میں سے دو ایک کینہ بوب اٹھا لیئے۔ کمبخت کینہ بوب ملا تو ایسے ملا جب ذہن میں یہ پریشانی تھی کہ بات کوئی ضرور ہے جو بھرے بھرے پوٹے چھپکتے ہی سوکھ جاتے ہیں کہ نیلی رگوں نے ہی باہنوں کی گولائی کو گانٹھیں لگا دی ہیں کہ نظروں میں جو ٹھہراؤ ہے وہ پرانا نہیں۔ کہ آنکھوں کے کونوں سے جو کبھی کبھی جھروکہ سا کھل جاتا ہے اُسکے پیچھے کوئی گھٹ رہا ہے ـــــ
کینہ بوب والی مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہو۔ میں ایک چھلے ہوئے کینہ بوب کو بڑی بے رخی اور سستی کے ساتھ منہ میں ایک طرف سے دوسری طرف کو لڑھکا رہا تھا۔ بولی۔
" تم کینہ بوب پہ ٹوٹ رہے تھے؟"
" اب رغبت نہیں!"
" اب کیا بات ہو گئی؟" ـــــ " تم تم........ تم ....."

میرے دل کو ٹھنڈک پہنچانا چاہتے ہو تو ان کو نوچ نوچ کے کھاؤ"۔

میں نے بوب کی ٹوکری کو پیچھے ہٹا کر اُسے کہا۔ "بہن بتاؤ! تم کہاں رہتی ہو۔؟"

"میں؟" اُسنے دوپٹے کو پیچھے کی طرف فوراً گانٹھ لگا دی اور آستین الٹ دیئے اور ٹوکری کو میری طرف پھر دھکیلا۔ "اٹھاؤ جتنے اور لینے ہیں اب مجھے گھر جانا ہے جو بچیں گے انہیں میں کل پہونچوں گی۔ لو اٹھاؤ۔" میں نے ٹوکری کو پھر اپنے سامنے سے ہٹا کر پوچھا۔ "کینہ بوب والی! تمہیں کس بات کا دکھ ہے؟"

"دُکھ؟" اُسنے حیرت میں آنکھیں کھولیں "دکھ ہو میرے دشمنوں کو۔ ارے میرا کلیجہ پتھر کا ہے۔ تم مجھے نہیں جانتے۔ میں کسی کا حال نہیں پوچھتی۔ کسی مُردنی میں نہیں جاتی۔ مجھے موقع ملے تو میں کسی کی دو آنکھیں نوچ لوں اسی طرح جسطرح ڈنٹھل سے کینہ بوب اٹھا لیتی ہوں۔ تم اور کیوں نہیں لیتے۔؟" وہ کشتی اور جہلم کی طرف بے چینی کے ساتھ دیکھنے لگی۔ لیکن میں نے کہا۔ "کینہ بوب والی! تمہارے گھر میں اور کون ہے۔؟"

"اللہ تعالےٰ کا کرم ہے سب لوگ ہیں۔ اٹھاؤ جتنے کینہ بوب اور لینے ہیں۔" میں نے اپنا ایک ہاتھ ٹوکری کے کنارے پر رکھ لیا اور سوچا شاید وہ دوپٹے کی گانٹھ کو پھر کھولے گی۔ شاید اس کے پپوٹے پھر پھول اٹھیں گے لیکن وہ اکڑی رہی جیسے میری ایک بات کا جواب نہیں دے گی۔

"کینہ بوب والی! تمہارے گھر میں اور کون ہے؟"

"میرے گھر میں کوئی نہیں ہے۔"

مجھے احساس ہونے لگا کہ میرے پاس بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے جو کچھ پوچھنا ہے جلدی جلدی پوچھ لوں۔

"تمہارا گھر والا کہاں ہے؟"

"ڈل کے پیٹ میں!"

"افسوس ڈوب گیا تھا کیا۔؟" ـــــ میں نے جلدی جلدی پوچھا۔

"ایک روز زور کی آندھی نے اُسے اچانک پانی کے بیچ میں پکڑ لیا تھا۔ وہ ہارون کے جنگل سے میرے لئے ہندلانے گیا تھا۔ کیونکہ رحمان میرے پیٹ میں تھا۔ آندھی اچانک آئی تھی اور میں نے اپنے کنارے پر اُسے اس دغا باز کے ساتھ لڑتے پایا۔" وہ لپک کر اٹھی اور چپو پہ جھپٹی۔ "کمینہ ڈل۔ اس نے کنارے پر بھی پانی کی دیواریں اچھالی تھیں۔ اُس نے مجھے بھی آگے بڑھنے نہیں دیا تھا۔ جب میں نے رحمان کی پرواہ نہیں کی تھی۔ جب میں پڑوسی کی کشتی پہ کود نکلی تھی۔!"

"پھر وہ ڈوب گیا تھا کیا۔؟" میں نے دور ہی سے اسے ڈوبتے دیکھا تھا۔ یزید نے دکھا دکھا کے اسے لے لیا۔ آندھی میں ڈل کے پانی پر مٹی کہاں اڑتی ہے؟ دھول کہاں اڑتی ہے؟ سب کچھ دکھائی دیتا ہے" ـــــ میں نے ڈل کے پھیلاؤ پر نظر اٹھائی۔ سلوٹیں کہاں؟ اب تو نیلے نیلے چوہے سے بھاگ رہے تھے۔ ہوا بھی کم ہو گئی تھی جیسے اُوپر اُوپر کہیں بھاگنے کا راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔" پھر تم اکیلی رہ گئی کیا۔؟" ـــ "نہیں اُسی رات کو رحمان ہو گیا تھا۔" ـــــ "رحمان اور تو ـــ؟"

"ہاں رحمان اور میں ـــــ رحمان نے تو باپ کو دیکھا بھی نہ تھا اور میں بھی اُسے بھول گئی۔"

کمینہ لوب والی کے ہاتھ سے چپو نکل چکا تھا اور وہ زمین پر لیٹ رہا تھا۔ نہ جانے اسکی کنپٹیوں میں اندر اندر کیا ہو گیا۔ کیونکہ دوپٹے کی گانٹھ اپنے آپ کھل گئی اور اُسنے اسے باندھنے کی پھر کوشش نہ کی۔ وہ بیٹھے بیٹھے بولتے بولتے بید کے سہارے تک آگئی جب تک کہ اُسنے انجانے میں اسکی ٹیک لگائی۔" لیکن تم بھی کتنے بھولے ہو! غیروں کی کہانی سننا چاہتے ہو۔" اسکے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ کھلی۔" تم اب یہ پوچھنے بیٹھو گے کہ رحمان کہاں ہے ــــ؟ رحمان کو بھی ڈل لے گیا ـــ نہیں تم غلط سمجھے۔ وہ ڈوب گیا ہے لیکن زندہ ہے؟"

"کمینہ لوب والی ـــ مجھے سمجھاؤ۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔" "لو سنو!" اس نے اب آستین بھی کھول دی اور اپنی نیلی رنگوں کو ڈھک دیا۔ مسکراہٹ میں سے زہر کم ہونے لگا۔ اور جانے کیوں مجھے امید ہونے لگی کہ جھروکہ پھر کھلنے والا ہے۔" میرا گھر والا بڑا عجیب آدمی تھا۔ ڈل کا متوالا تھا۔

جانے ڈل کی اس بنیلاہٹ نے اسکو زندگی میں بھی کیوں موہ لیا تھا۔ ڈل کی کھیتی سے تھک تھکا کے جب آتا تھا اور مجھے ایک بچے کیطرح گود میں لیتا تھا۔" کینہ بوب والی کی آواز سوکھ گئی۔ اُسنے آنکھیں نیچی کردیں اور اسکے پپوٹے کنول کی موٹی کلی کی طرح اُبھر آئے۔ "جب کھاپی کے وہ سیر ہو جاتا تھا۔ یونہی کہہ اٹھتا" سوندری تو کتنی حسین ہے۔ بس ایک کسر ہے تمہاری آنکھیں نیلی نہیں"۔ اس کا یہ کہنا مجھے بہت برا لگتا تھا۔ لیکن وہ فوراً ہی پھر کھڑا ہوتا۔ مجھے گود میں لیتا ..... اور ...... اور میں نیلی آنکھوں والی بات کو مذاق سمجھتی"۔ یکایک اُسنے آستین پھر چڑھائی اور مجھے ایسا لگا کہ وہ کھڑی ہو جائیگی اور چپو لے کر چل پڑے گی۔

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا۔؟"

اب اس نے پھر ایسا ظاہر کیا کہ وہ جلدی جلدی سُنا کے چلی جائے گی۔" پھر ۔۔؟ میں نے سولہ سال بعد خود ہی ڈل کو دعوت دی۔ ایک نیلی آندھی کو خود ہی بلایا اور رحمان کو اُس کے آغوش میں ڈال دیا"۔

"یعنی ۔۔"؟ ــــ "تب سے میں اکیلی رہ گئی ہوں۔ اور اکثر اسی جھیل کے پانی میں کھوجتی رہتی ہوں۔ کبھی گول گول آنکھوں کے ڈھیلے سے کینہ بوبوں کو نوچ اٹھاتی ہوں۔ کبھی اسکی گہرائیوں سے ہِل[1] کو کھینچ نکالتی ہوں۔ اسی آندھی کی تلاش میں بھٹکتی ہوں اور اسی جگہ ڈل کے بیچ میں گھنٹوں گھومتی ہوں لیکن بے شرم آندھی نہیں آتی۔ آتے آتے رُک جاتی ہے۔ چار سال گھومی، چار سال یہی ہوتا رہا۔ آتی ہے تو میں گھر میں مری پڑی ہوتی ہوں۔ ایسے میں روتی ہوں۔ کہ میں گھر ہی کیوں آئی تھی اور کم بخت یہ آندھی اکثر رات کو آتی ہے جب میں بیہوشی کو کوستی ہوئی اٹھتی ہوں اور کنارے پر ہی ہاتھ ملتی رہتی ہوں پو پھٹتے ہی آندھی رُک جاتی ہے اور کم بخت یہ نیلا آسمان اور یہ نیلا پانی ایسی معصوم شکلیں دکھاتے ہیں جیسے رات کو نہ ہوا چلی تھی نہ ڈل میں طوفان آیا تھا ــــ" کینہ بوب والی نے چپو بھی اٹھایا۔ کشتی کے سرے کو دھکیلا بھی۔ لیکن نہ اسکی حرکت میں اب وہ دھکا تھا۔ نہ مجھ میں اس کو روکنے کی ہمت تھی۔

---

[1] ہِل :- زیر آب پودے

مگر مجھے یکایک یاد آیا کہ رحمان کی پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ "کینہ بوب والی ۔ رحمان کو تم نے کس طرح ....."

"ہاں ۔ وہ میں نے اپنے پاؤں پہ آپ کلہاڑا مارا ...."

"تم نے ڈل کو کیسے بلایا ۔ ؟"

"میں نے ۔ ؟" کشتی اب سب کی سب پانی میں آ چکی تھی اور کینہ بوب والی نے پانی میں چپوڈال دیا تھا۔ "میں گھر گھر گئی اور رحمان کے لئے ایک نیلی آنکھوں والی دلہن لائی ۔ بس وہ انہی آنکھوں میں ڈوب گیا ۔ وہ اُسے میکے لے گئی۔ اور اس نے مجھے اکیلا چھوڑا۔"

کشتی لوٹ چلی دھیرے دھیرے دور اسی دھندلی لکیر کی طرف جہاں سے سلوٹوں پر اُبھر آئی تھی۔ لیکن اب ڈل کے اوپر ہوا تھی نہ پانی کی سلوٹیں۔ آسمان کا آسمان صاف تھا جیسے ڈل میں اُتر کر ابھی ابھی منہ دھو کے اوپر چلا گیا ہو۔ اور اب یہ بات پہلے سے زیادہ صاف تھی کہ ڈل اور اسکے آسمان میں کوئی بات ضرور ہے۔ کیونکہ دیکھتا ہوا آدمی یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ ڈل کی نیلاہٹ اپنی ہے کہ آسمان کی۔

ہ ہ ہ ہ ہ ہ ہ ہ

بھُوت پریت

کروڑی مل روٹی چھوڑ کر دوکان پر بھاگ آیا تھا۔ خبر آئی کہ پیچھا کرنے والے وہیں آ رہے ہیں اور سنتے ہی وہ وہاں سے بھی چل پڑا تھا۔ دوکان سے آگے جاکر، بیر کی گلی سے لوٹ کر اُن سب کو جھانسا دے کر اُس نے بڑ کے شوالے میں آکر دم لیا تھا۔ یہ اچھا تھا کہ شوالے کی اوٹ میں ادھر والوں نے بیٹھنے کو جگہ بنائی تھی۔ جہاں دن میں آکر کوئی ایسا کمر سیدھی کرتا تھا جسے کوئی کام نہ ہو یا کروڑی جیسا جسے کام ہو پر کوئی کرنے نہ دے۔ لیکن کروڑی مل کے لئے اس وقت یہ جگہ بھی کام کی تھی۔ وہ بنا کام کے ایک لمحہ بھی نہ رہ سکتا تھا۔

نیا کام کیا ایک نئی سوچ کرنی تھی جو گھر پر ہو سکتی تھی نہ دوکان پر۔ گھر پر تو خیر کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ کبھی دو گھڑی بیٹھنے کو وقت ہی ملا ہوتا۔ کام کاج والا آدمی گھر میں کرے تو کیا کرے۔ دو وقت کا کھانا ہوتا تھا کھا لیتا تھا۔ مونگ ماش کی دال ہوتی، توری ہوتی یا ٹِنڈا ہوتا۔ کبھی حجت نہ کرتا۔ دن میں کھاتے ہی دوکان لوٹ آتا۔ آدھ گھڑی گلے پر سر ٹکا کر، بس ایک جھپک اونگھ لیتا۔

اور رات کو تھک تھکا کے جب پیٹ میں دو لقمے ڈال دیتا۔ اسکی آنکھیں آپ بند ہو جاتیں اور وہ سو جاتا۔ بھگوان کی دیا تھی کہ بڑھیا سمجھ دار تھی۔ جس نے جوانی میں بھی کچھ نہ مانگا تھا۔ وہی پکاتی تھی جو دوکان سے آجاتا۔ وہی پہنتی تھی جو تیج تیوہار پہ ملتا تھا۔ زیور کی کمی نہ تھی اُسے، سیاہی والوں کی بیٹی تھی۔ میکے سے بھری لدی آئی تھی۔

تنگ کرنے والا تھا تو بھی ایک مانگے لال، جس نے نئی ہوا میں ابھی ابھی اپنا نام بھی بدل دیا تھا۔ موہن لال ۔۔۔ اب مانگے لال موہن لال ہو گیا تھا۔ تو لالہ نے اس بات پر بھی سوچا نہ تھا۔ لیکن یہ ایک پھوسڑا، بھگوان سے مانگا ہوا بیٹا لالہ کو بہت تنگ کرتا تھا۔ گھر میں دس باتیں کھڑی کرتا اگر وہ بڑھیا سمجھدار نہ ہوتی۔ یوں تو مانگے لال ۔۔۔ چلو موہن لال سہی ۔۔۔ اس کے لئے بھی گھر میں سب کچھ تھا۔ پہننے کو کپڑا، کھانے کو روٹی، پھر لالہ نے اُسے پڑھایا تھا۔ بیٹوں کو سبھی پڑھاتے تھے۔ وہ کیوں نہ پڑھاتا جب اُسے پڑھے لکھے مُنیم رکھنے پڑتے تھے۔ ان پر نانوا لگانا پڑتا تھا۔ ان کے نخرے سہنے پڑتے تھے۔ بھلا بیٹے کو ان پڑھ رکھ کر پٹیاں اٹھانے کا کام سونپ دیتا۔؟ اس لئے لالہ نے نہ آگے دیکھا تھا نہ پیچھے، دس جماعتوں کا خرچہ اُٹھایا تھا۔ ایک ایک کتاب مول لی تھی۔ قلم کاغذ سے تنگ نہ رکھا تھا۔ اُسے بڑھتی ہوئی فیسوں کا دھیلہ دھیلہ دیا تھا۔ لیکن مانگے لال نے دسویں پاس کرتے ہی باپ کو اجیرن کرنا چاہا تھا۔ رو دھو کے پھسلانا چاہا تھا کہ دس گنا نانوا اور لگا دے۔ سکول کی جو ہو لی تو کالج کی پڑھائی اور کروا دے۔ پھر گھر میں تو کلیش پڑتا جو اُسے ماں نہ سمجھاتی اور چُپ نہ کراتی۔ یہ کہو کہ لالہ نے بھی پرواہ نہ کی۔ دس جماعتوں کا گھاٹا پڑا۔ اس پر بھی سوچ نہ کی، دھیان تک نہ دیا، کھوجا بھی نہیں کہ پھر وہ کالج میں کیسے داخل ہوا اور اس کا نانوا کہاں سے آیا۔ خیر لالہ سب جانتا تھا۔ ایک نظر میں بازار بھر کو آنکتا۔ اُسے یہ کیسے معلوم نہ ہو جاتا کہ بڑھیا آپ نبھا رہی ہے۔ کر رہی ہے جو اس کی سمجھ میں آ رہا ہے۔ پھر اُس کے میکے والے زندہ تھے۔ اس کا بھائی بیٹھا تھا۔ دس اس کی اپنی چیزیں تھیں۔ جو اس نے لالہ سے چھپا کے رکھی تھیں۔ لیکن لالہ کو اس بات کا بھی افسوس نہ تھا۔ بھگوان نے اُسے بہت کچھ دے رکھا تھا اور پھر بھی

یہ بھی تو خیال آتا ہی تھا کہ موہن لال اسی کا اپنا بیٹا ہے۔ آگے پڑھتا ہے تو پڑھنے دو۔ بابو ہو جائے گا' افسر ہو جائے گا۔ لالہ کی عزت بڑھے گی۔ کیا بُرا سودا تھا کہ ناتوا دوسرا لگا دے اور اپنے نام جمع ہوتا رہے۔

لیکن سودا کیا روگ لگا تھا جو چار ایک سال چُھپا رہا۔ مانگے نے بی اے پاس کر لیا۔ سمجھو ناسُور نے منہ کھول دیا۔ لڑکے نے الٹا دماغ کھویا۔ آسمان کی باتیں کرنے لگا۔ کبھی کہے اب یہ کروں گا کبھی کہے اب وہ کروں گا۔ انٹ کی سنٹ کہنے لگا اور دس پانچ روپوؤں کی نہیں دس ہزار کی مانگ کرنے لگا۔ کہ ولایت جاؤں گا اور جانے لالہ کی بلا کیا پاس کر آؤں گا۔ لالہ کو یہ سُن کر غصہ نہیں ہنسی آئی تھی اور وہ خوب زور سے ہنسا تھا۔ بڑھیا کی چلتی تو اسے یہ رقم بھی لا دیتی۔ پر دوسرا اپنا بھائی بھی ہو' ناتوے والا بھی ہو' کون دے اتنا' کون اپنا گلا کاٹے؟

خیر یہ ایک آندھی آ گئی تھی۔ لیکن آ کے نکل بھی گئی تھی۔ شور ویسے تو کافی پڑ گیا تھا۔ لونڈے نے آفت مچا دی تھی۔ بحث کرنے لگا تھا۔ ہاتھ جوڑنے لگا تھا۔ سبھی سوانگ دھارے تھے اس نے۔ اور جب لالہ جی کی روٹی حرام ہونے لگی تھی۔ اُسے کڑک کے جھڑک دیا تھا۔ اسے گھر سے نکل جانے کو کہا تھا۔ بات بازار پر آ گئی تھی۔ پر جلدی ہی بیچ بچاؤ ہو گیا تھا۔ دس ادھر کے تھے دس اُدھر کے لیکن ادھر والے تماشہ بین تھے۔ ادھر والے سنجیدہ لوگ تھے۔ اونچ نیچ کو سمجھتے تھے۔ لڑکے کو سمجھایا گیا کہ بازار مندا ہے۔ دوکانداری کھری نہیں۔ باپ کو تنگ کرنا بے سود ہے۔ پھر لڑکا ہوش میں آ گیا تھا۔ کم از کم یہ تو اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ لالہ آخر اُس کا باپ ہے دوسرا اُس کا کوئی شریک نہیں۔ بچا کے چھوڑے گا تو اُسی کا مال ہے۔

یہ تو خیر بات کچھ بھی نہیں تھی۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔ مانگے لال نے باپ کے کہنے پر جا کے دفتروں میں درخواستیں دی تھیں۔ لالہ نے کہہ کہا کے امید بھی دلوائی تھی اور معاملہ جلد ہی سنبھل گیا تھا اور اگر نہ سنبھلتا تو لالہ اپنا چُپ سادھ لیتا۔ بات اپنی جگہ آپ بیٹھ جاتی' ایسی کوئی مشکل نہ تھی۔ مشکل کا سامنا تو اب تھا۔ زندگی میں پہلی بار' ایسے کہ لالہ کی سِٹی گُم ہو گئی تھی

مانگے لال اچانک بیمار ہو گیا تھا۔ روٹی کو منہ نہیں لگاتا تھا، نہ منہ سے کچھ بولتا تھا۔ لالہ نے حکیم بلوایا، وید بلوایا، آوازیں دے کر اپنا سر پیٹا پر مانگے لال نے زبان نہ کھولی۔ کسی نے کہا زبان کو فالج ہو گیا ہے۔ کسی نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہے یونہی کمزوری ہے جو کھا پی کے ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن کوئی بات تو تھی جو پورے پانچ دن ہو گئے، مانگے نے تھوک نگلنے کو بھی زبان ہلائی نہیں۔ گلی بھر حیران تھی اور سب میں بُری بات یہ تھی کہ مانگے کی ماں نے ساتھ دھرنا دیا تھا۔ نہ کھاتی تھی نہ پیتی تھی۔ رو رو کر ڈھیر کر دیئے تھے اس لئے گھر کی رسوئی سُونی پڑ گئی۔ چُلہے بگڑ گئے اور خود لالہ کو ڈھابے کی روٹی کھانی پڑی ـــــ ایک تو بیٹھے بٹھائے لالہ کے بیٹے کا یہ حال ہو گیا تھا۔ دوسرے لوگ آ آ کے ڈاکٹروں حکیموں کی فہرستیں سناتے تھے۔ اُن کے کرشمے بتاتے تھے، ٹونے سمجھاتے تھے اور یہ بھی سنا دیتے تھے کہ لالہ کچھ بھی نہیں کرتا۔ سنانے والے دس پانچ ہوتے تو لالہ دیکھ لیتا۔ ایک دنیا بولنے لگی تھی۔ اُدھر اِدھر کی میں سُناتے تھے۔ مُنہ پر بھی کہہ دیتے تھے۔ گلی میں لالہ نکلے ایک دوسرے کو اشارے کرتے تھے۔ سودا سلف لینے والے گاہک آتے تھے بھاؤ پوچھتے پوچھتے وہی بات کر دیتے، گھر جاتا تو دس بیٹھے ملتے تھے۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ بات بات کاٹنے آتی تھی۔ لالہ کرتا تو کیا کرتا اپنی زبان بیٹے کو لگاتا؟ لوگ کہتے تھے کہ ویدوں کی گولیاں اور حکیموں کے جوشاندے بیکار ہو گئے ہیں۔ مانگے کی ماں نے ڈاکٹر بھی ایک سے ایک بڑھ کر بلایا تھا۔ کیا کہا تھا انہوں نے؟ کیا کیا تھا انہوں نے؟ ایک کہتا تھا "ہے" اور ایک کہتا تھا "نہیں ہے" پانچ دنوں کی "ہے" "نہیں ہے" میں کتنا نالوا اُٹھ گیا تھا ـــ!

لیکن بات اس سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ بہت آگے۔ مل کر سب لوگ کہنے لگے تھے کہ مانگے پر کسی اوپری روح کا اثر ہے۔ لالہ بھُوت پریت کو مانتے تو تھے۔ لیکن انگریزی پڑھے لکھے کو بھوت پریت چمٹتا کبھی نہ سنا تھا۔ پھر اگر مانگے کو بھُوت ہی تنگ کر رہا تھا۔ چوآنی چوآنی کے دس جھاڑنے والے بیٹھے تھے۔ پر اب تو لالہ نے قسم کھالی تھی کہ دوا ہو، دارو ہو، جادو ٹونا، جنتر منتر کوئی بھی چیز ہو بے بات کو لالہ دھیلہ خرچے گا نہیں۔ ڈاکٹر آ جائے چاہے جھاڑنے

والا آجائے، لالہ دوٹوک سنانے بیٹھا کہ دام چکاؤ، مانگے منہ کھول کے بات کرے، روٹی کھالے
تو اپنے پیسے لے جاؤ۔ ڈیڑھ مطلب کی بات تھی۔ جس کی سمجھ میں آتی کام کر کے دکھاتا اور اپنے
دام لے جاتا۔ ادھر مانگے کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں کر کے دیکھ رہا تھا۔ جیسے
کسی نے اس کی زبان کو دبائے رکھا ہو اور لالہ دیکھ دیکھ کے گھبرا اُٹھتا۔ اُس کے سر کو پھر ہلا کے دیکھتا
منہ کھولکر دبے ہوئے دانتوں کو دیکھتا۔ جبڑوں کو کھلوانا چاہتا جب بڑھیا ہاتھ روک لیتی۔ چھاتی
پیٹنے لگتی اور لالہ ارادہ لے کے اٹھتا کہ دنیا میں جو کچھ ہو سکتا ہے کروں گا۔ پسینہ پونچھتا ہوا لالہ سڑک
کے بیچ سوچنے لگتا، کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا۔ مجبور ہو کر دکان ہی پر آ جاتا۔

چھٹا ہی دن تھا وہ جب مانگے کے دوستوں نے، لالہ کے سالے سلہجوں نے ان کے ساتھ
ملے ہوئے گلی والوں نے اور برابر کے دوکانداروں نے لالہ کو گھیرے رکھا اور ایک ہی بات سے
کان کھائے۔ آتم بودھ نام کا کوئی ابھی ابھی متھرا سے کہ جانے کہاں سے آیا ہوا۔ کوئی پھونکنے والا'
جس نے سب کو الو بنا دیا تھا۔ کہا تھا اُس نے کہ مانگے پر بھوت نہیں پریت ہے۔ پر بیت بھی
کون لالہ کے سور گباشی پتا آپ! سنتے ہی لالہ کو وہی ہنسی آئی تھی' زور کی ہنسی' لیکن یہ ہنسی اکیلی
رہ گئی تھی۔ کوئی دوسرا ہنسا نہ تھا۔ یہ ہنسی اُس کی طرف لوٹ سی آئی تھی۔ بیمار کے سامنے سب لوگ
آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے تھے۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مانگے کے اندر دادا کی آتما کو بھی غصہ
آیا ہے۔ لالہ نے خیر اپنے آپ کو فوراً سنبھالا تھا۔ ہنسی پی لی تھی اور وہی اپنی شرط دہرائی تھی کہ
دام چکا دو۔ کام دکھا دو اور اپنے پیسے لے جاؤ۔ چاہے آتم بودھ مہاتما ہو یا کوئی اور۔ لالہ کو اول
تو یہ یقین تو تھا نہیں کہ زبان کا فالج جھاڑ پھونک سے دُور ہو جائے گا۔ علاج بھی کرے کوئی
برسوں لگ جائینگے۔ حکیم جی نے صاف کہا تھا اور جب لالہ نے غور سے دیکھا تو مانگے کا منہ
بھی ٹیڑھا ہوتا دکھائی دیا۔ اس وقت لالہ کی اپنی کمر میں مینخ سی چبھ گئی۔ لالہ کھڑا نہ رہ سکا۔ اور
جب اُس نے اپنا منہ دوسری طرف موڑا تو کسی کی آنکھیں اُس سے بھیک سی مانگنے لگیں اور لالہ
کے دل میں دکھ کے ساتھ غصہ آیا کہ یہ لوگ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ لالہ اپنے بیٹے کا علاج نہیں

کروانا چاہتا۔ اُس نے مانگے کے اسی ہاتھ جوڑتے ہوئے دوست کو یے کے گڑکی ڈلی اور سب کو سُنلاتے ہوئے اُسے کہا "لاؤ کون ہے تیرا یہ بھوتوں والا سوامی، لاؤ اسے، جو چاہے سو مانگے، جو کہے گا وہ دوں گا۔ پر یاد رکھیو! بنیئے کا بیٹا ہوں، ایک دھیلہ نہ دوں گا تب تک جب تک مانگے بولے گا نہیں، روٹی کھائے گا نہیں۔" لڑکا اتنا سنتے ہی دروازے کی طرف لپکا تھا۔ لالہ نے اسے روک کر اور کہا۔ "اور یاد رکھیو! اُسے کہہ دینا، خالہ جی کا گھر نہیں، لونڈے کی جباں پر فالج ہے فالج، اس کے بابا کا پریت نہیں......" لالہ اور بھی کہتا گیا۔ لیکن لڑکا اڑن چھو ہو گیا۔ اور پھر لالہ دل میں ایک نئی تسلی کے ساتھ سلیج کی پکائی ہوئی روٹی کھانے لگا تھا۔ لوگ کہتے تھے لالہ کو بیٹے کا دُکھ نہیں اور اب جو لالہ نے اپنے من کی سُنا دی تھی، لوگ اس پر بھی حیران ہو گئے تھے۔ گلی بھر اور بازار بھر میں بات گھومنے لگی تھی اور جو جو آ سکتا تھا خبر لینے کے بہانے آ گیا تھا۔

پھر سوامی آتم بودھ تو نہیں آتم بودھ کا کوئی منشی آ گیا تھا اور اتنے لوگوں کے سامنے اس نے آتم بودھ کی بات کہہ دی تھی۔ بات کیا دہی آندھی تھی۔ جس نے لالہ کو وہاں سے بھگایا تھا۔ لالہ نہالی چھوڑ جھوٹے ہاتھوں ہی گھر سے چل نکلا تھا اور تماشہ یہ کہ ان بیٹھے ہوؤں میں سے بھی کئی اُس کے پیچھے ہو لئے۔ یہاں تک کہ لالہ کو دکان سے بھی بھاگنا پڑا تھا اور گلیوں کے ہیر پھیر میں پیچھا کرنے والوں کو پتہ بھی نہ لگا تھا۔ کہ لالہ شوالے میں آ کر سوچنے لگا ہے۔

سو پچاس نہیں، آتم بودھ ہزاروں کا ٹھگ تھا۔ کہلا بھیجا تھا کہ پورے پندرہ ہزار لوں گا۔ لالہ مذاق میں اڑا دیتا اور منشی کو آنکھیں دکھاتا اور وہ رفو چکر ہو جاتا۔ لیکن منشی نے سب کے سامنے یہ بھی کہا تھا کہ سوامی کو گیان ہے کہ کام بہت مشکل ہے۔ لالہ جی کہتے ہیں آسان نہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ پریت لڑکے کے اپنے دادے کا ہے۔ جس کے مرنے پر پورا شرادھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ پریت اب تک آس لگائے بیٹھا تھا کہ کم از کم گیا جی کے شرادھ سے چھٹکارا ملے گا۔ لیکن لالہ جی نے گیا جی میں شرادھ بھی نہیں کروایا تھا۔ پریت کی آتما چنچل ہے روپیہ وہی مانگ رہی ہے۔ سوامی جی خود نہیں کھاتے۔ اُپائے کرنا ہے اُن کو، آتما کو شانتی دلانی

ہے۔ نہیں ملے گا روپیہ تو اور بُرا یہ ہو سکتا ہے کہ خود لالہ گرفت میں آجائے۔ لیکن سوامی جی کا وعدہ تھا کہ وہ آئیں گے اور ٹھیک کر کے ہی جائیں گے۔ ایک آدھ گھنٹے کی بات تھی۔ لالہ اس کو سر پھرا پکارتا۔ لیکن آتم بودھ نے یہ بھی کہلا بھیجا تھا کہ گلی کے دس کو جمع کیا جائے گا۔ باہر کمرے میں بٹھایا جائے گا۔ آتم بودھ کسی بڑے کے ہاتھ سو سو کے دس نوٹ رکھ دے گا کہ اگر آدھ گھنٹے میں لڑکا بولے نہیں، روٹی کھائے نہیں تو لالہ کو دہی ہزار روپیہ نقد جرمانہ دیا جائے گا۔ اب لالہ بولتا تو کیا بولتا۔ اسکی تمام باتوں کا جواب آیا تھا۔ ایک سیدھے سے سودے کا پیغام آیا تھا۔ لیکن لالہ کا دل اندر اندر ڈوبنے لگا تھا۔" کوئی بات ہے اسمیں"۔ اُس کے دل نے کہا تھا اور اُسے ایسا دکھائی دیا تھا کہ اس کے گِرد حلقے کس گئے ہیں یا گِدھ جمع ہو گئے ہیں۔ اُسے نوچیں گے، کھائیں گے، اُسے سوچنے بھی نہ دیں گے۔ اسی لئے وہ گھر سے بھاگ کر دکان اور دکان سے بھاگ کر شوالے میں آ گیا تھا۔

پندرہ ہزار نقد، یک مُشت ـــ بھوت والے کا کلیجہ بڑا ہوگا، لالہ نے سوچا جو ایک ہاتھ میں اتنا نانوا مارنے کو نکلا ہے۔ لالہ کو جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ خون پسینے کی کمائی تھی۔ یوں پھینکنے کی عادت ہوتی تو لالہ کی یہ صورت نہ ہوتی۔ لالہ نے اپنے پسینے پونچھ لئے اور پاس کے پتھر پر اپنا ہاتھ ٹکا دیا ـــ "ٹھگ ہے وہ ٹھگ"۔ لالہ اپنے آپ سے بولنے لگا۔" پر میں کیوں آؤں جال میں۔ نہیں کروانا علاج ہم نے ـــ کہتا ہے پریت ہے ...... باباجی کا..."
شوالے میں ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اور لالہ کو پرانی یادیں آنے لگیں۔ باباجی جب گزرے تھے انہوں نے دھوم سے ارتھی نکلوائی تھی۔ ریشم کی چادر ڈلوائی تھی، اور پھر...... اور پھر جیسے کسی نے لالہ کے کلیجے کو پنجوں سے پکڑ لیا ہو...... بابا کے پھول ہردوار کیا لالہ گڑگنگا تک بھی نہ لے گیا تھا۔ یہیں جمنا میں ڈال آیا تھا۔ دکان اور گھر کی دس باتیں سنبھالنی تھیں، ایک پروہت کو جما کے، بغیر ترین شرادھ کے کام کو نبھایا تھا۔ لالہ کو ڈر ہونے لگا کہ بابا کا پریت واقعی بھٹکتا رہا ہوگا۔ دس بار جی میں آئی تھی کہ گیا جی جاؤں اور شرادھ کری آؤں۔ لیکن وقت کہاں ملتا تھا؟ لالہ کا دل

سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیکن ساتھ ساتھ پندرہ ہزار روپوں کا ڈھیر سا اس دھڑکن کو دبانے لگا۔ "پریت ـــ ؟ یہ تو ڈھکوسلا ہے۔ پر سوامی ہزارہ کا نانوا گردی کیوں رکھ رہا ہے" لالہ کا دل پھر دھڑکنے لگا کہ پندرہ ہزار گئے، ڈھیر گر گیا اور بکھر گیا۔ "لیکن ـــ لیکن یہ آدھ گھنٹے میں فالج کیسے جائے گا۔ ؟ نہیں ہوگا فالج پھر ـــ" لالہ کو ہوش آگیا۔ "لیکن ـــ لیکن مانگے کا منہ ٹیڑھا ہونے لگا ہے اور اگر ہے فالج ہی تو کہاں ٹھیک کرے گا وہ اتنی جلدی ـــ نہیں کرے گا"۔ لالہ ایک نئے بھروسے کو لے کر کھڑا ہوا۔ "دیکھوں ہجار کا نانوا گردی رکھتا ہے کہ نہیں"۔ لالہ ایکدم آگے بڑھا اور لیکا یک جیسے اس کی مشین سی بند ہو گئی۔ اسے ایسے دکھائی دیا کہ مانگے کا منہ ایک طرف کو گر گیا ہے۔ جیسے فالج پھیلتا پھیلتا منہ پر آگیا ہے۔ اسکی بڑی بڑی آنکھیں سوکھ کر سکڑ گئی ہیں اور .... اور لالہ کی ٹانگوں سے جان نکل گئی۔ اور دو آنسو کہیں بہت اندر سے کاٹتے چیرتے نکل آئے۔ "نہیں نہیں"۔ اس نے روتی ہوئی آواز میں اپنے کو سمجھایا "مانگے کی زبان پر فالج نہیں ہوگا۔ اس کا منہ اور ٹیڑھا نہیں ہوگا"۔ پھر دو آنسو ایسے نکل آئے جیسے ان کے لئے راستہ کھل گیا تھا "مانگے .... میرے بیٹے .... میرا پانی دیوا...... بیٹا یہ روپیہ تیرے ہی لئے تو ہے۔" ٹانگوں میں جان لوٹ آئی اور لالہ گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچتے پہنچتے لالہ نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ روپیہ مانگے کا ہے تو صحیح لیکن اجاڑنے کے لئے نہیں۔ نہیں دوں گا اجاڑنے نہیں دوں گا ؟ "یہ اور بات تھی کہ مانگے کی زندگی خطرے میں تھی۔ پندرہ ہزار چھوڑ لالہ دولت لٹا دیتا۔

اسی شام کو پھر لالہ نے آپ ہی گھر گھر جا کر سب کو بلایا۔ حکیم دیوی داس کو بیچ میں بٹھایا کہ ہزارہ کا نانوا وہ سنبھالے کہ بھوتوں والا جھوٹا ہو جائے تو جرمانے کا نانوا کہیں گڑبڑ میں نہ پڑے۔ شام لال وکیل نے ایک کاغذ بھی لکھ دیا جس پر سب کے دستخط ہو گئے۔ وکیل دستخط تو کرواتا گیا مگر کہتا گیا بھوت ووت تو نہیں کوئی اور بات ہے۔ لیکن موقع کی گرمی کچھ ایسی تھی، تماشے کا جوش تھا۔ سب لوگ انتظار میں بیٹھے تھے کہ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔

سوامی کے دو ایک آدمی پہلے آچکے تھے۔ کمرہ تیار کر رہے تھے۔ کمرے سے سب کو نکالا گیا۔ کالے پردے ڈالے گئے۔ فرش پر چونے کے چکر ڈال دیئے گئے۔ بیچ میں انگیٹھی جلائی گئی۔ گوگل کے موٹے موٹے ڈلے جلنے لگے۔ دھوئیں کے بادل اٹھنے لگے اور لالہ کو ڈر ہونے لگا کہ کہیں دھوئیں میں ڈاکہ نہ پڑ جائے۔ اُٹھ کے اُس نے منشی سے پوچھا کہ سوامی کے ساتھ کتنے اور آئیں گے۔ تسلی ملی کہ اور دو ڈھول والے آئیں گے اور خود سوامی۔ چھ ایک آدمی کیا کرتے گھر میں گلی بھر جمع تھی۔ دکان کے سبھی آدمی تھے۔

رات پڑتے ہی ڈھول بجنے لگے، دل دھڑکنے لگے اور دھواں اور گھنا ہو گیا۔ حکیم جی نے دس نوٹوں کو تین کپڑوں کے نیچے والی جیب میں ڈال دیا اور پر دونوں ہاتھ دبائے اور لالہ نے بھی یہ کسی کو نہ بتایا کہ پندرہ ہزار کے نقد نوٹ اس نے بیمار کے پلنگ میں ہی یعنی نواڑ کی گھسی ہوئی نچلی تہوں میں پھنسا کے رکھے تھے۔ اوپر موٹے موٹے دو گدے تھے۔ دو چادریں تھیں اور مانگے کی بیمار کاٹھی۔ صرف مانگے لال کو پتہ تھا۔ لیکن مانگے لال کی آنکھیں کیا دیکھتی تھیں کیا نہیں دیکھتی تھیں خود لالہ کو بھی معلوم نہ تھا۔ لالہ کا مطلب یہ تھا کہ بھوتوں والا ڈاکو کا باپ بھی ہو، گھر بھر کا کونہ کونہ چھان مارے، دھیلہ نہ ملیگا اُسے۔ بیمار کے نیچے نالوا دبا رہے گا۔ اور اگر مانگے ٹھیک ہوا تو روپیہ دینا ہی پڑے گا۔ مانگے کے نیچے سے نواڑ کی اندر والی تہوں میں پھنسا ہوا روپیہ دے کر مانگے کا صدقہ بھی اتر جائے گا۔ بڑھیا دوگنی خوش ہو جائے گی اور لالہ کو اپنی ہوشیاری دکھانے کا ایسا موقع بھی مل جائے گا۔

ڈھول اونچے ہو گئے تو دروازے پر سوامی آتم بودھ کی ہانک سنائی دی۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ سمٹ گیا۔ خاموشی چھا گئی اور وکیل کی مُسکراہٹ سُکڑ گئی۔ سوامی کی صورت ڈراؤنی تھی، لمبے لمبے بال تھے۔ منہ پر کالے رنگ کے تھوپ تھے۔ ہاتھ میں ایک ٹیڑھی سینگ سی لٹھیا تھی اور کالی چادر اوڑھے تھا۔ اس نے آتے ہی کالی چادر پھینک دی۔ ننگے بدن پر کالا لیپ تھا۔ آتے ہی آندھی کی طرح اندر کمرے میں گھس گیا۔ ڈھول بہت اونچے ہو گئے۔ دروازے کے باہر گلی میں اور لوگ

جمع ہو گئے اور مانگے کے پاس ڈھول والے دو منشی اور سوامی جانے کیا پڑھنے لگے۔ سب لوگ باہر بیٹھے تھے۔ لالہ بھی باہر، بڑھیا بھی باہر۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔

اچانک مانگے کی چیخ سُنائی دی۔ بڑھیا اچھل پڑی۔ لالہ نے اُسے تھاما، دروازے کے باہر گلی میں بھی ہلچل سی مچی۔ مانگے پردہ اٹھا کر، گرتا کانپتا باپ کے قدموں میں آگرا۔ بہت کمزور تھا۔ ماں نے اس کا سر اپنی گود میں لیا۔

"اماں بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ دیدو۔" لالہ نے آدمی دوڑائے مٹھائی کی ٹوکری آگئی۔ مانگے سات جنم کے بھوکے کی طرح کھانے لگا۔ اسی گرما گرمی میں بھوت والا سوامی باہر آیا۔ بغیر کہے سنائے یا کچھ مانگے چادر اوڑھے چلا گیا۔ باہر جاتے ہی بھیڑ میں غایب ہو گیا۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ کہاں گیا۔

منشی نے پھر باہر آکر سنایا کہ سوامی بڑا گیانی ہے، اُس نے اپنے روپے بھی لے لئے۔ نوا ڑ میں پھنسے تھے۔

لالہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ منشی، وہ ڈھول والے نہ جانے وہ بھی پھر کہاں گئے ــــ !

دو دن بعد مانگے کے خاص دوستوں کی ایک زور کی دعوت ہوئی۔ ہنس ہنس کے انہوں نے پڑوسیوں کے کان پھاڑے اور دو مہینے بعد جب مانگے لال یعنی موہن لال ولایت پڑھنے گیا۔ تو لوگوں نے طرح طرح کی باتیں اڑائیں۔ اور لالہ کی سمجھ میں بہت دیر تک یہ بھی نہ آیا کہ مانگے نے نالوا کہاں سے لیا۔ !

.:::::::::::::.

گدھ

کم از کم پچاس سال، ایک ایک دن میں کئی کئی بار، اس پہاڑ کو اس نے ریڑھ کی ہڈی پکارا تھا۔ پہاڑیوں تو گاؤں بھر کے پیچھے کھڑا تھا۔ لیکن اسی کی جھونپڑی پہاڑ کے عین قدموں میں تھی اور جس وقت وہ اپنی لمبی لمبی ٹانگیں ہڈیوں کی ایک قینچی کی طرح کھولتا، بدن کی اور ہڈیوں کو بڑے پتھر کے ساتھ ٹکا دیتا۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ وہ پہاڑ اسی کی ٹیک کے لئے برسوں سے وہاں کھڑا ہے۔ کمر ٹکاتے ہی اس کی باہنوں کی رگیں اینٹھ جاتیں، اس کے ہاتھوں میں بجلی سی دوڑتی، اس کا چاک گھومنے لگتا اور ناچتی ہوئی مٹی میں سے انسان کے رشتہ دار، سروالے، بدن والے، سیدھے، ٹیڑھے، چھوٹے، بڑے، مٹکے اور ہنڈیاں، حقے اور سکورے چکر کھاتے وجود میں آتے ـــــ حرکت سے جمود میں آتے۔

کم از کم پچاس سال، ایک ایک دن میں کئی کئی بار اس نے اس پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھا تھا۔ وہ صبح کی پہلی سفیدی کو وہیں پر ابھرتے دیکھتا تھا اور دیکھ کر اسی پہاڑ کی مٹی اور پانی کو گھولنے لگتا۔ وہ

وہ راحتی کے بلاوے کا جواب تب ہی دیتا جب سورج بھی چوٹی پر سے ڈھلک آتا۔ چوٹی پر سونا دیکھ کر اس کے ہونٹ ایک مُسکراہٹ میں پھیلتے اور اُسے چائے کی طلب ہوتی۔ جب سارا پہاڑ سنہری دھوپ میں ڈھل جاتا۔ وہ جا کے چاولوں کا ایک تھال کھا لیتا اور جب ڈوبتا ہوا سورج اس کے پہاڑ کو ایک قرمزی ٹوپی پہناتا۔ وہ چاک سے ہاتھ اٹھا لیتا۔ سر کو بھی پتھر کے ساتھ لٹکاتا اور حنائی بالوں کو ایسے چھُوتا جیسے پہاڑ کے سر پر ڈھلتی دھوپ کو چھُو رہا ہو۔ اسکے کھڑے ہوتے ہوتے پہاڑ کی چوٹی اُودی ہو جاتی اور وہ اپنی شام کو بھی اس وقت پہچانتا جب وہ بھی اس کے پہاڑ پر انگڑائیاں لینے لگتی۔

گرمیوں میں اسے ناز ہوتا کہ وہ پہاڑ کی اچھوتی ہواؤں کو پہلے چھُوتا ہے۔ اسے یہ بھی یقین ہوتا کہ پہاڑ اس کے کہنے پر ہواؤں کو گھٹاتا ہے۔ بڑھاتا ہے اور جب پہاڑ اُس کی نہیں سنتا تھا۔ وہ سمجھتا کہ پہاڑ اُسے تقدیر کا مشکل سبق سکھا رہا ہے ــــ اور یہ بات تو تھی ہی کہ وہ نرم نرم جھونکے اس کے کانوں میں پہاڑ کی دانائی پھونکتے رہتے تھے جو اس علم کے اندھے ان پڑھ کمہار کو وہ باتیں سوجھتیں جو وہ کرتا تھا۔ وہ مشورے دماغ میں آتے جو وہ برادر انسان کو دیتا رہتا۔ وہ کسی نہ کسی جھونکے کا دل ہی دل میں شکر گزار رہتا۔ جب وہ چاک چلاتے چلاتے دم لیتے ہوئے گھڑیوں کو زمین و آسمان کے راز سمجھانے لگتا کہ پہاڑ جنّت سے کیسے گرے۔ نیچے شیطان کیسے دبے، اور نیک ہریالی کیسے پھیلی۔ یا اس وقت جب وہ جگر کی گرمی کا علاج پہاڑ کی اس گھاس سے بتاتا اور دل کی سردی کا فلاں جڑی سے۔ آنکھوں کے بتیس دائرے گنواتا، شہر کے ان دیکھے مکانوں، بازاروں، دریا پر کے پُلوں کے نقشے کھینچتا یہ سب اسی پہاڑ کی دین تھی، نہیں تو اس نے یہ باتیں کہاں سے سنی تھیں۔؟

سردیوں میں جب جھونپڑی کے شگاف تک بند رہتے۔ اس کی ٹیک اندر پشت کے پچھلے حصے میں آتی، جہاں ایک طرف مٹکوں، ہنڈیوں کی دیواریں چنی رہتیں، گودام جس کو گرمی کی دھوپ اور ہواؤں میں بھر دیا ہوتا۔ اور دوسری طرف دو گائیں اور دو بچھڑے بندھے رہتے۔ گائیوں کے پیچھے موسم بھر کی سوکھی خوراک اور ان کے آگے گرم سانسوں کی لمبی گھنی گھٹائیں، گہرے برف

کی لپیٹ میں بھی اس کی ٹیک سوکھی گھاس کے بچھونے پر نرم نرم گرم گرم رہتی۔ یہاں جو ہوا تھی اُبلی ہوئی تھی، باسی تھی۔ لیکن تھی اُسی پہاڑ کی۔ یہاں بھی وہ اپنے پوتے خلیل کو کہانیاں سناتا رہتا۔ جن میں بیشتر ایسی ہوتیں جو اُس نے خود کسی سے نہ سنی ہوتیں۔ پہاڑ کی باسی ہوا میں بھی اُسے کہانیاں ملتی تھیں اور وہ خلیل کو سناتا ہی رہتا۔

خلیل کے ننھے دل میں زیادہ سوال ان مٹکوں کی طرف دیکھ کر اچھلتے تھے۔ جنہیں الگ رکھا گیا تھا۔ جن کی طرف جو تالے جانا منع تھا۔ جن کے پاس کھلونوں کے ڈھیر تھے۔ جن میں سے اُسے ایک بھی نہ دیا جاتا اور جواب بار بار سننے پر بھی اس کی تسلی نہ ہوتی۔ لیکن جواب چونکہ کھلونوں سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتے۔ وہ ان کو گھنٹوں سنتا رہتا اور یہ ہوا ہی کا اثر تھا کہ بوڑھا کمار ایک ایک سوال کے جواب میں کئی نئی نئی باتیں سناتا، سنی سنائی خاندان کی باتیں، ان سُنی ہوا کی اڑائی ہوئی باتیں، باتیں جو تھیں، باتیں جو تھیں نہیں۔ لیکن باتیں جو بادام کی گری سے بھی میٹھی تھیں۔

یہ ایک تو پُشتوں کی بات تھی کہ کچھ مٹکے ہر سال الگ رکھے جاتے تھے۔ "بٹ" یعنی ہندو ججمانوں کے لئے جو شوراتری پر برتن لینے آتے تھے۔ وہ اس کے خریدار نہیں ججمان ہوتے تھے۔ دام نہیں دکھشنا دیتے تھے۔ ہندو ججمان مسلمان کمہار کو، جو ان کے لئے مٹکے ہی نہیں چھوٹے چھوٹے شیولنگ، دھوپ دان اور پوجا کی دوسری چیزوں سے بھی گودام بھر کے رکھتا اور یہی تھے وہ کھلونے جو خلیل کے دل میں سوالوں کو اکساتے تھے۔ کھلونے جو اُسے کھیلنے کو نہیں ملتے ــــ پھر یہ بھی پشتینی علم تھا کہ ججمان ان مٹکوں کی برات نکالتے ہیں۔ ان کی پُوجا کرتے ہیں۔ انہیں مٹکوں کو ہار پہناتے ہیں۔ ٹیکوں سے سجاتے ہیں۔ ان میں اخروٹ بھگوتے ہیں جو پوجا کے بعد تبرک بنتے ہیں اور عقیدت مندوں میں بٹتے ہیں۔ یہ سب بوڑھے کے مٹکے ہوتے تھے۔ جن کو شوا اور پاروتی بنایا جاتا تھا۔ جن کے اعزاز میں نفیریاں بجتی تھیں۔ دعوتیں اڑتی تھیں۔ اُسی کے مٹکے، اسی کی تخلیق، اُسی کی غلطیاں، اُسی کے شاہکار ــــ انہی کی کہانیاں سناتے سناتے وہ کیوں تھکتا؟

پھر وہ ہوا کی پیداوار، اَن سُنی کہانیاں، باتوں میں باتیں، مٹکوں کی نقل سے اصل آسمانی برات

تک جس میں کئی اسلامی فرشتے بھی شامل ہوجاتے اور کنیاداں کے ساتھ نکاح کی رسم بھی ہوتی۔ اور دھیرے دھیرے جب خدا کی کہانی شروع ہوجاتی، خدا جس کے دو بیٹے تھے، ایک نے مسجد بنائی ایک نے مندر، کہانی گائے کے لمبے گھنے سانسوں میں مل جاتی۔ خلیل سوجاتا۔ اور کبھار برف سے ڈھکے ہوئے چاندی کے پہاڑ کو دیکھنے اور تازہ ہوا کے ایک گھونٹ کے لئے دروازے سے باہر سر نکالتا۔

کم از کم پچاس سال، اس وقت سے جب اُس کی مسیں بھیگی تھیں اور اس کا باپ گذر گیا تھا۔ پہاڑ، آوا، جھونپڑی اور راحتی اس کی ہوگئی تھی۔ اس نے ایسی ہی گرمیاں اور ایسی ہی سردیاں گزاری تھیں اور پہاڑ کے اوپر سے جو سیاست وہاں تک آ بھی گئی تھی۔ وہ بھی اُس کو گھر کی بھاجی کی طرح راس آگئی تھی، سیاست وہی اپنی مٹی کی، دو بیٹے ایک باپ ہندو مسلمان ایک جماعت، وہی مٹکوں کی سیاست، ملک بھر میں مٹکے پوجے جاتے تھے، شوراتری منائی جاتی تھی، اور مٹکے بنانے والا خدا کا وہی بیٹا تھا۔ جس نے مسجد بھی بنائی تھی۔ پھر اس نے تو یہ بھی سنا تھا کہ بڑے شہر سرینگر میں ایسے بھی آستان ہیں۔ جن میں ایک طرف مسجد اور ایک طرف مندر ہے۔ اپنے شہر سے ایسی باتیں کیوں آتیں جو اُس کے نظریوں میں دوئی ڈالتیں، جو اس کے جھونکوں میں لرزہ ڈالتیں — ؟ چاک چلاتے ہوئے وہ سیاست کی باتیں بھی سنتا تا، سُنی ہوئی باتیں، اَن سُنی باتیں، باتیں جو اسکی غیر سیاسی باتوں سے ہم آہنگ تھیں —!

لیکن گرمیوں کی ایک رات کو جب اُس چوٹی پر سفیدی تو نہیں سفیدی کی امید سی آگئی تھی اور وہ آنکھیں ملتا ہوا غرب دشرق کے اندھیرے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس نے پہاڑ کے الوپ بدن پر روشنی کی ایک تیز لہر گھومتی دیکھی۔ بھیگی رات کے اندھیرے میں یہ روشنی اس کی سمجھ میں نہ آئی اور اس کا ہاتھ ایک پپوٹے پر رک گیا۔ لہر ابھی وہاں ابھی یہاں کوندتی جاتی تھی۔ پہاڑ کا ابھی یہ ٹیلا ابھی وہ ٹیلا ڈھل کے دکھائی دیتا اور یہ روشنی گول گول سوئی سوئی لالٹین کی جیسی نہیں تھی۔ نہ یہ کنول سا اٹھتا ہوا شعلہ تھا جو گڈریے کی لکڑی سے اٹھ رہا ہو۔ یہ وہ روشنی تھی جس کے رنگ کو بھی اُس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جو ایک پھوٹے سے چشمے سے لپکتی تھی اور دامن تک جا کے بھی اُس چشمے میں لوٹ آتی اور

غوطہ لگاتی، کبھی اس کی طرف بھی لپکتی لیکن اس تک نہ پہنچ پاتی، بیچ ہوا میں پھیل کر رہ جاتی تھی اسے ڈر کیا یقین ہو گیا کہ دبا ہوا شیطان پہاڑ میں سے نکل آیا ہے۔ کھڑکی تو اس نے بند کر لی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہؐ بھی کرما گیا۔ لیکن شیطان کی چمک دمک انوکھی تھی اُسے جھری میں سے دیکھتا رہا۔

اس سے پہلے کہ وہ خدا کی روشنی کو پھیلتے دیکھتا اور شکر کرتا۔ شیطان کی روشنی جو کچھ دیر غوطہ میں رہی تھی بہت نزدیک سے اُسی کو گھورنے لگی۔ جھری میں سے آکے اُس کی داڑھی میں اٹک گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چیخ کے اندر بھاگتا اور داڑھی کو نوچنے لگتا۔ اُس نے دیکھا کہ روشنی کے پیچھے برادر انسان ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے کہ وہ سلام علیکم کہتا اس کو دو آہنی ہاتھوں نے پیچھے سے پکڑ لیا اور ایک نے اس کا منہ بند کر لیا۔ ایک لمحہ میں وہ اپنے پہاڑ کے قدموں میں ہی اپنی ٹھنڈی ہواؤں میں اور سحر کی سفیدی میں اغیار کی ایک خونخوار بھیڑ میں محصور ہوا۔ یہ لوگ اس مٹی کے نہیں تھے، ان کے ہاتھوں کی سختی برادر انسان کی نہیں تھی، ان کی کانا پھوسی میں، آنکھوں کے کونوں میں اور ان کے "ہش ہش" میں سازش تھی جو پہاڑ کے قدموں میں اور روشنی کی آمد آمد میں کمہار کے سمجھ میں نہ آئی۔ ان کی بولی میں کاٹنے مارنے کے ارادے تھے اور کچھ نہ تھا۔ اُن کی آنکھوں میں خون گشت کر رہا تھا۔ ان کے شانوں پر بندوق تھے اور بوریاں تھیں اور ان کی بوٹی بوٹی بے چین تھی۔

ایک نے اُس سے سوال کیا، دوسرے نے رائفل تانی اور تیسرے نے اُس کے منہ سے دو انگلیاں اٹھائیں کہ وہ جواب دے۔ سوال میں دو لفظ کشمیری بھی تھے۔ کافر۔؟ اس گاؤں میں کافروں کے گھر کہاں تھے۔؟ وہ اب سمجھا کہ یہ لوگ کافر ہیں اور اپنی برادری کی تلاش میں ہیں۔ وہ ان کی داڑھیوں کے بال بال کو دیکھنے لگا۔ "یہ ہیں کافر ——!" وہ حنجرے کے راحتی سے بھی کہنا چاہتا تھا۔ لیکن ہڈیوں پر لوہے کی گرفت اور سخت ہوئی اور دباتی ہوئی انگلیوں کے نیچے سے بھی اسکی آواز بھاگتی نکلی کہ گاؤں میں ایک بھی کافر نہیں۔ کافر اس کے ملک میں نہیں اور جب رائفل والے نے حرکت کی اُس نے تینوں سپاروں کی قسم کھالی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا۔ اور جب اس نے لفظ ہندو کو بھی سمجھا تو بیٹھ کے پیچھے ایک نیم مقیم کشمیری کو آسے گڑھے گیا۔

"بابا یہ بڑے خان ہیں، ہمارے مہمان ہیں، اسلام کو بچائیں گے، ہمیں، تمہیں بچائیں گے۔" کمہار نے محسوس کیا کہ کشمیری کے گلے میں ایک چھلنی ہے جو اس کی آواز پتلی موٹی دھاریوں میں نکل رہی ہے۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کی گھاس اچھلنے لگی تھی، گھاس جو گلے کے چھیدوں کو بھی بھر دے۔ وہ پہاڑ کی طرف بھی دیکھنے لگا تھا لیکن —— "بابا جلدی کرو۔" اور اس کی ہڈیوں پر لوہا کس گیا۔ کشمیری نے لفظ ہندو کا ترجمہ کیا "بٹ؟" "بٹ خاندانوں کے ساتھ اُن کا کیا رشتہ تھا۔" "وہاں ایک گھر ہے میرے ججمانوں کا وہ دیکھو۔ لیکن۔ لیکن ......" پہلی لیکن سے پہلے ہی وہ آزاد ہو چکا تھا اور وہ آہنی بھیڑ اس کے سامنے سے ایسے اتری جیسے آندھی کا ایک تھپیڑا۔ پنجوں سے آزاد ہو کر اس کی ہڈیاں دُکھ رہی تھیں۔ وہ جھونکے بھی چل رہے تھے۔ لیکن سمجھ کی ایک بات بھی اس کے کانوں میں نہ پڑی۔

یکایک ایک ایسا کہرام مچا کہ کمہار کے گھٹنے ہل گئے۔ اس نے دیکھا کہ پہاڑ بھی اس کے ساتھ ہل رہا ہے۔ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ پہاڑ سمیت گاؤں کو جھنجوڑا جا رہا ہے۔ جھکتی روشنی کے جھونٹے کھسوٹے جا رہے ہیں —— "کھولو، مارو، لے جاؤ۔ کھولو، مارو، لے جاؤ ——" کیسے؟ کیسے؟ کمہار کی دھڑکن اُسے پوچھ رہی تھی۔ اُسے چکر آنے لگے اور وہ مبہوت کھڑا اس کشمیری کے رونے کو بھی نہ سمجھ سکا۔

"بابا تم اب بھی نہیں سمجھے۔ لو سنو گولیاں چلنے لگیں، چیخیں اُٹھنے لگیں۔ بچے چیرے اور پھاڑے جانے لگے۔ عورتیں ......"

کمہار کے دماغ میں چاک گھومنے لگا۔ اس نے چیخ کے رسول کو آواز دی۔ جب رسول لاٹھی لئے ججمان کے آنگن میں لپکا، ایک گولی اور چھُٹی اور کمہار کا بیٹا رسول ڈھیر ہو گیا چکر کھاتا ہوا کمہار بھی وہیں پر آ گیا تھا۔ اس کا چاک پھوٹ گیا تھا اور اس کے دماغ میں اب تو اس کا آوا گھوم رہا تھا۔ آوے میں سے اب تو سر اُچھل رہے تھے۔ گھڑے ٹوٹ رہے تھے۔ ہانڈیاں سکڑ رہی تھیں۔ حقے بول رہے تھے۔ سکورے چیخ رہے تھے۔ ٹھائیں، ٹھائیں، ٹھائیں۔ آوے میں سے شعلے چھٹنے

لگے، دھواں اٹھنے لگا۔ مٹی تک جلنے لگی اور بوڑھا کمہار گر پڑا۔

دوسری صبح راحتی کا رونا تھا کہ کتے کا بھونکنا، اس نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا بے حیا روشنی پھیل چکی تھی، کھسیانا سورج بادلوں سے جھینپ جھینپ کر نکلتا اور چھپتا تھا "گراہٹ" پہ کتا بھونک رہا تھا اور پاس راحتی رو رہی تھی۔ وہ ہلنے لگا لیکن اس کی ریڑھ کی ہڈی نہ ملی۔ اس نے سر اٹھایا اور دیکھا کہ راحتی کی گود میں خلیل بلک رہا ہے۔ اس کے گھٹنے پر رسول کا سر ہے۔ اس کا چہرہ اپنی داڑھی سے بھی سفید ہے ــــ جبڑا ایک طرف کو گر گیا ہے۔ اس کے دانت ایک مرے ہوئے کتے کی طرح باہر نکلے ہیں اور راحتی نے اُسے ڈھکا بھی نہیں۔ خود راحتی بھی نیم عریاں بیٹھی تھی اور حیرت میں، درد میں یا غصہ میں وہ راحتی پر ایک آواز کسنے ہی لگا تھا کہ اُس نے راحتی کے پیچھے دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہوئے دیکھے اور بادلوں کے نیچے اپنی جھونپڑی کا سیاہ خاکہ دیکھا۔ کمرہ، گودام، کوٹھار نئے پرانے حصے سب کے سب کوئلہ ہو چکے تھے۔ گائیں، بچھڑے، اناج، مٹکے دھوئیں میں تحلیل ہو چکے تھے۔ یہ دھواں اب انہی سے اُٹھ رہا تھا۔ اس کی آواز اندر اندر ہی جیسے راکھ ہو کے بیٹھ گئی۔ آواز کی جگہ بس ایک دھواں سا نکلنے لگا۔ اور راحتی یہ دیکھ کر کہ میاں ہلنے لگا ہے زور زور سے رونے لگی۔ شاید اس لیے کہ رونا سننے والا اجی گیا۔ کمہار نے سر نیچے رکھ لیا اور راحتی کا مرثیہ اس کی کھوکھلی ریڑھ کی ہڈی میں گھستا گیا۔

راحتی واردات کو گنتی گئی اور روتی گئی اور جب کمہار ایک ایک بات پر چھپٹا نہیں خاموش پڑا رہا۔ راحتی نے چیخوں سے اس کے کان پھاڑ دیئے اور خلیل نے بھی اس کا پورا ساتھ دیا۔ وہ تب بھی نہ ہلا۔ جب راحتی نے کہا کہ اس کے دوست کبیر، رحیم اور غفور کی لاشیں اخروٹ کے نیچے پڑی ہیں اور باقی بیویاں لے کر جنگل میں بھاگ گئے ہیں اور یہ کہ گاؤں میں رسول کو مٹی دینے والا کوئی نہیں۔ اس نے پھر بھی جنبش نہ کی تو راحتی اور خلیل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جذبے کے ایک انوکھے اتفاق میں دونوں اُچھل کر کمہار کے پاس آ گئے اور راحتی دیوانہ وار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، اور انگلیاں کھول کھول کر چیخنے لگی "میاں تم تو ابھی جی رہے تھے۔ ابھی

ابھی میں نے دیکھا تم نے سر اٹھایا تھا تم نے......" کمہار نے آنکھیں کھولیں اور راحتی جسکا سینہ اب خالی ہو گیا تھا۔ جس نے اپنی چیخوں میں سے آخری لفظ بھی نچوڑ ڈالا تھا۔ اس نے کمہار کی دکھتی آنکھ کا فایدہ اٹھایا' بدن سے چیتھڑے ہٹائے اور کمہار کی خاموش گہرائیوں سے لہریں اچھالیں' کمہار نے ہاتھ مارے پاؤں مارے اور ایک جواب کی تلاش میں اسی پہاڑ کی طرف سر اٹھایا۔ پہاڑ وہیں کھڑا تھا۔ لیکن پہاڑ کے ہر پتھر پر ایک بڑا بڑا' مَیلا مَیلا' ان دیکھا گدھا انتظار کر رہا تھا:

.ـ.ـ.ـ.ـ.ـ.ـ.ـ.ـ.ـ.

فائدہ بے فائدہ

نرسنگ ہوم کے اس خوبصورت کمرے میں میری دو نوں راتیں بنا نیند کے کٹی تھیں۔
دن کا کھانا کھا کر اور تکیہ ٹھیک کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ "اب ضرور سوؤں گا۔ مرض تو کوئی ایسا ہے نہیں کہ دن میں بھی نیند ہی نہ آئے"۔ صرف نئے ماحول کی بات تھی جسے مجھے اپنانا تھا۔
ماحول تو خیر بہت ہی خوشگوار تھا اور ایسا لگتا تھا۔ کہ میری اپنی گہرائیوں میں پہلے سے ہی اسی طرح کا ایک خاکہ دبا پڑا تھا۔ جس کی ادھ مٹی لکیروں پر تب تب نئی پنسل سی پھر جاتی۔ جب گھر کا ماحول میری نیند کو توڑ دیتا۔
کمرے کے دونوں طرف دور دور تک ہریالی تھی۔ ایسی کہ میری نظر کو پاس ہی سے سہلانے لگتی۔ جالی، پردے، شیشے ایسے لگے تھے کہ جی جتنا چاہے اتنی ہی روشنی اندر آئے۔ پھولوں پتوں کا جو حصہ پسند آئے وہی دکھائی دے۔ اس وقت چاروں طرف خاموشی تھی، اتنی کہ برآمدے میں اگر کوئی چلتا بھی تو چھریوں میں سے اس کا سایہ اندر آجاتا لیکن اس کی چاپ نہ سنائی دیتی۔ نیند

کو ٹھپسلانے والی خاموشی میں اس طرح کے سارے بڑے فایدہ مند ہوتے ہیں۔ ورنہ سونے کی کوشش کرنے والا یہ سوچنے لگتا ہے کہ دنیا اس کو اکیلا چھوڑ رہی ہے کہ سو کے کھو جائے گا اور کسی کو دھیان تک نہیں رہے گا کہ ایک مریض یہاں سو رہا تھا۔

لیکن ماحول کے لئے ایک پیار سا اُبھارتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا اور نہ جانے مجھے گھر کے کمرے کا روشن دان کیوں یاد آیا۔ جس کے شیشے کے میل پر اپنے آپ نقشے بن گئے تھے۔ دن میں جب کبھی مجھے سونے کا وقت ملتا میری نظر جا کے وہیں رُکتی اور نہ جانے کون سی لوریاں تھیں۔ میل کے ان دھبوں میں کہ میں انہی کو دیکھتا دیکھتا سو جاتا۔ یہاں نرسنگ ہوم کے کمرے میں پرانی کمبل تک صاف تھی اور سوتے وقت مجھے اسی صفائی پر شک ہونے لگتا۔ وارڈروب، ڈریسنگ ٹیبل، پوری لمبائی کا آیئنہ سبھی اپنی اپنی جگہ سجے ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہی بات کھٹکتی تھی۔ اور یہ عجیب خیال آنے لگتا کہ ان چیزوں کو معمولی استعمال کے علاوہ کسی اور فایدے کے لئے یہاں رکھا گیا ہوگا۔ اور شک بھری آنکھوں میں نیند آتی تو کیسے آتی۔ ؟ لیکا یک میری دونوں ٹانگوں سے جان سی نکلنے لگی اور میرے پیر ادواین کے پیچوں کو ایسے ڈھونڈنے لگے جیسے لاٹھی کھائے سانپ اپنے بلوں کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ لیکن یہاں لوہے کا پلنگ تھا۔ اس پہ وہ اپنی ادواین کہاں تھی۔ جس میں پھنس کر میرے پاؤں اپنی دُکھتی رگوں کو کس دیتے! رگوں کے درد میں میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ نیند کا ماحول کوشش سے نہیں بنتا ہے۔ اپنے آپ آجاتی ہے۔ بلاؤ تو الٹا بھاگ جاتی ہے۔ سوچا کہ پڑے رہو، آجائے گی آنا ہوگا تو۔

اتنے میں باہر کے درخت جھومنے لگے اور ہوا جالی کے تاروں سے بھی ایک گھنگھناہٹ نکالنے لگی۔ پردے پھولنے اور مجھ تک اُسی مقدار کے جھونکے آنے لگے جو میرے سر کو اچھے لگتے تھے۔ پیڑوں کی سرسراہٹ، فاختہ کی کوکو اور جالی کی گنگناہٹ گھلنے لگی اور میں ......

اچانک مجھے ایسا لگا کہ میری سانس رک گئی ہے اور ــــ ہاں ــــ میں مر گیا ہوں۔ شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کیونکہ میرے کان رونے کی آوازیں صاف سن رہے تھے۔ یہ

خیال کہ موت اٹل ہے۔ دماغ سے اُٹھ کر جیسے دل میں آکر رُک گیا۔ دل بھر گیا اور میں بھی رونے لگا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میرا رونا کوئی بھی نہیں سُن سکتا تھا۔ اس لئے میں نے رونے کو بے فایدہ سمجھا اور یہ جو سننے سمجھنے کی قوت باقی تھی اسی کا فایدہ اٹھانا چاہا۔ سوچا کہ دیکھوں کہ میرے مرنے پر کون کون رو رہا ہے۔ زیادہ دُکھ کسے ہوا ہے اور دیکھوں تو کس کس کو میں پیارا تھا۔

بچوں کا رونا کبھی اونچا ہو جاتا، کبھی بالکل مدہم ہو جاتا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے بات کو پوری طرح نہیں سمجھا تھا۔ وہ بڑوں ہی کے پیچھے ایسے چلتے تھے جیسے پہاڑے دہراتے استاد کے پیچھے۔ مجھے ان پر رحم آیا کہ بے چارے پوری طرح نہیں جانتے کہ ان کو میرے کتنے فایدے ہیں۔ ایک اور آدمی مُنہ پھٹے ڈھول کی طرح رو رہا تھا اور زیادہ تر یہی آدمی بچوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ یہ کون تھا، میں سمجھ نہ سکا۔ وہاں میری بیوی بھی رو رہی تھی۔ لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے سننے والوں کا ڈر ہے۔ کہ کہیں اس کی آواز عجیب سرُوں میں نہ نکلے کہ اُسے سماج میں جینا ہے۔ کہ اوروں کے لئے کہیں وہ ناٹک کا سین نہ بن جائے لیکن بڑھیا ماں کا رونا ایسا تھا جیسے اسی کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ اور اس نے اس قسم کا شور مچا رکھا کہ جینے کی ذرا سی بھی امید ہوتی مجھے بھی شرم آتی۔ وہ ڈاکٹروں، نرسوں اور بھگوان کو بُری طرح جھنجھوڑ رہی تھی۔ اور پھر کچھ ایسی بھی آواز آنے لگی کہ لوگ بڑھیا کو گھسیٹے لئے جا رہے ہیں......

ماں نے دیواروں کو پھاڑ کر مجھے پکارا۔ اور میں ایک جھٹکے میں اُٹھ بیٹھا، بیٹھتے ہی میں نے دل کے آس پاس ایک شدید درد محسوس کیا۔ اور ایسا لگا کہ دل پھول کر نیچے سرک گیا ہے۔ اور کٹ رہا ہے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو تھاما اور پلنگ سے کوُد کر اُترا میری ٹانگیں دیوار کی طرف ایک جست لگانے کے لئے نرم پڑیں۔ لیکن لمبے کھڑے آئینے نے مجھے روکا۔ میں ٹھٹک گیا۔ اور پہلی بات جو میرے دماغ میں آئی وہ یہ تھی کہ میری والدہ پچیس برس پہلے اس دنیا کو چھوڑ گئی تھیں۔ لیکن کمرے کے باہر بڑھیا رو رہی تھی اور بچے بھی رو رہے تھے۔ کس کو رو رہے تھے؟ یہ کون لوگ تھے؟ زندگی کی نئی سانسیں لیتا ہوا میں دھیرے دھیرے دروازے تک آیا۔

ساتھ والے کمرے کے باہر کئی آدمی کھڑے تھے۔ بڑھیا میرے دروازے کے ساتھ سر ٹیکتی رو رہی تھی، سامنے ہریالی پر دو تین اور عورتیں آنسو پونچھ رہی تھیں۔ انہیں کے پاس تین بچے بھی رو رہے تھے۔ اور بچوں کے سامنے بالکل اُستاد ہی کی طرح تیس بتیس سال کا ایک نوجوان پھٹے ڈھول کی سی آواز نکال رہا تھا۔ جب بچے عورتوں کی طرح آنسو پونچھنے لگتے تھے۔ وہ آدمی رومال ہٹا کر انہیں اپنی لال آنکھیں دکھاتا تھا اور اس طرح سر ہلا کر ایک آواز نکال رہا تھا جس طرح ایک کیرتن کرنے والا اپنا بول کہہ کے بھگتوں کو اشارے سے کہتا ہو کہ "بولو بھائی" مجھے اس آدمی کی صورت ہی بھونڈی نہیں لگی بلکہ اُس کا یہ رونا رُلانا بھی بہت برا لگا۔

اتنے میں وہ بچوں کو چھوڑ کر بڑھیا کے پاس آکر رونے لگا۔ "ہائے ماں جی اب کیا کریں گے"۔ ماں جی نے جواب میں آسمان سر پر اٹھا یا اور دو تین بابو آگے لپکے اور بھونڈے جوان کو ایک طرف لے لئے۔ ہٹانے والوں کو بھوؤں اور ناک کو دیکھ کر اب یہ مجھے بُرا لگنے لگا کہ یہ لوگ رشتہ داروں کے جذبات میں یونہی دخل دے رہے ہیں، کہ اُس آدمی کا باپ ہے کہ بھائی اندر مرا پڑا ہے، چپ کیسے رہے گا؟ اور اگر اُسے چُپ بھی کرانا ہے۔ چپ کرانے والوں کی ناک اور بھوؤں پر جھڑک کیوں ہے؟ پھر ایک اور آدمی اُدھر کونے میں اپنے ہاتھ کی اوٹ میں ہنس کیوں رہا ہے؟ دو اور آدمیوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں کے اشارے کیوں کئے؟ پھر دونوں ایک دوسرے کی بانہیں پکڑ کر پھاٹک کے باہر کیوں چلے گئے؟ بھونڈا آدمی اُدھر ہریالی پر عورتوں سے رو رو کر کچھ کہہ رہا تھا۔ اور عورتیں آنکھوں میں رومال کے کونے ٹھونسے جا رہی تھیں۔ مجھے یہ تعجب ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی یہ کمرہ خالی تھا۔ نہ جانے کب یہ مریض یہاں آگیا۔ اور آکے مر بھی گیا۔

برآمدے میں جو بھی کھڑا تھا، بابو دکھائی دیتا تھا اور ظاہر تھا کہ یہ لوگ دفتر سے ہی آگئے ہیں۔ تازہ دُھلی ہوئی پتلونوں کے ابھی گھٹنے بھی نہیں نکلے تھے۔ باقاعدہ ایک قطار میں کھڑے تھے۔ جیسے سب کو اپنے اپنے درجے کی یہاں فکر بھی لگی ہو۔ اتنے میں ایک اور آدمی پھاٹک

کی طرف رعب دار قدم اُٹھاتا ہوا آیا۔ اس کا ایک ہاتھ ریشمی پتلون کی جیب میں تھا۔ اور چال میں تیزی ہوتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے صاف پتہ لگتا تھا کہ اُس کے دل میں پریشانی نہیں ہے وہ آیا۔ قطار بھر نے درجہ بدرجہ کسی نے کم جھک کے، کسی نے زیادہ، غرض سب آداب بجا لائے۔ اس آدمی نے کسی کی طرف آنکھیں اُٹھائے بغیر سر کی یکساں اور چھوٹی سی حرکت سے سب کو جواب دیا۔ اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ یہ بات تو صاف ہو گئی کہ جو آیا دفتر کا افسر ہے۔ لیکن چونکہ عمر میں چھوٹا لگتا تھا اور چال سے بھی اور چونکہ اس کے منہ پر سنجیدگی نہیں تھی۔ بلکہ سنجیدگی کے لئے ایک کوشش سی تھی اور اُس کی ٹانگیں چلتے ہوئے اچھل سی رہی تھیں۔ یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ شخص دفتر میں زیادہ سے زیادہ دوسرے درجے کا افسر ہے اور یہاں اِسلئے آیا ہے کہ دفتر کے بڑے افسر کو اچانک کچھ ہو گیا ہے۔ اب مجھے یہ بھی شک ہونے لگا کہ اس شخص کی آنکھوں میں افسوس نہیں ہے۔ بلکہ ایک دبی دبی امید ہے کہ افسر کی موت اُس کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ کھڑے کھڑے میں فایدوں کے نئے چکر میں پڑنے ہی والا تھا۔ جب اُسی وقت دو نرسیں اور نرسنگ ہوم کا بڑا ڈاکٹر اندر چلا گیا۔ "یہ نرسیں اور ڈاکٹر اب کس فایدے کے؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ بڑھیا نے ڈاکٹر کو گھستے دیکھ کر اونچی آواز میں بھگوان کو پکارا۔ "بھگوان! میرے بیٹے کو بچا۔" بچا؟ میں چونک پڑا اور میرے اندر بھی ایک چھوٹی سی اُمید لپکی کہ بڑا افسر ابھی مرا نہیں ہے۔ اس چھوٹی سی امید نے ایک چھوٹے تنکے کی مانند میرے اندر ان سب سوالوں کو چھیڑا۔ جن کو میں موت کی مایوسی میں دبا رہا تھا۔ برآمدے میں سبوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ سب سمجھ چکے تھے کہ یہ اُس کمرے کا مریض ہے۔ اپنے اس امتیاز کا فایدہ اٹھا کر میں کسی کو اپنے پاس بلا کر سب باتیں پوچھ سکتا تھا۔ لیکن مریض ہو کر میں نے جراُت نہ کی۔ دھیرے دھیرے باہر ہی نکلا اور قطار کے پیچھے سے اپنی سمجھ میں جو سب سے چھوٹا بابو تھا۔ اُسے الگ لے جا کر سب باتیں پوچھ لیں، اُس نے کہا کہ فلاں افسر فلاں صوبے سے فلاں خاص کام کے لئے مرکز میں بلایا گیا تھا۔ کہ فلاں ڈائریکٹر کا خاص آدمی تھا۔ کہ وہ جو عورت بینچ پر بیٹھی ہوئی

ہے اسی ڈائریکٹر کی بیوی ہے۔ کہ بڑا کام کا آدمی تھا کہ اُسے خون کے دباؤ کی بیماری تھی اور ابھی ابھی دفتر ہی میں وہ بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ افسر ابھی زندہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر جواب دے چکے ہیں تکیوں پر پیٹھ ٹکا کے میں نے دوسری طرف کی ہریالی کو دیکھا۔ وہاں سے دھوپ کی چوند کا ٹنے آئی۔ جالی میں سے اب ایسی ہوا آرہی تھی جیسے کچھ زیادہ بہک گئی ہو۔ کہ بے وقت چھیڑ رہی ہو، تنگ کر رہی ہو۔ اکتا کے میں نے گھنٹی بجائی۔ شیشے، جالی، پردے سب بند کروا دیئے اور میں گھر کے روشن دان کے نقوش پر سوچنے لگا۔

اس دن کی شام بھی مری مری سی رینگتی ہوئی آگئی۔ کمرہ بند تھا ہی۔ اس لئے نہ تو اب لمبا آئینہ ہی چمک رہا تھا۔ نہ ڈریسنگ ٹیبل ہی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی خاص کام کے لئے کھڑا ہے۔ بجلی کی روشنی کا تو مجھے کوئی فایدہ دکھائی دے ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ دل میں عجیب ڈر تھا کہ روشنی کے ساتھ یہ باہر کا رونا کمرے میں پھیل جائے گا۔ کہ یہ وارڈ روب، یہ لمبا شیشہ، یہ ڈریسنگ ٹیبل شاید اسی موقع کو تاک رہے ہیں کہ شاید روشنی پاتے ہی یہ بھی رونے لگیں گے۔

اندھیرا گھنا ہوتا گیا اور رونے کی آوازیں کم ہوتی گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچے چلے گئے ہیں۔ اور اب بھونڈا جوان کبھی کبھی بڑھیا کی تیکھی آواز کے ساتھ جیسے ایک موٹی آواز کا ساز بجا رہا تھا۔ اُس سے پہلے رونا کئی لہروں میں اندر آتا تھا۔ اور جھٹکے میں میری سوچ پر لاٹھیاں مار کے جاتا تھا۔ اسلئے کوئی خیال جمنے نہیں پاتا۔ خیالوں کے ٹکڑے سے بکھر جاتے۔ اور کوئی سلسلہ نہ بن پاتا۔ لیکن اب تو بڑھیا کے سروں میں ترتیب سی آگئی تھی۔ اور وہ جوان بھی مناسب قسم کا ساتھ دے رہا تھا۔ اب تو وہ الگ لہریں تھیں نہیں۔ وہ ایک سریلی آواز میرے لئے جیسے ایک ہموار ساتختہ بن گئی۔ جس پر بیٹھ کر میں کھلتی ہوئی گلیوں میں بہنے لگا۔ ایسی گلیوں میں جن کا کوئی آخر نہیں۔ جو مُڑ مُڑ کے پھر سے شروع ہو جاتی تھیں۔

کئی بار میں نے ان گلیوں سے نکلنے کی بے فایدہ کوشش کی۔ لیکن جب اچانک بڑھیا اور جوان کا رونا رک گیا۔ وہ سب گلیاں ایک خلا میں کھو گئیں، اور [illegible] ایسے پریشان

ہونے لگا۔ جیسے میرا تختہ کسی نے نیچے سے کھینچ نکالا ہو۔ میں نے پھر ایک بار گھنٹی بجائی اور جب نرس آ گئی مجھے یہ پریشانی ہونے لگی کہ میں اُس سے کیا کہوں۔ پھر اس ڈر کے مارے کہ وہ کہے گی کہ وہ بے مطلب بلاتا ہے۔ میں نے یہی پوچھا کہ وہ بڑھیا اور وہ روتا ہوا جوان دونوں کہاں گئے۔ نرس نے منہ کھول کر تعجب کا اداکارانہ اظہار کیا اور میری آنکھوں میں ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے میری طرف اس طرح چلی آئی جیسے اور ثبوت ڈھونڈ رہی ہو کہ میں پاگل ہو رہا ہوں۔ مجھے اس کی اداکاری بری لگی اور ایک مریض کے تمام حقوق کا احساس لے کر میں نے قدرے تن کر اُس سے کہا کہ میں ضرور جاننا چاہتا ہوں۔ "اچھا جی؟ مجھے ضدی بچہ سمجھ کر وہ سامنے کرسی پر بیٹھی اور ٹیبل لیمپ کا سوئچ (SWITCH) گھماتے ہوئے اور خوب ہنستے ہوئے بولی "صاحب عجیب آدمی ہے۔ آپ کا ہوا جوان مائی گاڈ (MY GOD) روتا ہوا جوان۔ سارا ہسپتال اسی کی بات کر رہا تھا" وہ ہنستی گئی اور مری خود اعتمادی لوٹنے لگی کہ آخر میں نے یہ سوال بے فایدہ نہیں کیا۔ کوئی بات ضرور ہے۔ بولی "آپ نے سمجھا ہوگا، مریض کا کوئی رشتہ دار ہے۔ سب نے یہی سمجھا تھا۔ مائی گاڈ (MYGOD) وہ تو مریض کا خیر خواہ بھی نہیں۔ روتا کتنا تھا! ارے وہ تو مریض کے ماتحت ایک کلرک ہے۔ وہ سب دوسرے بابو چھپ چھپ کر ہنس رہے تھے۔ عجیب تماشا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مریض افسر نے کئی بار کہا تھا کہ دفتر کو اُس بابو کا کوئی فایدہ نہیں ہے۔ ایک دم بدھو ہے لیکن صاحب آپ کو سونا چاہیئے۔ نیند کی دوائی لا دیتی ہوں۔ کھا کر سو جاؤ۔" نئی اُلجھن میں مجھے ایسا لگا کہ نرس میرے فایدے کی بات کر رہی ہے۔ اُس نے نیند کی دوا کھلا بھی دی۔ پانی بھی پلا دیا اور میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ سو جاؤ۔

نیند کی گولی کا خیال سونے کی نئی کوششوں کے ساتھ جھگڑنے لگا۔ میں بھی کروٹیں بدلنے لگا۔ لمحے لمحے میں تکیئے الٹنے لگا۔ اور کبھی چادر کو لے کر کبھی اُسے پھینک کر۔ کبھی پیر اندر، کبھی باہر۔ پڑے پڑے یہ بھی دیکھنے لگا کہ گولی کے اثر میں نیند کونسا پردہ ہٹا کے آئے گی؟ نیند تو خیر آئی نہیں، برآمدے میں پیر چلنے بھی بند ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ اب جو کوئی باہر کھڑا ہی نہیں۔ بڑھیا نہیں، بچے نہیں،

مریض کیا ہوش میں آگیا ہے ؟ نہیں، یاد آگیا۔ ڈاکٹر تو دن ہی میں جواب دے چکے تھے۔ لیکن وہ لوگ رات کو کیوں چلے گئے؟ دن ہی میں وہ باہر کیا کرنے آئے تھے۔؟ مریض کے لیے اُن کی کھڑی قطار کا کیا فایدہ تھا؟ لیکن بڑھیا تو قطار میں نہیں تھی۔ وہ کہاں گئی، گھر گئی ہوگی، گھر میں چیخ رہی ہوگی۔ کہ بے ہوش پڑی ہوگی؟ یونہی تھک کر گر سی گئی ہوگی؟ وہ چھوٹا سا افسر اپنے بیوی بچوں سے آج کیا کہہ رہا ہوگا؟ کیا ڈائریکٹر کی بیوی نے شوہر سے کہا ہوگا کہ "دیکھا بیوی کے فایدے؟ آپ ہسپتال جاتے سستے ہو جاتے۔ میں گئی، نام آپ ہی کا ہو گیا اور قیمت بھی بنی رہی"۔ ایسی ایسی فضول باتیں اپنے آپ دماغ میں اُچھلنے لگیں اور میں بات بات پر جیسے انگوٹھا دباتا گیا۔ لیکن بات بات جیسے انگوٹھے سے کبھی اِدھر کبھی اُدھر اُچھلتی گئی اور نیند کا خیال دُور سے دُور بھاگتا گیا۔ نیند کی گولی کو بھی اپنا کام کرنا تھا۔ خیالوں کے نیچے جو صاف سی سطح تھی وہی دُھند سے بھر گئی۔ خیال جو سیدھے تھے۔ سوال بن کر اُچھل رہے تھے۔ اب ٹیڑھے، میڑھے، بھولے، پھیلے اور سُستی میں اُٹھنے لگے۔ اُٹھتے اُٹھتے کہیں بگڑنے لگے، کہیں بکھرنے لگے۔ کہیں گھومتے ہوئے اوپر ہی سے نیچے کو آنے لگے۔ خیال تھے کہ خیالوں کی شکلیں تھیں لیکن بات جو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یہ تھی کہ میں سویا نہیں۔ یہاں تک کہ بیچ بیچ میں سر ہلا کر اِس دُھند کو جیسے جھاڑتا رہا۔

اسی بیچ میں دیوار پار سے ایک عورت کی چیخ نے ایک لمبے پتلے گرم سلاخ کی طرح اُسی دُھند کو چُھوا، جلایا اور میرے دماغ کو صاف کیا۔ "مریض مر گیا ہے" میں نے بستر پر بیٹھے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ باہر برآمدے میں کسی نے دوڑ لگائی۔ ایک اور دوڑا اور قدم فرش کو پیٹتے گئے اور ہسپتال بھر کی دیواریں قدم قدم کو دُہراتی گئیں۔ عورت کا رونا آہنی انگلیوں کی طرح میرے دل کو ڈھونڈنے لگا۔ لیکن میری مدد ہی کو جیسے وہ دونوں دوڑنے والے واپس آئے۔ اُن کے پیچھے اور قدم آئے۔ پھر عورت کا رونا کمرے سے نکلا آگے چلا، اُدھر مڑا، دھیما ہو گیا اور کھو گیا۔ ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نرس کے خیال سے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا، کہ دیکھنے کا کیا فایدہ؟ پھر کئی اور قدم بے ترتیبی میں مل کر چلے۔ بوجھ کے نیچے اُن کے گہرے سانس بھی سنائی

دینے لگے۔ پھر وہ قدم بھی راستے پر چلے جسے عورت کی چیخیں کھود چلی تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ قدم بھی رات کے ٹھنڈے پیٹ میں کھو گئے اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ رات کا مُنھ کھلا رہ گیا ہے۔ اور اب اس میں سانس بھر کی آواز نہیں۔

رات کا یہی مُنھ جیسے پھر گہرا ہوتا گیا اور میں کہیں ڈوبتا گیا۔ کہیں اَن گنت زینے چڑھتا گیا۔ جب ایک طویل زمانے کے بعد ایک کوّے کی کائیں کائیں نے اسی گہرائی کو بھر سا دیا اور میں نے اپنے آپ کو روشنی کے کنارے پر پایا۔ غسل خانے تک جانے کی اجازت تو تھی ہی۔ میری ٹانگیں مجھے دروازے تک لے گئیں آتی ہوئی سحر اور بجلی کی جاتی ہوئی روشنی میں میں نے روتے ہوئے بھونڈے جوان کو آسانی کے ساتھ پہچان لیا۔ مریض کے کمرے کو اُس نے بند پایا تھا اور وہ اُسی لمحے سمجھ چکا تھا کہ افسر مر گیا ہے اور اُسے لے گئے ہیں۔ اُس نے مجھے دیکھا نہیں، نہیں تو شاید وہ اپنے آپ سے یہ کہہ کر نہ جاتا کہ "کمبخت مر گیا ہے اور ہماری نیند بے فایدہ خراب ہو گئی۔
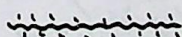
اترائی

گھاٹیوں سے اوپر ایک اونچے گاؤں کی سرحد تھی۔ جہاں سے دھرتی گھوم گھوم کر نیچے گرتی گئی تھی۔ سرحد پر ایک پتھر تھا۔ جس پر سدرشن پنڈت ٹانگیں لٹکائے صبح سے بیٹھے تھے۔ صبح کا چڑھا ہوا سورج پچھلے دیواروں کے بھی پیچھے چلا گیا تھا۔ لیکن وہ اس پتھر سے ہلے کبھی نہیں تھے۔ جیسے پتھر کا کھُردار پن اُن کو راس آگیا ہو۔

اس جانی پہچانی اترائی پر سدرشن پنڈت کے سامنے آج ایک دنیا گرتی چلی جا رہی تھی نیچے ـــ بہت نیچے ـــ جہاں سے دائیں بائیں سبزے کی آنت جیسی مٹیالی پگڈنڈیاں چکر کھاتی اُسی پتھر تک آرہی تھیں۔ سدرشن پنڈت پتھر پر بیٹھے بیٹھے صبح سے دھرتی کے اسی چکر کو گھور رہے تھے۔ ان کی نظر گھوم گھوم کر نیچے تک کھوجتی جاتی اور چکر کھاتی ہوئی لوٹ آتی تھی۔ لیکن اُس ہریالی کے پیٹ میں مٹی کی آنتیں تھیں اور کچھ بھی نہ تھا۔ مٹی کی دھاریوں میں کہیں کالا داغ تک دکھائی نہیں

دے رہا تھا۔

سدرشن پنڈت کو سورج کے ڈھلنے کا دھیان تب بھی نہ آیا۔ جب سر پر سے دھوپ چلی گئی اور ٹھنڈی ہوا پگڑی کی تہوں میں گھسنے لگی۔ انہیں ہوش آیا جب اس ہری ہری اور مٹیالی ترائی پر پھیلے دیواروں کے لمبے لمبے سایے پھیلنے لگے اور وقت کے احساس کے ساتھ ان کی گردن پیچھے کو مڑی جہاں دیودار کے قدموں میں گاؤں تھا اور گاؤں کے سامنے ملیشیا کا تمبو ـــــ وہ اچھل کر اٹھنا چاہتے تھے۔ لیکن انہیں ایسا لگا جیسے پتھر ان کے جسم کو اپنا چکا ہے اور انہیں اٹھنے نہیں دیتا...... ان کی سُن ہوئی بوٹیاں جاگ کر انہیں جیسے کاٹنے لگیں۔ ذرا سی حرکت کے ساتھ انہیں اب ایسا لگا جیسے پتھر اُن کے نیچے اب پتھر نہیں، لوہے کی نوکیں ہیں۔ اپنی بوٹیوں کو لوہے سے چھین کر انہیں کھڑا ہونا پڑا۔ لیکن پتھر سے الگ ہوتے ہی ان کا گوشت اندر اندر رینگنے لگا۔ اور ناقابلِ برداشت درد سے سدرشن پنڈت ایک بچے کی طرح رونے لگے۔

خود پنڈت سدرشن رو رہے تھے۔ جنہیں پتھر کیا آگ بھی کبھی نہ رُلا سکی تھی۔ انہوں نے راتوں لمبے لمبے جاپ کئے تھے۔ منوں لکڑی کی اگنی جلائی تھی۔ وہ لمبی لمبی بیٹھکوں سے کب گھبراتے تھے ؟ اور جل وایو۔ اگنی جیسی چیزوں میں تو وہ رہتے ہی تھے۔ وہ پتھر بھلا انہیں کیا رلاتا؟

سدرشن پنڈت اسی ایک کے نہیں دس گاؤں کے پروہت تھے۔ دس گاؤں میں نہ کوئی ان کے آشیرواد بنا جنم لے سکتا تھا۔ نہ ان کے ہاتھ لگائے بنا پرلوک جا پاتا۔ دس گاؤں میں ان کا دور دورہ تھا اور دس گاؤں کا مستقبل اُن کے پرچوں میں لکھا ہوتا تھا۔ سدرشن مہاراج پنڈت تھے، پروہت تھے، جوتشی تھے، گورو تھے ایسے جیوتشی جن کے منتر گرہوں پر لگام لگائیں۔ ایسے گورو جن کی پوجاؤں سے مہا پاپوں کا پرائشچت ہو جائے۔ جو دیوی کا انوشٹھان کر کے مہاکال پر پہرہ لگائیں اور بھیرویوں کو بس میں لاکر جل تھل اور آکاش میں قیامت مچادیں۔

پنڈت سدرشن ـــــ گورو سدرشن ـــــ نے ایک آندھی میں اپنے ماضی کو دیکھ لیا اور آنسو پونچھ لئے۔ ان کی نظر کپکپے تو پرسے اچٹ کر ان کی اپنی جھونپڑی پر جا کر جھونپڑی

یا دس گاؤں کا گوروودوار۔ جس میں خود گورو ہی نہیں، ان کے ٹھاکر بھی رہتے تھے۔ وہ پو پھٹتے ہی اپنے ہاتھوں سے اپنے ٹھاکر جی کی پوجا کرتے تھے۔ ایسی پوجا جو کیئوں کے گھروں میں سال بھر کہیں ایک بار ہو سکتی تھی۔ اور کیئوں کے تو زندگی میں ایک بار بھی نہیں! اس جھونپڑی میں پشتوں کی پاکیزگی تھی۔ دھوپ دیپوں کا آسمانی دھواں تھا۔ مٹی میں دیوتاؤں کی خوشبو تھی اور وہی سالگرام تھے جنہیں سدرشن کے پردادا نے ایک بار خواب میں دیکھ کر چشمے سے نکال لیا تھا اور پشتوں نے جن کی پوجا کی تھی ـــــ اس گھر میں وہ وہ پوتھیاں تھیں۔ جن کی جلدوں پر کم از کم چار پشت پرانے کپڑے لگے ہوئے تھے۔ اور گھر کی اگنی کبھی بجھی نہ تھی۔ ٹھاکر جی کا دیپ جانے کب سے جلتا ہی رہا تھا۔ پھوس کے نیچے تھیں تو وہی کاٹھ کی دو منزلیں۔ لیکن اس گارے کو برسوں سے لیپ لیپ کر خود پدما کے ہاتھوں نے امر کر دیا تھا۔ پدما ....! ۔ سدرشن پنڈت دیکھتے ہی دیکھتے اندھے سے ہونے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ان کی نظروں میں وہ پشتوں کی جھونپڑی پھوس کے نیچے دب گئی۔ سالگرام لڑھک گئے اور دھوپ کا نہیں جلتی ہوئی پوتھیوں کا دھواں آگے پیچھے دنیا پر چھانے لگا۔ ٹھاکر ......! سالگرام ......!! پوتھی ......!! دنیا بھر جلے تو جل جائے لیکن ۔ ؟

" لیکن بھئی حوالدار صاحب! تم نے کہا تھا پدما آئے گی۔ وہ اسے لائیں گے ..... دوپہر تک لوٹیں گے ...... کہو میرے بھائی ۔! ...... وہ سپاہی ...... وہ اتنے سارے کہاں گئے ؟

" پدما .... میرے بھائی ..... پدما! ...." سدرشن نے تمبو کی طرف لپک کر سپاہی کو جھنجھوڑا۔

" ہاں بتا کب لوٹیں گے وہ پدما کو لے کر ۔ ؟ بتا کب لوٹیں گے ۔ ؟؟"

سپاہی سے دلاسا لے کر سدرشن پنڈت نے رونے کو دبایا اور اسی اونچ نیچ کی سرحد پر ـــــ اسی اپنے پتھر پر دوبارہ آ بیٹھے۔ ہریالی کے بیچ میں مٹیالی دھاریاں اب گرتی جا رہی

تھیں اور وہ سب کی سب سائے میں آ چکی تھیں۔ پنڈت سدرشن نے مل مل کر اپنی آنکھوں کو سکھا دیا اور پھر اسی اترائی کے ہیر پھیر میں کھو جنے لگے۔

دنیا میں یہ بھی ہو سکتا تھا ۔۔۔ !یہ سب کچھ بھی !! ۔۔۔ اور پنڈت سدرشن کو خبر تک بھی نہیں رہی ۔۔؟ ہے رام !! یہ گاؤں دنیا سے اتنا الگ کیوں تھا۔؟ سدرشن پنڈت کو ذرا سا اشارہ بھی ملتا تو وہ چنڈی کے ایک پاٹھ سے ان راکشسوں کا ناش نہ کر دیتا ۔؟ یہ دشٹ یہاں تک آ گئے اور ذرا پتہ بھی نہ دیا۔ انہوں نے۔ آدھی رات کے اندھیرے میں روشنی کو اُجاڑنے، گھروں کو تباہ کرنے، اس دیوتاؤں کی گھاٹی میں ۔۔۔ !راکشس !! ہاں راکشس ! جنہوں نے بچوں کی چیخ نہ سنی۔ عورتوں کا رونا نہ مانا۔ آگ لگا دی اور.......... اور اگر انہوں نے سب کچھ لوٹنا ہی تھا....... مگر کمینے پدما کو کیوں لے گئے۔؟؟..... پنڈت جی اب پھر کھڑے ہو گئے اور ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔

" بھائی حوالدار، میں کہہ رہا ہوں، پدما ابھی جوان ہے۔ عورتوں میں سب سے چھوٹی وہی ہے۔ ارے تم تو چپ کھڑے دیکھ رہے ہو سورما۔ کہاں گئے تیرے سپاہی ؟ تم لوگ جو اُن کے جاتے ہی آ گئے تھے۔ ان کے پیچھے ہی دوڑے تھے۔ پدما کو اب تک کیوں نہیں لائے؟

پنڈت سدرشن نے سوالوں کی جھڑی لگا دی۔ لیکن حوالدار چپ تھا۔ سدرشن کی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ کھڑے کھڑے سدرشن پنڈت کی آنکھوں میں حوالدار کی ایک مورتی بن گئی۔ پھر ایک دھبہ سا رہ گیا اور دھبہ اس کے سر میں گھس گیا۔ پھر پتھر پر بیٹھ کر اُسے ایسا لگا۔ کہ یہ دھبہ اسکے ساتھ کشمیری میں بولنے لگا ہے۔ دھبے سے کشمیری میں باتیں سُن کر اس نے اپنی آنکھیں پھر کھولیں سر میں سے دھبہ کود نکلا۔ ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا چلا اور سدرشن نے جمعدار کو سامنے کشمیری میں بولتے سُنا۔

یہ حوالدار اور وہ سپاہی سب کے سب کشمیری تھے۔ کشمیری سپاہی سدرشن نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انہیں خیال آیا کہ کشمیر کی کنڈلی بدل گئی ہے۔ گرہوں کا ایک نیا یگ آیا ہے۔ جس میں

کشمیری حوالدار بھی بن سکتا ہے اور راکشس کا پیچھا کر سکتا ہے۔ تمبو سے کسی نے رمضان راتھر کو آواز دی۔ حوالدار نے مڑ کر دیکھا اور "ہاں" کی۔

رمضان راتھر! ـــــ حوالدار ـــــ !! کشمیری ـــــ !!! سدرشن پتھر سے پھر کھڑا ہوا اب رمضان راتھر دیودار سے اونچا ہو گیا اور ایسا لگتا تھا کہ جنگل کے سبھی دیودار اس کے پیچھے پیچھے اترائیوں کی طرف دوڑے جا رہے ہیں۔ ایک ایک جست میں کوسوں طے کر رہے ہیں اور ایک جنگ ہو رہی ہے۔ سنکھ بج رہے ہیں، نفیری بج رہی ہے۔ ڈھول بج رہے ہیں۔ پتھر اڑ رہے ہیں اور راکشسوں کا ناش ہو رہا ہے۔ لیکن ان اترائیوں پر کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مٹی سب کی سب مری ہوئی تھی۔ جانے یہ راکشس کتنی تیزی سے بھاگ رہے ہوں گے اور کہاں کہاں چھپ رہے ہوں گے۔ ٹوٹی ہوئی عورتوں کو۔۔۔۔۔۔۔۔

"نہیں نہیں۔ پدما کو جلدی ہی واپس آنا چاہیئے تھا"! سدرشن پنڈت نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور وہ ایک بار اور کھڑے ہو گئے۔ اُن کی جاگتی ہوئی آنکھوں میں بھیانک سپنے آ گئے اور وہ پاگلوں کی طرح ٹہلنے لگے۔

"رمضان بھائی اب بتا وہ کب آئیں گے۔؟ اب بہت دیر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت دیر ـــــ !

سپاہی اُس وقت نیچے کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اترائیوں میں کچھ ہونے لگا ہو یک لخت اُس کے چہرے پر رنگ اُبھر آیا اور اس نے منہ پھیر کر تمبو کی طرف تین آوازیں دیں۔ "ہوشیار۔ ہوشیار۔ کوئی آرہا ہے"۔ تمبو میں سے اور سپاہی رائفلیں لئے باہر نکل آئے لیکن حوالدار نے دوربین سے دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو پہچان لیا۔

"وہی ہیں" اس نے پنڈت کے بار بار پوچھنے پر کہا۔

"رمضان بھائی دیکھو تو، دیکھو تو۔۔۔۔۔۔ کوئی عورت بھی ساتھ ہے؟ اگر ہے تو وہی پدما ہے۔ ! گورو ماں!! میرے ساتھ وہ بھی تمہیں دعائیں دیتی رہے گی۔ میں تمہارے لئے ہون

کر دوں گا۔ وہ ہون کے لئے سامگری تیار کرے گی۔ نوؤں گرہوں کا پاٹھ کرتا ہوں میں تمہاری کبھی ہار نہیں ہوگی۔ ادیکھو رمضان بھائی! جاپ میں بڑی شکتی ہے۔ طاقت ہے۔ میں پیر صاحب سے نیاز کرواؤں گا۔ گاؤں بھر کو جمع کروں گا! بتاؤ! بتاؤ!! پدما بھی آرہی ہے نا؟"

حوالدار نے انہیں یقین دلایا کہ سپاہیوں کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔

"لیکن یہ تو بتاؤ وہ کیسی ہے۔؟ بھائی! ذرا دیکھو کہ وہ عورت جوان ہے نا۔؟"

حوالدار نے دُوربین سے دیکھ کر کہا۔ "پنڈت جی! یہ تو ابھی پتہ نہیں چلتا کہ عورت جوان ہے یا بوڑھی ـــــ لیکن عورت گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑا تیز چلا آرہا ہے۔

"گھوڑا" سدرشن پنڈت سوچنے لگا۔ گھوڑے پر تو کوئی بوڑھی عورت کیا بیٹھ سکے گی۔؟ جب کہ گھوڑا تیز تیز بھی چل رہا ہو۔"

سدرشن پنڈت کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپیں بجنے لگیں۔ اٹھتے ہوئے گردے سے یہ اترائی بھرنے سی لگی۔ دھندلا دھندلا ایک میدان سا کھل گیا اور ٹاپ ٹاپ کرتے دو گھوڑے سے چلنے لگے۔ جیسے اب بھی سدرشن پنڈت مدت سے گئی ہوئی جوروا کو میکے سے لا رہے تھے ـــــ دو آنکھیں انہوں نے ایسی کھولیں جیسے ساری دھول کو آنکھوں سے پی کر وہ ایک بار پیچھے ہی کی طرف دیکھنا چاہتے ہوں۔ تیز گھوڑے پر یہ تو پدما ہی آرہی تھی۔ ہاں وہی آرہی تھی۔ پدما پھر آرہی تھی ـــــ سدرشن پنڈت کا سینہ بھرنے لگا۔ انہیں ایسا لگا کہ وہ آپ بہت بے چین ہونے لگے ہیں۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا منہ موڑ کر انہوں نے اپنی جھونپڑی کی طرف دیکھا۔

"اب تو یہ پوتھیاں سب کی سب پھر لکھی جا سکیں گی۔" انہیں ان کا ایک ایک شلوک یاد تھا۔ سالگ رام کو نئی پوجا کے ساتھ پھر اپنی جگہ پر بٹھایا جا سکتا تھا۔ تانبے کے برتنوں کی جگہ سدرشن پنڈت مٹی کے کورے برتنوں سے ہی کام چلا سکتے تھے اور...... اور گوردوار کو لیپنے والی آرہی تھی۔ گوردماں...... گورو...... ! لیکن سدرشن پنڈت کا دل پھر اترائیوں میں ڈوبنے لگا۔ ان کے اندر اندھیری گپھائیں سی کھلنے لگیں۔ اگر ان دشٹوں نے ان پر کیا

وشواس ...... اگر پدما کو برشٹ کر دیا ہو۔؟

سدرشن پنڈت نے فوراً منہ موڑ کر نیچے کی طرف نظر دوڑائی۔ پر وہ ساری مٹی جو آتے ہوئے سپاہی پیچھے سے اڑا رہے تھے۔ اس میں انہیں آگے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اُن کا دل بیٹھ سا گیا۔ ان کی بے چینی دب سی گئی۔ اگر پدما بھرشٹ ہو چکی ہو تو وہ پھر گور ددوار کو کن ہاتھوں سے لیپے گی؟ وہ ٹھاکر کے لئے کیسے بھوگ بنائے گی۔؟؟ وہ کس کو آشیرواد دے گی۔؟ اور پھر گورو سدرشن! "ہاں پھر میں کہاں رہوں گا؟ میری گوردائی کیسے چلے گی؟..... کیسے چلے گی .....؟؟ منگل اور راہو نے تو کہیں یہ بھی تو نہیں کر دیا؟ —— ہے رام!!......"

سدرشن پنڈت کی ٹانگیں کھڑی نہ رہ سکیں۔ بیٹھ کر وہ اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ کہ انہوں نے ان دو گرہوں کا اُپائے کیوں نہیں کیا تھا۔؟ انہیں پتہ تو تھا کہ وہ بُرے ہیں۔ لیکن انہوں نے سمجھا تھا کہ وہ ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑیں گے! وہ خود جو جیوتشی تھے، کرم کانڈی اور جیوتشی —— انہیں دھول میں سے پھر ایک ٹٹو پر پدما سی دکھائی دی۔ اور ان کی دھڑکن پھر تیز ہونے لگی۔ ٹٹو تیز تیز قدم اٹھاتا چڑھ رہا تھا۔ پدما ٹٹو پر اکیلی تھی اور ایسے ہل رہی تھی جیسے زین پر سے اچھلنا چاہتی ہو۔ اُسے ایک سپاہی تھامتا چلا آ رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ایک ہاتھ کو لہراتے ہوئے کچھ بولتی سی آ رہی تھی۔ پدما اور سپاہی! پدما ہی تو ہے وہ! لیکن وہ اتنی باتونی کیسے ہو گئی؟" ارے جانے کیا کیا دُکھ بتانے ہوں گے اس کو! لیکن اس کا ننگا سر کتنا بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔؟ —— سدرشن پنڈت وہیں سے ایک آواز دینا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی آستین کو مُنہ میں ٹھونس دیا کہ کہیں آواز کے ساتھ رونا نہ نکلے۔ انہیں دھیرج رکھنا تھا۔ پدما کے جانے کن کن گھاؤں کو بھرنا تھا۔ جانے اُسے کیا کیا ہو گیا ہوگا۔؟...... کیا..؟... کیا.....! سدرشن پنڈت کی گھُٹی ہوئی آواز جیسے چھلنیوں میں سے نکل نکل کر اسی سے یہ پوچھنے لگی کہ پدما پر کیا کیا بیتی ہو گی! آستین کے کپڑے نے چھلنیاں بھر دیں اور سدرشن کے پیٹ میں درد ہونے لگا اور دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑنے پر بھی ایک موٹا سا "کیا" ان کی آنکھوں پر چھا گیا اور اوپر آتی ہوئی پدما نیچے ہی کو گرتی دکھائی دی۔ پدما کا بھیانک

سراور اس کے لہراتے ہوئے ہاتھ جیسے یہی خبر دے رہے تھے کہ پدما بھرشٹ ہو چکی ہے۔ بھرشٹ

.... بھرشٹ!!...... دیودار اور دور کی چوٹیوں سے یہی آواز آرہی تھی اور دیوداروں کے

سائے بہت لمبے ہو کر جیسے پدما ہی پر انگلی اٹھا رہے ہے۔ پدما!...... ہاں پدما ــــ بھرشٹ!

...... بھرشٹ!!...... لیکن گورو سدرشن نے لیکا یک گردن سیدھی کی اور مٹھیاں بھینچ لیں۔

جل، تھل، وایو، بولتی ہوئی دنیا اُس کے دانتوں کے نیچے دب گئی۔

گورو ــــ!!...... ایک بھونچال آگیا ـــ گورُو ــــ اس لفظ کے جیسے بادل گرجنے لگے اور پاس کے دیودار اور دُور کی چوٹیاں کانپنے لگیں۔ انہوں نے پتھر سے ہٹ کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کے نیچے زمین کو دیکھا۔ یہ آسمان بھی وہی تھا اور زمین بھی وہی تھی وہی جن کے وہ بھید جانتے تھے۔ اُسے ایسا لگا کہ دنیا گورو کو خود پکار رہی ہے۔ اور اتراَیاں چڑھائیاں اُسی کے فیصلے کا انتظار کر رہی ہیں۔

"کون کہتا ہے کہ وہ بھرشٹ؟" دیوداروں میں سے ہوا بھاگنے لگی۔ مٹی تیز تیز اڑنے لگی اور پدما ٹٹو پر نرمل سیتا سی آتی ہوئی دکھائی دی اور اگر...... بادل زور سے گرجنے لگے......

اگر...... اگر کچھ ہو بھی گیا ہو، اس کا کوئی اُپائے نہیں تھا کیا؟

ہوا بھاگ نکلی اور مٹی بیٹھ گئی۔ سدرشن پنڈت کے سر پر سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ جیسے یہ اُپائے کی بات ایک کھوئے ہوئے سدرشن نے خود مہا پنڈت سدرشن سے سن لی تھی۔ اُن کے خیالوں میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا اور دل کی نئی دھڑکن کے ساتھ دماغ میں نئے اپائے آنے لگے۔

وہ خود پدما کو شدھ کر سکتے تھے! ایکادشیوں کے نراہار برت رکھوا کر، ماگھ ماس کے ٹھنڈے اشنانوں سے ــــ پانچ بوٹیوں کے پرشاد سے، جپوں سے، پوجاؤں سے انوشٹھانوں سے اور دن دن کی کریاؤں سے وہ اُسے پھر پوتر بنا سکتے تھے۔ ان کے پاس ایک نہیں سینکڑوں مثالیں ایسی تھیں اور سب سے بڑا گائیتری کا مہا جاپ تھا۔

مٹی کے بادل جو بھر چھا گئے رہے۔ ایک آن میں پھٹ گئے۔ سدرشن پنڈت نے حیرت سے

ہوئے فوجیوں میں سے ایک ایک کو دیکھ لیا۔ فوجیوں کے بیچ میں پدما کا سر نیچے کو جھکا ہوا تھا۔ پدما، دس گاؤں کی گورو ماں! وہ آرہی تھی۔ ایک دنیا پھر سے بسنے لگی تھی۔!!

ٹٹو پر سے پدما کو اتارا گیا۔ پنڈت سدرشن نے دل کی آندھیوں کو تھام کر پدما کو بس نام سے پکارا۔ پدما نے ان کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ کچھ بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف ہریالی پر آبیٹھی۔ پنڈت سدرشن کی دھڑکن میں ایک نئی تیزی آگئی۔ من من بھر کا ایک پاؤں اٹھا کر وہ اُس کے سامنے آکھڑے ہوئے اور پدما نے...... پدما نے بس اپنا پیر اٹھا کر اُن سے یوں کہا جیسے وہ بھی ان سپاہیوں میں سے ایک تھے۔

"دیکھنا تو اس میں کانٹے گھُس گئے ہیں۔"

سدرشن پنڈت یہ سوچتے ہوئے کہ ظالموں نے اُسے کانٹوں پر دوڑایا ہوگا۔ کانٹے نکالنے کے لئے لپکے۔ لیکن پاؤں میں کانٹے تھے نہ کانٹے کا کوئی نشان۔

"کہاں ہیں کانٹے پدما؟"

پدما نے اپنی آنکھیں ایسے کھولیں جیسے سدرشن پنڈت کی بات پر اُسے بڑا تعجب ہو رہا ہو۔ پھر فوراً ہی اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ آنکھیں کھول کھول کر ہنسنے لگی۔ سدرشن پنڈت دھرتی میں گڑنے سے لگے اور سپاہی ان کے سامنے چُپ چاپ کھڑے دیکھتے رہے۔ سدرشن پنڈت کی ایک نظر پدما کی باہوں پر گئی جو سونے اور چاندی کی چوڑیوں سے لدی تھیں۔ انہوں نے اس کے گلے میں ایک چمپا کلی بھی دیکھی۔ چُوڑیاں...... چمپا کلی......؟ وہ ہنسی....؟ پھر کانٹے ...... اور پاؤں......!! یہ پدما کیا ہوگئی تھی؟ گورو ماں پدما!!—

"یہ زیور کس نے دیئے ہیں تمہیں؟"

پدما کے قہقہے اور بلند ہو گئے۔ ایک سپاہی نے آگے جا کر پنڈت سدرشن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ انہیں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن سدرشن ایک نئی آگ میں جھُلس رہے تھے۔ انہوں نے سپاہی کا ہاتھ جھنجھوڑ کر کندھے سے ہٹا دیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ زیور کہاں سے پائے تم نے ؟"
پدما نے ایک آن میں جیسے وہ ہنسی پی لی۔ اُس کی آنکھوں میں سنجیدگی آگئی اور اس نے اپنی گردن کو کچھ ایسے کس لیا۔ کہ سدرشن پنڈت کی دھڑکن اس تیاری میں رُک گئی کہ پدما نہ جانے اب کس کس بات کو کہہ ڈالے گی لیکن پدما اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی چوڑیوں کو سہلانے لگی اور چوڑیوں سے ہی ایسے بولنے لگی۔ جیسے وہ چوڑیاں نہیں اس کے روتے ہوئے بچے ہوں۔

"چپ رہو ری بہن! — اوری میری بہن۔ چپ رہو ری....... ارے رے رے رے رے رے — تیرا گلا گھٹ گیا...... ارے خون! خون!! پوچھ لو..... چمپا کلی! پر تو کہاں گئی۔ ؟..... مری نہیں ؟؟....... یہ لے تو میرے ہاتھ پر 'یہ' 'یہ'۔" وہ چوڑی کو سہلاتی گئی اور....... "ہی۔ ہی۔ ہی۔ ہی"۔ اس کی ہنسی بھی نئے نئے سُروں میں نکلنے لگی۔

پنڈت سدرشن نے سپاہی کی طرف آنکھیں اٹھائیں اور سپاہی نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سمجھ کانپ رہی ہے۔ اس نے آگے آکر انہیں اچھی طرح سمجھانا چاہا۔ لیکن پدما پھر اونچی آواز میں بولنے لگی۔ "تیج دیدی کے پیٹ میں سے خون نکل رہا ہے — نکل رہا ہے —" اور وہ ایک چوڑی کو ایسے دبانے لگی جیسے وہی تیج دیدی کا چرا ہوا پیٹ تھا۔

"پنڈت جی!" سپاہی نے پنڈت سدرشن کو گرنے سے تھاما۔

"آپ شکر کیوں نہیں کرتے کہ یہ واپس آگئی ہے۔ کم بختوں نے لوٹا ہوا زیور اسی کو پہنا دیا تھا۔ مشکل سے بھاگنے کا راستہ ملا انہیں! زیور تک نہ اتار سکے!"

سدرشن پنڈت کے ہونٹ کچھ بولنے کے لئے پھڑپھڑائے۔ لیکن اُن کی آواز نہ نکل سکی۔ سپاہی نے انہیں تھامتے ہوئے کہا۔

"لیکن پنڈت جی! بیوی آپ کی کمزور دل تھی۔ ! بہت کمزور......... ! بس

اتنے میں ہی پاگل ہو گئی۔"

پاگل ۔۔۔! جس کا پرائشچت نہیں ہو سکتا تھا ۔۔۔ جس کا اپائے سدرشن پنڈت کے پاس بھی نہ تھا۔!! سدرشن پنڈت کے سامنے اُسی اترائی پر وہ تمبو، وہ سپاہی، وہ دیوار، وہ گاؤں کا گاؤں لڑھکتا گرتا دکھائی دیا۔ نیچے بہت نیچے۔۔۔۔۔۔۔ اُن کھائیوں سے بھی نیچے جن میں دن کا اجالا بھی نہ جا سکتا ہ

پنج اندھیرے

وہ پوچھتے ہیں کہ شرنارتھیوں (رفیوجیوں) کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ میں انہیں اپنی رائے بتا دیتا ہوں اور وہ بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ گرما گرم بحث ہوتی رہتی ہے۔ وہ اپنی دلیلیں اور مثالیں لئے اور میں اپنی دلیلیں اور مثالیں لئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جب تک کہ اس خطرے کا احتمال ہوتا ہے۔ کہ کہیں یہ عارضی جوش ہمارے رشتے کو مستقل ضرب نہ لگا دے اور ہم دونوں بحث کی سیڑھیوں سے زینہ بہ زینہ واپس اترنے لگتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ سر ہلاتے ہلاتے، اپنی مثالوں کا کارٹون بناتے بناتے ہلکی دھن میں آکر ایک زور کے قہقہے میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ قہقہے کے بعد کم از کم مجھے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ میرا جوش بے بنیاد تھا اور یہی اپنے آپ سے بھی کہتا ہوں کہ میں سنجیدہ کب تھا۔؟

حقیقت یہ ہے کہ میں خود عجیب ہوں۔ لاکھوں شرنارتھیوں کے روبرو بھی ان کے متعلق ایک رائے قائم نہیں کر سکتا۔ مثلاً جب وہ صاحب جو سامنے گیراج میں رہتے ہیں۔ میرے برآمدے

کی طرف دیکھنے لگتے ہیں تو مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ وہ میرے چاروں کمروں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ کونوں کونوں کی خبر رکھتے ہیں اور مجھے غصّہ آجاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔

"جی آپ کے پاس جو چار کمرے ہیں ــــ" اسکی یہ بات بھی مجھے یاد آتی ہے اور دنیا میں یہی ایک بات دکھائی دیتی ہے۔ جس میں عقلیت نام کو نہیں۔ کیوں نہ ہوں چار کمرے؟۔۔۔۔۔ جیسے میں نے ان کے ابّا جان سے چھین لئے تھے اور جیسے میں ان کی جگہ گیراج میں رہوں اور انہیں اپنا گھر دیدوں۔! یہ لوگ!۔۔۔۔۔۔ اُف یہ لوگ۔ یہ شرنارتھی!!۔۔۔۔۔۔

اور تو اور جب اسکی بیوی گاگر اُٹھائے ہمارے نل کی طرف چلی آتی ہے۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ ایک آندھی چلاؤں کہ دروازے اور دریچے پھٹ سے بند ہو جائیں۔ وہ چلی آتی ہے اور میری آندھی اندر ہی اندر سُلگتی سلگتی مجھے ہی چکراتی ہے۔ مجھے اس کے خوفناک دانتوں سے واسطہ نہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے پھاٹک کے باہر ہی گنے کے لٹھ کو پھاڑ چوس کر پھینک دیتی ہے۔ نہ اس کی بہتی ناک سے جسے وہ اپنے ہی دوپٹے سے پونچھتی رہتی ہے۔ نہ اُن میل کے ڈوروں سے جو وہ قمیص سے گیراج کی نالی میں نچوڑ نچوڑ نکالتی ہے۔ مجھے تو اس کی ٹانگوں سے ڈر لگتا ہے۔ جو وہ پھلبری کے بڑے بڑے چھاپ لئے بڑھاتی آتی ہے اور جن سے شلوار کے پائنچے بھی اوپر اوپر بیچ بیچ کر کانپتے کانپتے رہتے ہیں اور وہ بڑھتی چلی آتی ہے۔ کمرے میں سے، آنگن میں، نل کے نیچے سے بالٹی کو اپنی ٹانگوں سے ہٹا کر جھر جھر اپنا گاگر بھر کے جاتی ہے۔ اور اس کا جانا زیادہ ہیبتناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہی میرا پانی جو ابھی ابھی میرے نل سے نکلا تھا۔ اسکے دوپٹے اور ٹانگوں پر سے ڈھلک کر میرے آنگن میں کمرے میں اور برآمدے میں ایک بے ڈھنگی لکیر بناتا ہے۔ مجھے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ شرنارتھی ہی نہیں ان کا ست میرے گھر میں آبسا ہے! فرش پر یہ پانی سوکھتا بھی نہیں۔ بُوند بُوند، بُھولا بھولا میرا مُنہ چڑھاتا ہے اور میں ایک نئے کشمکش وہ بیچ میں پریشان ہو جاتا ہوں۔ کہ جو تو اس پانی کو بہ تمال کے ساتھ جھاڑ دوں تو ایک زہریلا احساس اُبھر آئے گا کہ میں ضعیف الیقین ہوں۔ مقدر کے جیسے عظیم فلسفے کو لاگ کے اس بدیسی اور چھوٹے خیال کے سامنے جھکا دوں گا! آخر خاوند جیسے

قریب آدمی کو یہ بیماری کیوں نہیں لگتی ؟ اور ہاں اگر نہ جھاڑوں تو دن بھر کا رنگِ مزاج اڑا اڑا رہے گا۔ منہ کا ذائقہ اور دانت، دوپٹے اور ٹانگوں کی یاد ـــــ ظاہر ہے کہ ایک ایسے دن میری رائیں کیسی ہوں گی ؛ لیکن جب میرے منہ کی کڑواہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ اور میں اپنے پچھلے دانتوں کو ایک دوسرے پر دبانے لگتا ہوں اور ڈٹال کو ہاتھ میں لئے آمادہ ہو جاتا ہوں۔ اسی وقت گراج والے کی ہمشیرہ مٹکا لئے ہوئے چلی آتی ہے اور ماحول میں ایک تبدیلی آنے لگتی ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اول ایک ٹیڑھے میڑھے گاگر کی ہی جگہ ایک قدرتی گھڑا ہوتا ہے اور وہ جو آتی ہے، جھجک جھجک کر آتی ہے۔ یہ احساس ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ بیحد شرمندہ ہے جو اُسے ہمارے کمرے میں سے گزر کر ہمارے نل سے پانی لینا پڑتا ہے۔ اظہار تو اسی احساس کا ہے۔ ایک واجب احساس کا ـــ لیکن مجھے طرزِ اظہار اچھا لگتا ہے اور جب وہ ایک بغل میں مٹکے کو دبائے اور دوسرے ہاتھ پر اپنے اکڑے ہوئے ڈوپٹے کو بیچ دے کر ہونٹوں پر لے آتی ہے اور اس باریک ڈوپٹے کے نیچے سے ہونٹوں پر ہلکا سا تشکر بھی نظر آتا ہے۔ یعنی ایک مسکراہٹ سی ہوتی ہے۔ میرے منہ کا ذائقہ اپنے آپ بدلنے لگتا ہے۔ میں ہرگز اس کے رومانی خدوخال سے متاثر نہیں ہوتا۔ بہت دیکھی ہیں میں نے بھی۔ لیکن بات قابلِ تحسین ہے کہ وہ آتی ہے اور ان تترنار تھی بوندوں کو مٹاتی آتی ہے۔ اسکے ننگے پیر ایسے گول اور متوازن ہیں کہ بس. بوند بوند پر بیٹھ جاتے ہیں اور انہیں دباتے ہی نہیں سکھاتے بھی ہیں۔ ہاں ! ان پیروں میں گرمی بھی ہوتی ہوگی۔ کیونکہ وہ ایک خرگوش ہی کی طرح دبے دبے چلے آتے ہیں اور نہ جانے کیسے میری بیوی ان کی چاپ سنتی ہے اور باہر آکر مجھے گھورنے لگتی ہے میرے منہ پر تحیّر کے زاویے ہوتے ہی ہیں۔ میں ان میں اور گہری لکیریں ڈال کر ایسے دیکھتا ہوں کہ یہ آئی ہی کیوں یہاں۔ ؟ جی ہاں کیوں ؟

کہتے ہیں کہ دل کی ایک کیفیت دوسری کو بالکل مٹا دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ خوشگوار اور ناخوشگوار جذبے ایک دوسرے کے خونی دشمن ہوا کرتے ہیں اور صحیح بات بھی یہی ہے۔ میری اسی مثال کو لیجئے اتنے کڑوے منہ میں فوراً ہی جانے کون شکر ٹھونس دیتا ہے۔ ! میں حیران ہوں پھلبھری ـــ کم بخت

یاد اب آتی ہے۔ اس وقت ان بڑے بڑے چھاپوں کے سائے بھی نہیں ہوتے ہیں کہیں۔ تحت الشعور لاشعور میں کہیں بھی کوئی ڈھونڈے۔ اس وقت میں اور کچھ نہیں سراپا تخیل ہوتا ہوں۔ جسمیں لفظ ستر نار تھی کی مرکب آواز میں میٹھے الغوزوں کے بلاوے ہوتے ہیں۔ ڈھولکوں کی دھڑکن ہوتی ہے۔ ہیر رانجھے کے گیت ہوتے ہیں اور چلتے رہٹ کی ہیں ہیں اور جھر جھر ــــ اس لفظ میں لہلہاتی وسعتیں ہوتی ہیں۔ ہری ہری دھند میں دور کی افقیں ہوتی ہیں۔ ندیوں سے اٹھتی ہوئی چھینٹیں ہوتی ہیں۔ تیلی لمبائیاں اور چپتیاں ہوتی ہیں ــــ کہاں وہ گراج اور گراج کی نالی' پھر اس میں چکنی میل کا بہاؤ' جو ایسے میں مجھے یاد بھی نہ آتیں۔ اگر میری بیوی وہاں نہ ہوتی۔ جو ہر وقت اشارہ کر کے میرے بے بنیاد تخیل پر وہ ساری کیچڑ تھوپ دیتی ہے۔ اور مجھ سے اس رائے کا فی البدیہہ اظہار کرواتی ہے کہ یہ لوگ ــــ اُف یہ لوگ گراجوں میں بھی رہنے کے قابل نہیں۔ یہ لوگ۔ جو ہر جگہ پر قبضہ کر بیٹھے ہیں۔ کوٹھیوں کے گراجوں پر' خوبصورت سڑکوں کے کناروں پر' شاندار بغلیوں کی قوسوں پر' پارکوں' مندروں اور کھیل کے میدانوں پر ــــ صاف ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو مکانوں میں رہنے کا سلیقہ نہیں' تجربہ نہیں ــــ!!

لیکن اُسی وقت اوپر کی منزل میں گھنگھرو بجنے لگتے ہیں اور میں ایک نئے عالم میں منتقل ہو جاتا ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ عالم بھی اسی میرے لفظ ستر نار تھی کی وسعتوں میں ہے۔ ستر نار تھی!! اس وقت۔ یہ لفظ اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ مجھے اوپر کی منزل اپنے ہی سر پر بیٹھتی نظر آتی ہے۔ میرے شانے سکڑ جاتے ہیں اور گردن جھک جاتی ہے۔ تصور جوں جوں اُوپر کی منزل میں گھومنے لگتا ہے۔ میری نظریں اپنے فرش پر بیٹھتی جاتی ہیں۔ ستر نار تھی' اتنے بڑے لوگ' جن کی فلاں شہر میں سب سے بڑی کوٹھی تھی۔ اتنی زمین تھی' اتنے بڑے کارخانے ــــ اور اب ــــ اور اب ــــ میرے اوپر والا یہ فلیٹ جسکے نیچے میرے جیسا آدمی بھی ان کے گھنگھرو سن لیتا ہے۔ ان کی لمبی لہراتی آوازیں' جن میں دیسی الفاظ انگریزی بل کھاتے ہیں۔ کتنے کی وضعدار بھوں بھوں' وائلن کی کھینچ تان۔ آسا سنگھ شام سنگھ اور آیا کی چخ چخ۔ پھر موزارٹ کی تانیں اور بے جی کا پاٹھ اور اتنے ہی اور ایسے ہی کمروں میں جیسے میرے ہیں' انہی میں یہ سب کچھ' ــــ یہ ہے لفظ ستر نار تھی کے معنی ــــ یعنی لغت میں اور کوئی

لفظ نہیں ملے گا جو اس نوع کی آوازوں کا بیک وقت امتزاج ہو اور ان میرے جیسے کمروں میں میرے حدودِ سمع میں ـــــ مجھے سوچ آتی ہے کہ اس بڑی کوٹھی میں ان آوازوں کی الگ الگ جگہ ہوگی۔ یہ اپنی اپنی جگہ نکلتی ہوں گی، اپنی اپنی تال پر اور صرف تب ہی جب یہ شرنار تھی ہو گئی ہیں، ان کا دخل ایک دوسرے میں ہو گیا ہے اور وہ ایک ساتھ نکلتی ہیں ـــــ اور حیران ہوں کہ یہ شرنار تھی سانچہ آوازوں کو گھونٹتا نہیں۔ یعنی "بھوں بھوں، توں تاں، چھن چھن، آیا...... سینگ سینگ"۔ کوئی بھی آواز ختم نہیں ہوئی۔ شرنارتھیت میں ان کا ہونا لازمی ہے۔ گو شرنارتھیت ان سب کو قریب لاتی ہے۔

"آسا سینگ، شام سینگ، آ...... یا ـــــ جی صاب، حضور"۔ اور میری ہمت دب جاتی ہے کہ میں بھی اپنے ترلوک کو آواز دوں۔ دوں تو ان آوازوں میں یہ ایک آواز کتنی بھونڈی ہوگی اور کمبخت ترلوک کو جواب دینے کا سلیقہ بھی نہیں ہے اور تو اور رہا، مجھے آپ بات کرنے کا طریقہ نہیں آتا، کہ میں اوپر والوں سے یہ کہوں کہ ان کے نصف درجن نوکر منڈیر پر بیٹھ کر ہمارے صحن اور کمروں تک کو کیوں دیکھتے رہتے ہیں۔ ؟ بیڑی کے ٹکڑوں کو کیوں پھینکتے چلے جاتے ہیں۔ جو ہماری بالٹیوں میں بھی تیرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی منڈیر سے ان کی بالٹیاں، اُن کے مٹکے، ان کی بھری بھری مراحیاں دھپ سے نیچے کیوں گر آتی ہیں اور وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ کسی وقت ہماری چٹنی بن سکتی ہے ایسے۔ لیکن آنگن میں نکل آتا ہوں۔ اوپر دیکھتا ہوں اور یہ شرنارتھیوں کے نوکر ہوتے ہیں۔ مجھے تو شرنار تھی دکھائی بھی نہیں دیتے۔ ہاں جب ان کی آوازیں آتی ہیں میں تو آوازوں میں دبا دبا رہتا ہوں۔ ان کے قدم اور ان کے قہقہے زینے پر سے اترتے سنائی بھی دیتے ہیں۔ میں اپنے کو تیار کرنے لگتا ہوں کہ ملوں اور کہوں۔ لیکن ایک آن میں کار سٹارٹ ہو جاتی ہے اور میں اسی میں شکر کرنے لگتا ہوں کہ پھاٹک کے سامنے سے یہ کار تو ہٹ گئی۔ جو ہماری ہوا کو روک رہی تھی۔ ایسے میں لفظ شرنار تھی کئی اور احساس مجھ میں پیدا کرتا ہے۔ لیکن احساس جو پیش پیش ہوتا ہے، وہ اسی تجسس کا ہوتا ہے کہ یہ لوگ ان چار کمروں میں کیسے اور کہاں رہتے ہیں۔ ؟ میری بیوی نے چار دن اُن کے آتے ہوئے پلنگوں، میزوں، کرسیوں، سٹینڈوں اور بکسوں کو گنا ـــــ ان کے نوکر ان کی آیا، انکے پلنگ، ان کی میزیں اور کرسیاں اوپر اوپر کہاں ہیں۔ ؟ گھنگھرو اور وائلین کہاں بجتے ہیں ـــــ ؟

بے جی کہاں پاٹھ کرتی ہیں !

لیکن یہ شرنارتھی کیا ہوئے جو ان کو راستے بنانے نہ آتے ہوں۔ ! مثلاً جب غسل خانہ ان کا بند رہتا ہو تو جمعدارنی بے بی کے کپڑے کہاں دھوئے گی۔ ایک مسئلہ ہے جس کو ہم اور آپ حل نہیں کر پائیں گے۔ لیکن شرنارتھیوں نے ایک منٹ میں برانڈے میں چھید کر دیا۔ جس سے پانی کی دھاریں چلتی رہتی ہیں اور ہمارا صحن بھر جاتا ہے۔ اور ایک شرنارتھی کم از کم آپ سے یہ امید تو رکھ سکتا ہے کہ اگر آپ نیچے رہتے ہوں تو آپ اس پانی کو نالی تک پہنچاتے رہیں۔ تاکہ ان کے نزدیک مچھر نہ پنپتے رہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ایسے میں شرنارتھیوں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اکثر میرا حلق خشک رہتا ہے۔ اور چونکہ اس لفظ کی آوازیں کئی ہیں۔ اسکے نقوش کئی ہیں۔ ایسی آوازیں جو قیمتی ہیں اور میں مفت میں سنتا ہوں۔ ایسے نقوش جن کے دیدار کے لئے بڑی کوٹھیوں کے باہر ایڑیاں رگڑنی پڑتیں۔ پھر یہ تحیّر، یہ افسوس کہ یا اللہ تیری زیادتی کہ یہ آسمان میری زمین پر ـــــ اور پھر ساتھ ساتھ میرے جھکتے شانے، سوکھتا گلا، صحن کا پانی، نوکروں کی نگاہیں .... دل کی کون سی کیفیت کا اظہار کروں۔ کونسی کیفیت زندہ رہتی ہے ؟ ؟

سچی بات وہی ہے کہ میں سوچ کا قایل نہیں۔ کیونکہ سوچ کسی نتیجے پر پہنچاتا ہی نہیں اور جب یونہی دل دھڑکنے لگتا ہے اور شدت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ میں سوچ کی بھول بھلیوں اور اندر اندر کی گھٹن سے نکل کر اپنے نئے یعنی شرنارتھی مارکیٹ کی رنگین گہما گہمی اور بھڑکیلی چہل پہل میں ایک ایک قدم پر تازگیاں حاصل کروں۔ بازاروں سے میں کتنا دور تھا پہلے۔ اور پھر وہ بازار بھی کیا تھے۔؟ اور اب نہ صرف یہ ہے کہ ایک دلکش نئے بازار نے اپنے آنچل میرے دروازے تک پھینکے ہیں، بلکہ پرانے اور اُداس اداس بازاروں کے بھی منہ دھو لئے ہیں۔ وہ ایک بازار کیا، رنگ و بو کا کاروان کہیئے اسے۔ جہاں زندگی کے پیر ہلکے ہو جاتے ہیں۔ دل کی کوٹھڑیوں میں روشنی ہی نہیں رنگ گھس آتے ہیں۔ آنکھیں دیکھتی جاتی ہیں، دل "ہاں" کرتا جاتا ہے "واہ" کرتا جاتا ہے اور سوچنے کی نوبت تک نہیں آتی۔ قمقموں اور چنریوں کی آنکھ مچولی ہنسی والے کے "پیا پی" ـــ ساٹن والے کی جھاجھم اور تلتی مچھلی کا دھواں عطروں اور جھنکاروں میں گھل جاتا

ہے۔ آگے بڑھتے ہوئے سینے شیشوں سے ٹکراتے ہیں اور بھیڑوں میں بندیاں جھڑ جاتی ہیں۔ قہقہے شور و غل میں نقطے ڈال دیتے ہیں اور پہلو ملتے ہیں اور کندھے ٹکراتے ہیں ــــ دکھتی رگیں دبتی ہیں اور آدمی کھڑے کھڑے سو جاتا ہے۔

بازار میں بھلا ایسا کون ہوگا جو بحث چھیڑنے کی حماقت کرے؟ وہاں سب کی وہی آنکھیں ہوتی ہیں اور وہی دل ہوتے ہیں اور گھر جا کر بھی ان آنکھوں اور دل میں بازار ہی بازار ہوتا ہے اور اگر وہاں کوئی پوچھے تو میں شعر کہنے لگوں گا ــ اور کہا بھی تھا میں نے ایک بار کہ یہ جو اس سال دہلی میں بارشیں ہوئی تھیں، بادلوں کی رومان پسندی کا قایل ہوگیا ہوں۔ وہ دہلی میں پہلے کیوں برسا کرتیں؟ اب تو ہر سال برسا کریں گی ــ شرنارتھی ــ ہاں ایک رحمت آ بسی ہے یہاں!

لیکن حال ہی کا ایک واقعہ میرے ذہن پر چھایا رہتا ہے اور بازار کی اس چہل پہل میں بھی یہ واقعہ میری زبان پر کڑوی گولی کی طرح بیٹھا رہتا ہے۔ دل "ہاں" کرتا ہے۔ واہ کرتا ہے۔ لیکن پہلے کی طرح نہیں۔ یعنی یہ "ہاں" اور "واہ" ڈر ڈر کر نکلتے ہیں ایک "ہاں" اور دوسری "واہ" میں وقفے پڑ جاتے ہیں۔ دل میں دبی دبی دھڑکن رہتی ہے اور میرے یہ حروف ندا مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے ایک ایک دھڑکن اُٹھ کر ان کا راستہ روکتی ہو۔ جیسے ٹیلے پر چڑھ چڑھ کر ان کو نکلنا پڑتا ہو۔ اور بدترین بات یہ کہ میں بازار کے بیچ بھی اپنے اندر ہی دیکھنے لگتا ہوں۔

ہوا یہ اُس دن کہ میں اس بازار سے ہٹ کر مٹیالی پگڈنڈیوں کی مٹی اڑاتا ہوا اور یونہی اپنے جوتے کی پالش پر اس مٹی کو پوتتا ہوا ادھر اس باہر کی سڑک پر آگیا۔ اس سڑک پر اکثر بھاری بھونڈی بیل گاڑیاں پہیئے مارتی چلتی ہیں۔ لمبی لمبی قطاریں جن میں اونٹ گاڑیاں بھی کوڑے کے ڈھیر جیسا سر اٹھائے آتی ہیں۔ جیسے بھک منگوں کے ایک جلوس میں ایک کالا کالا لمبا فقیر میلے بالوں کو پھیلائے دائیں بائیں دیکھتا آرہا ہو۔ میری یہ تشبیہہ دراصل اس حقیقت سے وابستہ ہے کہ اس سڑک پر طرح طرح کے بھکاری اور فقیر گھومتے ہی رہتے ہیں اور آدمی مجبوری کی حالت میں ہی اس طرف جاتا ہے اور گڑھوں اور طرح طرح کے گوبر سے پاؤں بچاتا ہوا تیز تیز قدم اٹھاتا ہے۔ تاکہ جلدی جلدی سڑک کے اس حصہ پر آجائے جہاں

بس ایک دیوار کے پیچھے ریل کا اسٹیشن شروع ہو جاتا ہے اور انجنوں کی سیٹیاں اور آتی جاتی گاڑیوں کے فراٹے آدمی کو اس پار ہوتے ہوئے بھی اُس پار کے تصورات مہیا کرتے ہیں اور وہ دھوئیں کو سونگھ کر گاڑیوں کی عظمت اور رنگینیوں میں محو ہو جاتا ہے۔

سڑک کے اسی حصہ پر جب ایک انجن دیوار کے بس پیچھے ہی غیر معمولی تیزی کے ساتھ آتا ہوا سڑک پر ایک بھونچال اٹھا رہا تھا اور اس کی دھڑکن میرے سینے میں گونج رہی تھی۔ میرا دماغ، میری آنکھیں اور میری رگ رگ اسی کی تال پر پھڑک رہی تھی اور میں کھڑا کھڑا بھاگتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ساتھ جیسے اڑ رہا تھا۔ دیوار کے اس پار ایک ایسی عجیب بات ہوئی جس نے اس دیوار کو جیسے اونچا اٹھایا اور انجنوں سیٹیوں اور سارے بھونچال کو مجھ سے چھین کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ کوئی سمجھے گا کہ وہ واقعہ انجنوں کی آواز سے بھی اونچی آواز میں پیش ہوا ہوگا۔ لیکن واقعہ خاموش تھا۔ اسمیں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ دیوار کے ساتھ ساتھ اس سڑک پر وہی بے ہنگم سی ٹاٹ اور پھٹوں کی شرنارتھی کوٹھڑیاں تھیں۔ وہی تین چار گز لمبے اور میلے ڈربے سے! اور انہی میں سے جو میرے سامنے تھا جس کے دروازہ پر ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ اُسی کے سامنے ایک اخبار والے نے اپنی سائیکل کھڑی کر دی اور ٹاٹ کھڑی کر کے ایک انگریزی روزنامہ اس طرح گرا کے چلا آیا۔ جیسے میرے برامدے میں گرایا ہو۔ میں اس اونچے طبقے کا نہ سہی جہاں آدمی اس رائے کا کٹر ہو جاتا ہے کہ بہت نچلے طبقوں میں علمیت لائی نہیں جا سکتی۔ لیکن اس بات کو کون مانتا کہ ٹاٹ کے پیچھے انگریزی اخبار کو پڑھنے والا بھی کوئی ہوگا۔ جس کے ڈربے میں اخبار اسی طرح پھینکا جا سکتا ہے جیسے ہمارے آپکے برآمدے میں۔ لیکن اخبار اندر ڈالا گیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اندر اندر اٹھا بھی لیا ہے اسے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھے یہ بات ایسی غیر فطری معلوم دی۔ جیسے واقعی وہ دیوار اچھل کے اونچی ہو گئی ہو۔ اور اس سے پیشتر کہ میں اخبار والے سے پوچھ لوں۔ وہ ان انجنوں سے بھی تیز تیز چلتا بنا۔ اسی طرح جس طرح ایک عام اخبار والا اخبار دے کے چلا جاتا ہے۔

بات ہی ایسی تھی کہ سمجھنے کے بغیر مجھ سے چلا نہ گیا۔ اور چونکہ وہ ٹاٹ کا ڈربہ تھا اور دروازہ بھی

ٹاٹ ہی کے پردے کا تھا۔ مجھے اُسے الٹنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ اور چونکہ میں تیز روشنی سے آیا تھا۔ اندر کا اندھیرا مجھے زیادہ گھُپ دکھائی دیا ــــ اور چند لمحوں تک میری آنکھیں کھوجتی رہیں۔ جب تک کہ لکیریں ابھرتی گئیں اور نقشہ واضح ہو گیا۔ اندر کے آدمی نے میری مشکل سمجھ لی ہو گی۔ کیونکہ اُس نے بھی ان چند لمحوں میں مجھ سے کچھ نہ کہا اور جب میری آنکھوں نے اس کو پوری طرح پایا۔ وہ اُسی اخبار کو ہاتھوں میں تھامے میری طرف حیرت لیکن مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

"فرمایئے ــــ" اُس نے پھر یہ بھی کہا اور میں پپے لپائے فرش، اسکی چٹائی، چٹائی پر گول کی گئی تلائی اور رضائی، پھر اینٹوں کی قطار کے بعد پتیل کے برتن اور بالٹی کے چولہے اور اس کے سامنے اس کی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ جس نے پھر گھونگھٹ نکال دیا۔

"بیٹھیئے ــ فرمایئے۔" اس نے پھر کہا اور سامنے ایک صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھ صندوق پر بیٹھنے میں کچھ وقت لیا اور پریشان ہونے لگا۔ کہ میں اس سے کیا کہوں جو اس ٹاٹ سے گھرا ہوا بھی اخبار پڑھ رہا تھا اور میرے دخلِ نامناسب پر بھی میری طرف مُسکرا رہا تھا اور مجھ سے کہہ رہا تھا کہ "فرمایئے"۔

میں نے کوشش کی .... "میں ــــ میں ...." آگے کیا کہتا ؟

وہ بولا۔ "ہاں آپ میونسپلٹی سے آئے ہیں۔ فرمایئے"

مجھے کچھ کہنے کو ملا۔ "نہیں صاحب میں میونسپلٹی سے نہیں آیا ہوں۔ میں تو ......"

"اچھا آپ پھر سے بسانے والے دفتر سے ......"

اب تو میں بول سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ارے بھیا نہیں۔ میں تو ......"

"کسی شرنارتھی رشتہ دار کا پتہ لینے آئے ہوں گے۔"

"نہ بھائی۔ میں تو ادھر سے گزر رہا تھا۔"

"ارے تو آپ کو پیاس لگی ہو گی۔" اور وہ اٹھنے لگا۔

میرے دل میں وہ سارا دُکھ بھر آیا۔ جو مجھے کبھی کبھی مظلوم طبقوں پر آتا ہے۔ وہ ساری تعریف

بھر گئی۔ جو غریبوں کی فراخدلی پر کبھی کبھی آتی ہے اور میں نے اُسے بڑی محبت سے بٹھایا اور سرپرستی کے جذبے میں اُسے کہا کہ مجھے شرنار تھیوں کی محبت وہاں کھینچ لائی تھی اور چونکہ وہ سرپرستی کا جذبہ اُبھر آیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ میں ان آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا کہ ان جھونپڑوں میں رہنے والا بھی اخبار کو پڑھ سکتا ہے۔

شرنار تھی کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا اور اپنی آنکھیں مجھ سے ہٹا کر اپنے ہی فرش کو گھورتا رہا۔ یکایک اُس نے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور مجھ سے ہی سوال کرنے لگا۔ اُلٹا مجھ سے ہی جو اس سے پوچھنے آیا تھا۔

"آپ کا نام کیا ہے۔؟ کیا کام کرتے ہیں آپ؟؟ کیا تنخواہ لیتے ہیں۔؟؟؟ کہاں رہتے ہیں۔"؟ اور پھر "آپ نے کیا کچھ پڑھا ہے لکھا ہے۔؟ کیا سوچا ہے؟ یہ نظام!........ یہ اندھیرا"۔!! اُس کے سوال جھنے ہوئے چنوں کی طرح اچھلتے آئے اور میں نے سرپرستی کے جذبے کو برقرار رکھا، ہونٹوں کی وہی مسکراہٹ پھیلائے میں نے اپنا نام، کام مکان سب بتا دیا۔ لیکن جب اس کی ریت زیادہ تپنے لگی اور چنے جیسے میرے مُنہ پر اچھلنے لگے۔ میں نے اس کی گستاخی کی سزا خاموشی سے دی لیکن اُس نے پرواہ نہ کی۔

"تو آپ کو حیرت ہوئی کہ اس دیوار کے نیچے کوڑے کی طرح جو پھینکا گیا ہے۔ اُسے اخبار پڑھنے کو کیسے ملی۔ کاش آپ حیران نہ ہوئے ہوتے۔ آپ کی بُنتر ایسی ہی ہے۔! ذہنیت ایسی ہے! طبقہ ایسا ہے! جہاں آدمی اندھیرے کو اپناتا ہے!!۔ کبھی چیز دیکھنے میں آئے بھی، ساتھ حیرت آتی ہے۔"

اب تو حد ہو گئی تھی اور میں نے اُسے روکنا چاہا۔

"بھائی تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔ تم میرے طبقے کو کیا سمجھ رہے ہو۔؟ اگر تم مزدور ہو، تو میں سرمایہ دار کہاں ہوں"؟

"۔۔۔ غلط کہاں سمجھا بھائی صاحب! میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں۔ سرمایہ دار آپ ہوتے تو آپ کو اخبار دیکھ کر حیرت نہیں ہوتی۔ سرمایہ داروں کی نظر کمزور نہیں۔ وہ ہر بات کو بخوبی جانتے ہیں۔

دکھائی تو انہیں نہیں دیتا جو بیچ اندھیرے میں ہیں۔! یہ آپ کا رنگ یہ آپ کی پالش، یہ نیک ٹائی جھوٹی ہے! ناپائیدار ہے!! ادھاری ہوئی ہے!!!! اور آپ اسے اپنا سمجھ رہے ہیں ـــــ"

میں نے صندوق پر سے اٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ خواہ مخواہ میں اپنی عزت گنوا رہا تھا اور میرے اندر رو ہی اپنی دھڑکن شروع ہونے لگی تھی۔ اٹھتے ہوئے میں نے کہہ ہی دیا۔

" بھائی۔ تم باتیں تو بہت کر رہے ہو۔ تم ہو کون؟؟"

" میں ـــ، ٹھہریئے! جایئے نہیں!! سُن کے جایئے کہ میں کون ہوں۔!!! میں غالباً آپ سے بہتر پڑھا لکھا ہوں۔ آپ سے کم بدتمیز۔! ٹھہریئے! ٹھہرو!! ہاں میں۔ پنجاب سے نکالے ہوؤں میں سے ہوں۔ وہاں ایک ہفتہ وار اخبار میں ملازمت کر رہا تھا۔ اخبار والا میری کھال اتارتا تھا۔ وہاں یہاں آ کے کھال اتارنے والا بھی نہ ملا۔ رہنے کو جگہ نہ ملی۔ یہاں آیا ہوں ہزاروں اوروں میں ایک، لیکن میں نے بیوی کے زیور بیچ ڈالے۔ ایک تانگہ لیا۔ اور اب تک تانگہ چلاتا ہوں۔ سامنے دیکھو! سڑک کے پار۔ وہ رہا میرا تانگہ اور گھوڑا۔ گھوڑے کی مالش کر کے آیا ہوں اسے گھاس کھانے کو مل گئی ہے اور مجھے اخبار پڑھنے کو"۔

میں نے باہر جاتے ہوئے گردن کو اس کی طرف یوں موڑا کہ اس کو ایک چوٹ دے کر جاؤں۔ ظاہر کروں کہ میں نے اس بدکلامی کا راز اب پایا ہے ـــــــ "ہوں ـــــ یہ بات ہے! مومنہ!! ٹانگے والا" کہتے ہوئے میں نے ٹاٹ کے پردے کو الٹ کر تیز تیز قدم اٹھائے۔ لیکن اس کا قہقہہ انجنوں کی آواز سے بھی اونچا اٹھا اور میرا تعاقب کرنے لگا میں بھاگنے لگا۔ لیکن کانوں میں قہقہہ گونجتا رہا۔ جب تک کہ اندر اندر دھیرے دھیرے سیاہی پھیلنے لگی۔ شرنار تھی۔ "ش" سے ے کر "ی" تک۔ گھنا اندھیرا۔ جس کی موٹی تہوں کے نیچے دل کی دھڑکن اپنے آپ بیٹھ گئی ـــ ٭

ــــــــــــــــ

گیت کے چار بول

گرمی کی اسی پچاسی ڈگریوں میں ہی کشمیر کے لوگ گہرے سانس لینے لگتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ وہاں کے پھیپھڑے میدانی پھیپھڑوں سے کمزور ہوتے ہیں، یا اس لئے کہ کشمیری فطرتاً رنگین ہوتے ہیں اور اپنے تخیل کو ہی حقیقت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جفاکش کسان گہرے سانس لیتے ہوئے شہریوں کی خاطر پہاڑوں سے برف بھی جمع کرتے ہیں۔ اور دو دو ڈھائی ڈھائی من کے بوجھ گھاس میں لپیٹے، پیٹھ پر اٹھائے شہر سرینگر میں لے آتے ہیں۔ شہر کی سرحدوں پر شہری برف فروش انکا انتظار کرتے ہیں اور ان تھکے ہوؤں کا کچھ تو میٹھی باتوں سے استقبال کر کے کچھ بچوں کی خیریت پوچھ کے، اور کچھ نئی ریزگاری کھنکا کے اس برف کو سستے داموں خرید لیتے ہیں۔

کیونکہ اگر وہ مہنگا پیکے مہنگا بیچنے لگیں تو کشمیر کے پیاسے اپنی پیاس کو نل کے پانی سے ہی بجھانے لگیں گے، جو تخیل میں کیا حقیقت میں برف ہی کا پانی ہوتا ہے۔ انہیں تو ان داموں کے ہوتے ہوئے بھی پہلے پیاسوں کی پیاس اور تیز کرنی پڑتی ہے اور اسی لئے وہ شہر سے باہر باہر اس برف کو اپنے شہری نکڑوں میں کاٹتے ہیں، ایک اتھلی ٹوکری میں گھاس کا بچھونا کرتے ہیں، ایک ٹکڑے کو ٹوکری میں دھر کر اپنے ہلکے ہلکے ہاتھ اس پر پھیرتے ہیں اور اوپر اسی گھاس کا ایک ہلکا سا آنچل سنوار کے ڈالتے ہیں، جیسے پہاڑوں کی ننگی کنواری بیٹی شہر کے لئے تیار ہو رہی ہو ——— !

پھر اس ٹوکری کو اپنی سفید پگڑی پر رکھ کر یہ برف جیسا برف فروش جھوم جھوم کر گلیوں کی طرف چل پڑتا ہے۔

یہ برف فروش میدانی برف فروشوں جیسا نہیں ہوتا، جو مشینی برف کی سلوں کو موٹے میلے بوروں پر سڑک کے کنارے لٹا دیتے ہیں۔ لمبی کالی کیلوں سے توڑ توڑ کر ایک بھدی، بے سری اور لو سے بھی دلخراش آواز میں گاہکوں کو بلاتے ہیں ...... برف پیو، برف پیو، پیو، پیو، پیو، پی لو ....

کشمیری کی برف تو آسمان سے آتی ہے، جس میں نہ تو شیشے کی وہ کاٹتی ہوئی چمک ہوتی ہے نہ تیزی۔ نہ اس میں وہ سختی ہوتی ہے کہ اسے لمبی لمبی کیل اور بٹے ہی توڑ دیں۔ اس برف میں تو چاند کی نرم نرم روشنی ہوتی ہے اور جب برف فروش ایک کند اور وضع دار آلے سے ایک ٹکڑے کو ڈھیرے سے الگ کرتا ہے یہ برف گاہک کے ہاتھوں میں مصری کے دانوں کی طرح گرتی ہے۔ یہ برف ترازو اور بٹے سے تلتا نہیں کیونکہ کشمیری اسے بیچتا نہیں تبرک کی طرح بانٹتا پھرتا ہے اور اس وقت جب دوپہر کی تیز دھوپ میں بھی وہ گلی میں گھستا ہے اندر دبکے ہوئے کشمیری ہلکے سانس لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کی آواز اور اس کا گیت اس کی برف سے بھی ٹھنڈا اور شفاف ہوتا ہے۔

"داہ تیخ۔ واہ تیخ، ہائے کمہ دنہ وو دلمک ——— یخو"

اے یخ تو نعمت ہے، تو خوشی ہے، دیکھ کتنی کٹھن چوٹیوں سے تجھے اتارا۔

"کنہ دور گریو یخو"

سن میری یخ۔ اب جو تو میرے پاس ہے میں تیرے لئے کیا کیا نہ کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوا دوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوا دوں گا۔

"ہائے ترلیشہ دادہ مور تھس یخو"

اے یخ تو ظالم بھی تو ہے، تم نے میری پیاس بڑھائی پھر پیاسا مارا

"ہائے اندری گلنحو یخو"

لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے!

وہ برف فروش اس گیت کے کئی اور بول گاتے ہیں، لیکن سبحان پہلے ہی بول کو گاتا چلا جاتا تھا۔ وہ جھوم جھوم کے نہیں بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا جیسے برف بیچنے نہیں خریدنے جاتا تھا۔ تھا وہ نوجوان، لیکن برف بیچنے کا اُسے پورا سلیقہ تھا۔ اب دراصل بات یہ تھی کہ برف بیچتے ہوئے اس کا دھیان گھر کی طرف ہی رہنے لگا تھا۔ وہ کم بولنے لگا تھا اور اسے یہی خواہش رہتی کہ وہ جلدی جلدی برف بیچ کے واپس چلا جائے۔ گیت کے کچھ بول اُسے منحوس بھی لگتے تھے، وہ بول اس کی زبان پر چڑھتے ہی نہیں تھے۔ کون کہتا کہ سبحان کو عزیزہ تک پہنچتے کٹھن منزلیں طے نہیں کرنی پڑی تھیں۔ لیکن وہ منزلیں تو طے ہو چکی تھیں اور اب اس کے لئے گھر پہنچنے کی دیر تھی جہاں اُسے یقین تھا کہ عزیزہ اس کے سامنے بیٹھے گی اور اسکی کہانیاں سننے کے لئے بے تاب ہوگی۔

عزیزہ تھی اور اس کا باپ تھا۔ اُن ہی کی وہ چوڑی دکان تھی جس میں سوکھی ترکاریاں، سوکھی مچھلیاں اور تازہ مکھن بکتا تھا۔ اس دکان کے بیچوں بیچ فرش سے لیکر چھت تک تختوں کی تین چار منزلیں ایک ڈھلان میں جڑی ہوئی تھیں وہاں ہی تختوں پر سودے کے ٹوکرے رکھے رہتے تھے اور ان ہی ٹوکروں کے پیچھے دکان کا وہ حصہ تھا جس میں عزیزہ اور اس کا باپ رہتے تھے۔ ایک کونے میں اُن کی خواب گاہ تھی، ایک میں چولہا تھا اور ایک میں اوندھے پڑے

ٹوکرے ہی ٹوکرے تھے۔ تختوں کی یہ ڈھلان دکان اور گھر کی آمدورفت کے لئے راستہ چھوڑ کر کھڑی کی گئی تھی اور ٹھیک اسی راستے کی سیدھ میں عزیزہ کے باپ کی چوکی تھی۔ جہاں وہ بیٹھے بیٹھے سودا بھی بیچتا تھا اور عزیزہ کو سر پیر کرتے ہوئے بھی دیکھ سکتا تھا۔

اسی دوکان کی بغل میں ایک کوٹھی تھی جسکو بھرنے کے لئے عزیزہ کے باپ کے پاس کچھ نہ تھا۔ لیکن اس نے پٹیاں توڑ جوڑ کر کوٹھی کا ایک دروازہ بنالیا تھا اور اسی کے اندر سبحان سوتا تھا اور اپنے ساگ چاول اُبالتا تھا۔ لیکن برف بیچتے ہوئے اُس کے دھیان میں وہ کوٹھی نہیں وہ ساری چوڑی دوکان ہوتی تھی۔

گیت کا وہ پہلا بول سبحان کی گہرائیوں سے تب ہی نکلتا تھا جب وہ دوکان کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ جب اس کو بھی اپنی آواز کی مٹھاس کا احساس ہوتا اور اُسے ایسا دکھائی دیتا کہ اس کا گیت دوکان میں ہی گھستا جا رہا ہے اور جیسے اُسی گیت میں میٹھے سے میٹھا سبحان کھل گیا اور آواز کے ساتھ تختے پھاڑ کر اندر بڑھا اور جیسے عزیزہ بھی رسوئی کے دھوئیں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی تختوں کو چیرتی ہوئی، ٹوکریوں کی تیلیوں میں سے نکل کر اسی کی طرف بڑھتی آئی ــــــ لیکن پھر وہ تختوں سے باہر کی آواز جیسے دھوئیں کو وہیں روک لیتی اور سبحان کے گیت کو کاٹتی جب عزیزہ کا باپ اُسے پوچھتا۔ "کیوں بے کچھ بنایا کہ نہیں ؟ " سبحان دھوئیں سے بچھڑ کر ٹوکری سر سے اتارتا، اس کے سامنے رکھ کر غصہ کو تھوک دیتا اور اس بچی کھچی برف کو ایسے پیش کرتا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھ کتنی برف بچائی ہے۔ کیونکہ عزیزہ کا باپ یہی چاہتا تھا کہ سبحان کی برف زیادہ سے زیادہ واپس آجائے تاکہ وہ اسے اپنی دوکان پر بیچ ڈالے، ایک تو سبحان پر احسان رکھنے کا موقع ملے اور اُسے آدھے پیسے بھی نہ دکھائے۔ اس لئے جب وہ پوچھتا تھا "کیوں بے کچھ بنایا کہ نہیں ؟" وہ سمجھتا تھا کہ اُس نے پوچھا "کیوں بے کچھ بچایا کہ نہیں ؟" وہ ٹوکری اس کے سامنے دھرتے ہی دوکان کے اندر لپک کے جاتا۔

چونکہ سبحان جلدباز نہیں تھا وہ اپنے ہر قدم کو پھونک پھونک کر اٹھاتا تھا۔ دکان

میں گھستا تھا تو اپنے سینے پر پتھر رکھ کر نہ تو عزیزہ سے کچھ کہتا تھا نہ آنکھ اٹھا کے اس کی طرف دیکھتا تھا۔ جا کے اس کا خالی مٹکا اٹھا لیتا۔ سرکاری نل سے پانی بھر لاتا، لیکے دیگچی کو بھی بھر دیتا اور جب خود عزیزہ بھی اس سے بات کرتی وہ جواب تک نہ دیتا۔ وہ کہتی " ذرا اس لکڑی کے دو کرنا" کلہاڑا اٹھا کر اس کے چار کر دیتا۔ وہ کہتی " ذرا لوٹکری میں اپلے بھرنا" اٹھا کے دو بھر لاتا۔ پھر وہ عزیزہ کے باپ کے بھی کام کرتا، کبھی لوٹکریاں اس کی بھی اٹھاتا، کبھی خالی کرتا اور کبھی بھرتا اور جب چولھے اور دوکان دونوں کا کام باقی نہ رہتا، وہ عزیزہ اور اس کے باپ کے درمیان، دوکان اور چولھے کی سرحد پر اپنے آپ کو گرا سا دیتا، ایک نگاہ دوکان کی طرف ایسی اٹھاتا جیسے وہ تھک کے چور ہو گیا ہو اور ایک نگاہ چولھے کی طرف ایسی اٹھاتا جیسے پتھر نے سینے کو توڑ دیا ہو۔

" دے بھئی، نکمے کو چائے تو دے" عزیزہ کا باپ بیٹی سے ایسے کہتا جیسے کہہ رہا ہو کہ " سالا لے کے ہی مرے گا چائے"۔ لیکن خود عزیزہ " شیر چائے" سے اس کا پیالہ بھرتی اور وہ اس چائے کے نمکین گھونٹ گلے میں روک روک کر اس طرح اتارتا جیسے دکھتی رگوں پر ٹکور ہو رہی ہو۔ پھر جب عزیزہ کے باپ کو سوچ آجاتی کہ نہ جانے کتنے پیالے پیتا چلا جائے گا وہ اسے کہتا ——— " ہاں بھئی سبحان، آج کیا خبر لائے؟" سبحان پیالہ زمین پر رکھتا اور عزیزہ کے باپ کو خبریں سنانے لگتا جیسے یہ کہ حبہ کدل کے پاس ایک کشتی ڈوبتے ڈوبتے بچی۔ یا یہ کہ زینہ کدل کا ایک محلہ جل گیا، یا یہ کہ کسی کا جنازہ جا رہا تھا اور کسی کی برات۔ اتنے میں کوئی گاہک آتا اور عزیزہ کا باپ مصروف ہو جاتا۔ سبحان سلسلۂ کلام کو جاری رکھ کر عزیزہ کی طرف مڑتا، باپ کی جگہ وہی سر ہلانے لگتی اور سبحان بھی مضمون کو موڑنے لگتا۔ بھاری چیزوں کی جگہ ہلکی پھلکی باتیں کرنے لگتا اور عزیزہ ہنسنے لگتی۔ اس کا باپ جو یہ چاہتا کہ سبحان کا دھیان بچی کچھی برف سے دور رہے یہ دیکھ کر خوش ہوتا کہ عزیزہ اسے کہانیوں میں ڈبوئے رکھتی ہے۔

شروع شروع میں سبحان نے ایسے قیمتی لمحوں کو ضائع کیا تھا۔ وہ اسے دن کے

ایسے واقعات سنانے لگتا جن سے اس کی بہادری، فیاضی، نیکی یا خوش اخلاقی کا دکھانا مقصود تھا۔ وہ سن لیتی تھی لیکن ہنڈیا کا ڈھکن بھی اٹھاتی رہتی، بلا ضرورت کڑچھی چلاتی رہتی اور سبحان کو ایسے دکھائی دیتا کہ اس کی سب باتیں ساگ کے پانی کے ساتھ جل گئیں۔ پھر جب سبحان نے بھانپ لیا کہ عزیزہ کشمیر سے دور ملکوں کی اور پہاڑوں کے پیچھے رہنے والوں کی باتیں دھیان سے سنتی ہے، سنتی ہی نہیں سن کر ہنسنے بھی لگتی ہے تو اسے اور دُکھ ہوا تھا، کیونکہ سبحان ان کشمیریوں میں سے تھا جن کا کلیجہ یہ دیکھ دیکھ کر کھر چنے لگتا ہے کہ ہر سال غیر کشمیری بھیڑیں کشمیر کے پھلوں پر ٹڈی دل کی طرح چھا جاتی ہیں۔ لالچیوں کے گروہ باغوں اور بازاروں میں بھنبھناتے پھرتے ہیں اور برف فروشوں کی ٹوکریں تک کو بھی نہیں چھوڑتے۔ لیکن سبحان کو اُسے ہنسانا تھا۔ ناچار شہر کے بیرونی علاقوں میں ہی برف بیچنے لگا تھا اور وہیں سے کہانیاں لے کے چلا آتا۔

سبحان کی میٹھی کہانیوں میں سے پہلی بنگالی کی تھی۔ اُس بنگالی نے اس سے پوچھا تھا۔

—— "اے اے کوشمیری، تم لوگ مورتا نئی جب ایتنا ایتنا برپ تمرا سیر پر گرتا ہے ——

عزیزہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اور سبحان اپنی فتح پر اندر ہی اندر پھول رہا تھا اسے ہنسا بھی دیا تھا، بنگالی کی نقل کرتے ہوئے اپنا فن بھی دکھا دیا تھا، فن کے لبعد عقل کی گہرائیاں بھی ظاہر کی تھیں۔ جب یہ بتایا کہ اُس نے بنگالی کو سمجھایا کہ برف کے ہلکے ہلکے حسین حسین روئیں آسمان سے زمین تک ناچتے اور اٹکھیلیاں کرتے چلے آتے ہیں اور یہ ننھے منے ذرے زمین پر بیٹھتے ہی ہوا اور سورج کو سہنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ پہلو ملاتے ہیں اور اس برف کی صورت میں گتھ جاتے ہیں جو اس نے بنگالی کے ہاتھ میں رکھ دی تھی۔

دوسری کہانی ایک نوجوان سیاح کی تھی جس نے سبحان کو بیچ سڑک میں روکا تھا اور اس کی طرف ان عجیب آنکھوں سے دیکھا تھا جیسے خود عزیزہ کی طرف کبھی کوئی چھچھورا گاہک دیکھتا تھا، یہ کہتے ہی اُس نے سیاح کی نقل میں گردن کو جھکا کر نظروں کے وہ زاویے بنائے تھے کہ عزیزہ ہنس ہی پڑی تھی۔ وہ موقع بھی خوب تھا کیونکہ عزیزہ کا باپ اس وقت اندر کی طرف

پوری بیٹھ کر کے سبحان کی برف کسی گاہک کو دے رہا تھا ــــــ نوجوان سیاح نے سبحان کو کہا تھا:-

"کشمیر کے فرشتے، دیکھ تم نے مجھ پر اثر کیا ہے، دیکھ مجھ پر اثر کیا ہے، میں اس پر پوری کتاب لکھوں گا، مجھے وہ گیت لکھوا دو، اس کے معنی لکھوا دو، میں بڑی اچھی کہانیاں لکھتا ہوں، گیت لکھتا ہوں، میں تمہاری تصویریں لوں گا، تمہاری فلم بنوا دوں گا، تجھے ہزاروں روپے دلوا دوں گا ــــــ"

سبحان نے عزیزہ سے کہا کہ اُس نے اُس ہزاروں کے آدمی کی ڈوبی ڈوبی آنکھیں دیکھی تھیں، اس کے خشک ہونٹ دیکھے تھے، اُس کے جوتوں میں بھدے بھدے ٹانکے دیکھے تھے، اُسے اس کے دماغ پر شبہ ہو گیا تھا اور آگے بڑھنے لگا تھا۔ لیکن نوجوان نے اُسے پھر روکا تھا اور کہا تھا:-

"فرشتے تمہاری کوئی محبوبہ بھی ہے؟ ضرور ہوگی۔ تم یہ گیت اُس کو بھی سناتے ہو گے؟" یہ کہتے ہی سبحان کو ڈر ہونے لگا تھا کہ جیسے عزیزہ باپ کو آواز دینے لگی تھی۔ جیسے محبوبہ والی بات کہہ کر وہ حد سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی قدم واپس اٹھاتے ہوئے یہ جھوٹ بھی کہہ دیا کہ اُسے سیاح کی ایسی باتوں پر غصہ آیا تھا اور سیاح نے اُس سے معافی مانگ لی تھی۔ پھر یہ بات تو سچی ہی بتا دی کہ سیاح نے اُسے پھر روکا، ہزاروں کی آنکھیں نرم کر دیں۔ ہونٹوں کو ڈھیلا چھوڑا اور کہا:-

"اچھے کشمیری، دیکھ میرے ہونٹ سوکھ رہے ہیں، میرے پاس
ریزگاری نہیں، تھوڑی سی برف تو دیتا جا۔"

یہ سن کر عزیزہ نے اپنا منہ پھر ڈھیلا کیا اور ذرا ہونٹوں کو بھی پھیلایا، جیسے سبحان سے کہہ رہی ہو کہ دیکھ میں ابھی ایسے ہی معصوم نکتوں کو پسند کرتی ہوں۔

پھر کئی دن بعد اُسے وہ کہانی ملی جس نے اُسے واقعی آگے دھکیلا۔ کہانی اتنی دلچسپ تھی کہ وہ وہیں سے ساری ٹوکری لیکے واپس آیا۔ ہوا یہ تھا کہ اس نے ایک ہاؤس بوٹ میں برف دی۔ بوٹ میں ایک دیسی صاحب تھا اور ایک دیسی میم۔ صاحب نے برف لی اور سبحان نے ایک اور ٹکڑا پکڑاتے ہوئے کہا: "اور یہ ہے آپ کی میم صاحبہ کیلئے" اس پر وہ میم اندر سے ایک آندھی

کی طرح چلی آئی۔ اس نے اچھل اچھل کے بوٹ اور پانی میں ایک زلزلہ اٹھایا اور سبحان کو انگریزی گالیاں دیں کہ اس نے اُسے صاحب کی میم کیوں پکارا۔ سبحان نے غلطی سمجھ لی اور فوراً میم صاحبہ سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "حضور میں آپ کا حصہ حضور کے بھائی صاحب کو دینا چاہتا تھا" لیکن یہ سنتے ہی وہ میم اور صاحب بھی دونوں بگڑ گئے، اور سبحان اس حیرت میں وہیں گڑ گیا کہ وہ دونوں جوان ہیں، ایک ہاؤس بوٹ میں رہتے ہیں، نہ وہ ایک دوسرے کے میم صاحب ہیں نہ بھائی بہن۔ وہ میم تو ٹھوس ٹھوس گالیاں دے کر اندر چلی گئی تھی لیکن صاحب چونکہ نرم دل تھا۔ اس نے سُبحان کی جہالت پر رحم کھا کر اُسے مرد عورت کا ایک نیا رشتہ سمجھایا، جو خون اور رسم کے رشتوں سے بہت اونچا تھا، یہ وہ رشتہ تھا جس میں انکے دو نام نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے ——!

اُس دن سبحان وہیں سے تمام برف لے کر واپس آگیا اور ٹوکرے کا ٹوکرہ عزیزہ کے باپ کی طرف سرکا دیا اور ایک عقدہ۔ ایک سنجیدہ فلسفہ لے کر اندر چلا گیا اُس دن اُس نے مٹکا اٹھاتے ہوئے بھی لکڑیاں پھاڑتے ہوئے بھی عزیزہ کو اس واقعے کے ٹکڑے بتا دیئے۔ رسموں رشتوں کی تنظیم پر تیز تیز باتیں کہیں، اور جب عزیزہ ہنسنے کی تیاری کرتے ہوئے پوچھتی رہی کہ ہوا کیا ہے، اُس نے نڈر ہو کر صاف شادی کی مثال دی۔ شادی؟ شادی بغیر تو انسان حیوان، بندر اور کتے تک کا اس نے نام لیا۔ پھر الٹا چل کے شادی کی نعمتوں کو انسان، فرشتہ اور خدا تک لے پہنچا۔ پھر جب عزیزہ نے باپ کو آواز دی کہ سُبحان کوئی خاص خبر لایا ہے تو اُس نے اُن دونوں کو وہ پوری کہانی سنائی —— اُس کہانی کا حاصل یہ تھا کہ ان کا آپس میں ایک نیا مذاق قائم ہوا۔ اس لفظ ساتھی میں ایک جادو تھا کہ اگر وہ دو بلیوں کو بھی ساتھ دیکھتے، اُن کو ساتھی پکارتے اور خوب ہنستے۔ سبحان اُس کہانی کا کتنا شکر گزار تھا، یہ کہانی اُسے عزیزہ کے قریب لے گئی تھی۔ اب عزیزہ کو ہنسانے کیلئے اُسے نت نئی کہانیوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ چنانچہ برف بیچتے ہوئے سبحان گیت کا دوسرا بول بھی اطمینان کے ساتھ گانے لگا کہ :-

"اے یخ اب جو تو میرے پاس ہے، میں تیرے لئے کیا کیا نہ

کروں گا، تجھے بالیاں بھی بنوادوں گا، ہاں بالیاں بھی بنوادوں گا"۔

پھر ایک اور دن اُسے وہ عام سیاح ملا جو کشمیر امیدیں لے کر چلا آتا ہے کہ جیسے اُس کے قدم جگہ جگہ کے سبزہ زاروں کو کچلتے جائیں گے، کشمیر کی حوریں اُس کے پاس جھکتی چلی آئیں گی۔ سیبوں جیسی کشمیری لوں پر وہ راہ چلتے ہاتھ مارے گا اور چشموں میں جیسے مٹھی بھر چاول پر پیاری پیاری مچھلیوں کا جھرمٹ ٹوٹ پڑے گا۔ کشمیر کی عورتیں اسکے پیسوں پر لوٹ ہو جائیں گی۔ ایک ایسا ہی نامراد سبحان کے سامنے کھڑا ہوا اور سبحان کو روپے دکھا کر کہنے لگا ——— "وہ کہتے ہیں کشمیر میں عورتیں ملتی ہیں۔ برف والے، دیکھ پیسہ۔ ہے تمہارے پاس کوئی؟" سبحان نے تو اپنی ٹوکری اُس پر مارنی چاہی تھی، لیکن چونکہ اُسے اُس دن کی کہانی مل گئی۔ وہ پانچال[۱] سے پار والوں پر چھپی چھپی کرتا ہوا سیدھا عزیزہ کے پاس پہنچا اور اُسے وہ کہانی بھی سنادی۔ کہانی سناتے ہوئے سُبحان نے اپنی آواز بھی دھیمی کی اور عزیزہ کے باپ کی طرف پوری پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں عزیزہ کو صاف کہہ رہی تھیں کہ دیکھ یہ کہانی صرف تمہارے لئے ہے۔ کسی اور کو یہ کیسے بتا سکوں گا؟ پھر اس نے نہ صرف کشمیری چلن کی تعریف کی بلکہ کشمیری خدوخال کو نقطہ بہ نقطہ بیان کیا اور سراہا۔ اور چونکہ یہ خدوخال خود عزیزہ کے تھے وہ ایک ایک نقطے کو سنتی گئی اور اُس کے رخساروں کی سرخی تیز ہوتی گئی۔ پھر یہ سُرخی دیکھ کر سبحان عزیزہ سے یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اب جو ایک جھپٹ کی بات تھی وہ خاموش کیوں تھی۔ وہ اس کی سُست قدمی سے تنگ آنے لگا تھا۔ تنگ آکر ہی وہ دکان کے سامنے گیت کا تیسرا بول بھی گانے لگا تھا کہ:۔

" اے یخ تو ظالم بھی تو ہے۔ تم نے میری پیاس بڑھائی پھر

پیاسا مارا ——— "

لیکن پھر وہ کالی رات آگئی، جب عزیزہ کا باپ دوکان بڑھا کے پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا اور سبحان اس کے شانوں پر کھڑا اسے دبا رہا تھا۔ عزیزہ کے باپ کی ہڈیاں سبحان کے بوجھ کا رس لے

[۱] پانچال، سلسلہ ہائے کوہ کا نام جو کشمیر اور پنجاب کے درمیان ہے۔

رہی تھیں اور اس کی آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ عزیزہ برتن مانجھتے ہوئے بھی سبحان کی باتیں سن رہی تھی، بات بات پر ہنس بھی رہی تھی۔ سبحان ایڑیاں دبا دبا کر رکا دلٹوں کو جیسے روندتا جا رہا تھا اور بات پر بات سنا رہا تھا۔ پھر جب اس کی باتوں کا سرمایہ ختم ہوا وہ ایک بات بھی آگے لپکتی آئی اور منہ سے جیسے اچھل پڑی جس کو وہ دل میں پیچھے دھکیلتا رہا تھا۔ لیکن عزیزہ اب تو اس کے قریب تھی، دن کی کسی بات کو، دن کے کسی واقعہ کو وہ کیسے چھپاتا؟ اور بات ہی کون سی تھی؟ — اس پنجابن نے، ایسی ویسی نے اس کی برف کو لوٹایا تھا، اس لئے کہ اس کے نوکر نے اسے کہا تھا کہ برف والے کے سر پر چاندی ہے......!

اول تو چاندی کی تشبیہ نے ہی عزیزہ کو ہنسایا۔ پھر سبحان کے سر پر چاندی کی اطلاع نئی تھی وہ اتنے زور سے ہنسی کہ اس کا باپ جاگ اٹھا اور اٹھتے ہوئے اس نے سبحان کو اپنے شانوں سے گرا دیا۔ پھر جب ہنسی روک روک کر عزیزہ نے باپ کو چاندی والی بات سنائی تو دونوں بڑی بے رحمی سے ہنسنے لگے اور جب ہنس ہنس کے عزیزہ کا برا حال ہوا تو تھکے ہوئے سر دل میں اس نے اپنے باپ سے کہا — تب ہی تو، تب ہی تو سبحان کپنٹیوں تک پگڑی اتارتا ہے۔ تب ہی تو اس نے کبھی پگڑی سر سے نہیں اتاری — "چاندی! چاندی! انکی ہنسی اب کیسے رکتی؟

وہ ہنستے گئے اور سبحان کی ٹانگوں میں طاقت نکلتی گئی، اس کا سر کھوکھلا ہونے لگا اور یہی قہقہے دماغ میں گھسنے لگے۔ قہقہوں کے ساتھ عزیزہ کے منجھے رکھے برتن بھی جیسے کھنکنے لگے۔ وہ چولھے اور دوکان کی سرحد پر ذرا بیٹھ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت نہ تو اسے وہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی نہ سینے پر پہلا جیسا پتھر، جو بیٹھ کر وہ دوکان کی طرف ایک نگاہ ایسی اٹھاتا کہ تھک کے چور ہوا ہے، اور ایک نگاہ چولھے کی طرف ایسی اٹھاتا کہ پتھر نے سینے کو توڑ دیا۔ اس وقت تو دوکان بند تھی اور چولھا بجھ گیا تھا، بلکہ دوکان اور چولھا ایک ہو گیا تھا۔ بیٹھنے کے لئے جگہ کہاں تھی؟ وہ قہقہے جیسے کسی ظالم کے ہاتھ بن گئے۔ جنہوں نے اسے دوکان سے دھکیل کر کوٹھی تک پہنچا دیا۔

کوٹھی کا دروازہ بند کر کے اُس نے پہلے قہقہوں کا راستہ روک لیا اور اپنی کوٹھی میں جلتے ہوئے سر پر سے بے خوف اپنی پگڑی اچھال دی۔ اپنے سر پر اُس نے اپنے ہاتھ پھیر لیے۔ چاندی ؟ لوگ اسے چاندی پکارتے تھے، وہی لوگ جن کے اپنے سروں پر یہ بیماری نہیں تھی۔ سر پر اُس نے انگلیاں کیا رکھیں، کئی دنوں کی دبی ہوئی کھجلی اٹھی۔ اُس نے اپنے ناخنوں کو بے لگام چھوڑا اور کھجاتے کھجاتے اسے مزہ آیا، جلن ہوئی، آگ نکلی، چاندی برسی اور چاندی کے نیچے خون بہا۔ اسی چاندی، اسی چاندی نے اسے گرا دیا تھا، اسی چاندی کو وہ کریدتا گیا، کریدتا گیا اور پھر جب ناخن رُک گئے۔ اس کا سر ایسے جلنے لگا، جیسے اُس نے کھال تک اتار دی ہو۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ چاندی کی تہیں اور موٹی ہو جائیں گی۔ چاندی کنپٹیوں سے بھی نیچے اتر آئے گی۔ اس کی جلن اتنی بڑھ گئی کہ وہ دوکان سے اپنی برف واپس مانگنا چاہتا تھا، جلن کو برف سے بجھانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ برف کہاں تھی ؟ اس برف کی جگہ تو قہقہوں کی آگ برس رہی تھی۔

اُس رات جلن کی آندھیوں میں بھی کئی بار اس کی آنکھ لگ گئی، جب اس نے کئی ڈراؤنے خواب دیکھے، مثلاً یہ کہ اس کا سر چمکتی ہوئی خالص چاندی کا ایک پہاڑ بن گیا ہے، لالچیوں کے ہجوم اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ یا یہ کہ اس نے ٹوکری میں برف کا ایک طلسمی ٹکڑا رکھا تھا، جس کو سر پر اٹھائے وہ پہنچے گیا تھا، یہ ٹکڑا راستے میں جیسے پھولنے لگا تھا اور دیکھتے دیکھتے پہاڑ بن گیا تھا۔ جس کے نیچے وہ دب گیا اور اس کا کچومر نکل گیا ـــــــ ہر ڈراؤنے خواب کے بعد وہ اچھل پڑتا اور سر پر مجروح چاندی کو دیکھ کر دل کو تھام لیتا، لیکن جاگ کر چاندی جیسے بولنے لگتی، وہ اضطراب میں کروٹیں بدلنے لگتا اور ایک کروٹ میں زبان کو کوسنے لگتا جس نے بلا ضرورت راز فاش کر دیا تھا۔ اور دوسری کروٹ میں چاندی کو جو سر پر نہ ہوتی تو زبان ہی کیوں ہلتی۔ کروٹوں کروٹوں میں وہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگتا، سر کی جلن دب جاتی اور اس کی آنکھ پھر لگ جاتی۔

اگلی صبح جب اس کی آنکھ کھلی اور اُسے رات کی بات کا دھیان آیا اُس نے ایک اور کروٹ لی۔ اب تو سر پر پپڑی بھی جم گئی تھی اور اس کا دل پھڑ پھڑا کے تھک گیا تھا اور اب ایک لمبی،

پھیلی ہوئی خاموش کیفیت میں مایوسی کو اپنا رہا تھا۔ دروازے کے شگافوں میں سورج کی کرنیں ناچتے ہوئے ذروں کو لے کے آئی تھیں ـــــ سبحان پڑا پڑا ان گنت ذروں کا رقص دیکھنے لگا اور اس رقص کے ساتھ اس کے دماغ میں ایک فلسفہ ابھرنے لگا۔ یہ سر کی چاندی اتنی بُری کیوں تھی؟ اگر یہ بیماری تھی تو یہ بیماری عام تھی۔ اسی محلے میں درجنوں کے سر ایسے ہی تھے، جن پر اتنی ہی موٹی یہی چاندی تھی۔ غریب کشمیریوں کا کون سا گھر ایسا تھا جس میں ایک بھی سر ایسا نہ ہو؟ فرنگی نے کتاب میں لکھا تھا کہ کشمیری اخروٹ بہت کھاتے ہیں۔ یہ بلا تب ہی سر پر اگتی ہے۔ لیکن سبحان نے اخروٹ کب کھائے تھے؟ یہ فرنگی، یہ باہرے، کشمیریوں کے لئے کب اخروٹ چھوڑتے تھے؟ بہر صورت یہ بیماری صرف اسی کو نہیں تھی۔ رمضان، رحمان، صدیق غلام سب کے سر ایسے ہی تھے، پھر کیا ان کی گوری گوری بیویاں نہیں تھیں؟......... لیکن، لیکن یہ کس نے کہا تھا کہ سبحان کی شادی نہیں ہوگی؟ آخر اتنا ہوا کیا تھا؟ یہی نا کہ عزیزہ اسکی چاندی پر ہنسی تھی، ضرورت سے زیادہ ہنسی تو تھی، لیکن اُسے ہنسنے کا موقعہ کب ملتا تھا؟ بے چاری دوکان کے اندر دبکی رہتی، چولھے کے دھوئیں میں ڈھکی رہتی۔ اس کے پاس تھا کیا؟ ایک خود غرض خشک سا باپ اور وہ کالے بُھنے برتن ـــــ اسی لئے تو وہ اسے کہانیاں سناتا تھا، اُسے ہنسانے کے لئے ہی تو، اسی لئے تو اس نے ارادہ کیا تھا کہ اسے دھوئیں سے نکالے گا اور برف جیسے شفاف ماحول میں رکھے گا اور.....

.....اور.......

سبحان ایک نئی طاقت کے دھکے سے کھڑا ہوا اور شہر کی سرحد کی طرف دوڑا جہاں اُسے اُس دن کی برف خریدنی تھی ـــــ لیکن سبحان سب کچھ کھو چکا تھا۔ اُس دن سے اس کی ایک بھی کہانی نہ سنی گئی۔ اس کے آتے ہی عزیزہ کا باپ چاندی کو لے کر بیٹھتا۔ اسے چاندی کے ناموں سے پکارتا، پکار کے ہنستا اور عزیزہ بھی لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ عزیزہ کے قہقہے اس وقت اور تیز ہو جاتے جب سبحان کے ہاتھ خود بخود پگڑی کی طرف جاتے، جب پگڑی کی تہیں نیچے آنے لگتیں یا جب وہ اس کی طرف تعجب میں آنکھیں کھولتا یا جب وہ سچی سی بات

کہہ دیتا کہ "عزیزہ تیری یہ ہنسی اپنی نہیں، یہ تیرے باپ کی ہنسی ہے جو تم میں گونجتی ہے۔" عزیزہ اتنا ہنستی کہ سبحان ہنسانے کی جگہ اسے رلانا چاہتا۔ حتیٰ کہ سبحان کی کہانیاں خود گم ہو گئیں۔ اس کے قدم بیرونی علاقوں سے ہٹ گئے، شہر کی گلیوں میں بھٹکنے لگا۔ مٹکا بھرلانے یا لکڑی پھاڑنے کا اشتیاق مدھم پڑتے پڑتے ختم ہوا، اور اب برف بیچتے ہوئے نہ تو اُسے گھر جلدی جانے کی فکر دامن گیر رہتی نہ اس کے منہ سے گیت کے پہلے بول نکلتے اور چونکہ برف بیچنے کے لئے کچھ گانا ضروری تھا۔ وہ گیت کے آخری اور بدشگون بول کو ہی بھرائے سروں میں گاتا جاتا:-

"لیکن یخ تو بھی تو چپکے چپکے پگھل رہی ہے۔"

دنوں کا پھیر

بڑ والے موڑ پر آتے ہی پھول دئی کے قدم رک گئے۔ اُس نے وہیں سے اس بھیڑ کو دیکھا جو دن چڑھے سے پہلے ہی دکان کے سامنے لگی ہوئی تھی۔ اس نے یہ سوچنے کی کوشش نہیں کی کہ دن کونسا ہے۔ شکر کا تھا یا مٹی کے تیل کا۔ لیکن بات ساری یہ تھی کہ دکان کے سامنے ایک بھیڑ تھی بے تاب گاہکوں کی بھیڑ جو پو پھٹتے ہی راشن کی فکر میں چلے آئے تھے۔ یہ پھول دئی کی اپنی دکان تھی، اسکے بیٹے گھنشام کی، جس کے اوپر اب اتنا بڑا بورڈ تھا، بورڈ پر گائے کی تصویر تھی اور گھی کا ٹین تھا، اور بنسی بجاتے ہوئے مُراری بھی ——— "گھنشیام سٹور" ——— اتنا بڑا نام تھا کہ بورڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔

مارے خوشی کے پھول دئی جوان سی جا رہی تھی۔ اُس نے لمبے لمبے قدم اٹھائے اور یوں گرائے جیسے اکھڑے ہوئے روڑوں کو دبانا چاہتی ہو۔ بھیڑ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور گھنشیام کو دیکھنے لگی۔ گھنشیام نے تختے اتار دیئے تھے اور دکان لگا رہا تھا۔ بھیڑ میں سے ہر شخص اُسے پکار۔

رہا تھا کوئی "لالہ" کوئی "لالہ گھنشیام" کوئی "لالہ گھنشیام داس" ہر شخص اپنا راشن پہلے لے جانا چاہتا تھا۔ شکر کی دو بوریاں کتنوں میں بٹ جاتیں ؟ اور گھنشیام ابھی ان بوریوں کو چھو بھی نہ رہا تھا۔ سُستی سے بے مطلب کی پیٹیاں اِدھر سے اُدھر کو ہٹا رہا تھا۔ شور و غل سے جیسے بے پڑا جیسے وہ خوشامدیں سُن بھی نہ رہا تھا۔

پھول دئی نے گھنشیام کی ناک بھی چڑھی ہوئی دیکھی۔ وہ اس کی حرکتوں میں سُستی دیکھ کر بھی حیران ہوئی۔ آخر اس کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کے سامنے گاہکوں کا ایک ہجوم ہے گاہکوں کا ایک بے چین ہجوم جسے پھول دئی نے اپنی عمر میں کسی دکان کے سامنے نہیں دیکھا تھا۔ شہر کے بھرے پُرے بازار میں بھی، اور وہاں اس دیہات کے قریب والے نکڑ پر اگر دکان کے سامنے لاٹھی پونگا بھی ہوتا، سر بھی پھوٹتے تو اتنے آدمی جمع نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ نہیں برکتیں جنگ کی کہ دیکھتے دیکھتے کوارٹروں کی قطاریں کھڑی ہو گئیں، اور نہ جانے کہاں سے اتنے لوگ چلے آئے جو ان کوارٹروں میں بھی نہ سمائے۔ بابو ہی بابو، بابوؤں کی بیویاں، بیویوں کے بچے، بوڑھی مائیں اور بوڑھے باپ، خاندانوں کے خاندان چلے آ رہے تھے، پرماتما کی مایا تھی کس چیز کی کمی ہے اس کی درگاہ میں؟ ——— پھول دئی کے ہاتھ خود بخود جڑ گئے اور اسی بوڑھے کے مراری کی طرف اس نے عقیدت کی نگاہیں اٹھائیں۔

لیکن یہ گھنشیام کیا کر رہا تھا؟ بوری کا منھ کھلا پڑا تھا۔ اس نے اب تک ترازو کیوں نہیں اٹھائی؟ وہ جوش میں کیوں نہیں آیا؟ اُس کے سامنے ایک متوالی بھیڑ تھی۔ کیا ہوا اگر شکر اسی کی دکان میں تھی؟ کیا ہوا اگر یہ لوگ اور کسی دکان سے نہیں لے سکتے تھے؟ بھیڑ کی رونق تب ہی تھی جب دکاندار پھٹا پھٹ سودا دیتا رہے اور اپنا گلہ بھرتا رہے۔ نہیں تو خواہ مخواہ کی بھیڑ میں پھول دئی کو ان قطاروں سے بھی منحوس دکھائی دیتی تھیں جن کو شہر والے "کیو کیو" جیسے بُرے نام سے پکارتے تھے، قطاریں جیسے مُردے کی تیرھویں کو لوگ آنگن میں کھڑے ہوں۔ اپنی بھیڑ کو دیکھ کر اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس بھیڑ میں بھینچی جائے، اتنی بھینچی جائے کہ خوشی

کے آنسو نکل آئیں ــــــ کاش گھنشیام نے وہ خواب کبھی دن دیکھے ہوتے۔ جب پھول دئی کو اِکّے دُکّے اور دھیلے کے خریداروں کی راہ دیکھنی پڑتی تھی، ان کی خوشامدیں کرنی پڑتی تھیں۔ دھیلے میں پیسے کی چیزیں دینی پڑتی تھیں اور اُن کے بچوں کو دعائیں۔

پھول دئی سے پھر رہا نہ گیا۔ وہ آگے لپکی اور بھیڑ کو ہاتھوں سے چیرتی چلی گئی۔ بھیڑ میں کئی پرانے گاہک تھے، جنہوں نے پھول دئی کو پہچان لیا اور دکھاوے کے ساتھ اس کے لئے راستہ بنایا۔ وہ "تم کو بی، تم کو بی" کہتی ہوئی، واقف گاہکوں سے وعدہ کرتی ہوئی اگلی صف میں جا کھڑی ہوئی...... وہ اس کی چوکی تھی، یہ اس کی ترازو اور بٹے، جیسے پھول دئی کے فراق میں اپنی اپنی جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ کیونکہ اب پھول دئی اس چوکی پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اُسے برسوں کی عادت کو دبانا پڑا تھا۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ دال کی پیٹی پر بے چین ہو رہے تھے، لیکن وہ اپنے ہاتھ پیروں کو سمجھا رہی تھی کہ وہ اب لالہ گھنشیام داس کی ماں ہے، بیٹے لالہ کی عزت رکھنا ہی اب اس کا کام ہے۔ دکان داروں کی مائیں بھی دکانوں پر بیٹھتی ہیں کیا ـــــ ؟ پھر یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اس نے ایسی ناک کاٹنے والی حرکت کی تو اُسی لمحہ گھنشیام اسے دکان سے باہر پھینک دے گا ـــــ اس میں شک نہیں تھا کہ دکان پھول دئی نے ہی بنائی تھی۔ برسوں کی صعوبتوں کے بعد۔ لیکن کس کے لئے؟ گھنشیام کے لئے نہیں تو اور کس کے لئے! اور اب جو گھنشیام نے اس کو دکان سے ہٹایا تھا اسی لئے نا کہ اب اس میں عزّت کا سوال تھا۔ چشم بد دور، اس کا بیٹا اب آبرو والا تھا۔

ری تو کاہے آئی! ـــــ گھنشیام نے پہلی بات اپنی ماں سے ہی پوچھی ـــــ "تو بھی چینی لین کو آئی کیا؟" اس نے بڑے طنز سے پوچھا۔ پھول دئی کی حیرانی بڑھتی گئی اور وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ یہ جو چینی لینے آئے تھے۔ یہ کیا لوٹنے آئے تھے اُسے، جو وہ ان سے چڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کا منہ ہی تکتی رہی ـــــ اور اگر وہ اس کا دل بھی دیکھ سکتی وہاں وہ غصہ نہیں پاتی کیونکہ گھنشیام کے دل میں غصہ نہیں تھا۔ ایک عام سستی سی اُس پر غالب آ رہی

تھی۔ راشننگ کا زمانہ تھا اور اسکے پاس شکر کی دو بھری بوریاں تھیں۔ بیچنے کے بجائے وہ ان بوریوں پر لیٹنا چاہتا تھا، اور چونکہ راشننگ کے حکم سے اُسے شکر بیچ ہی ڈالنا تھی۔ وہ دینے سے پہلے اور خوشامدیں سننا چاہتا تھا۔ آنکھوں آنکھوں میں ہر ایک کو انکار کرنا چاہتا تھا ذرا اور ویران بابوؤں کے منہ دیکھنا چاہتا تھا جن کا ایک ایک منہ ایک ایک سیر شکر کی بھیک مانگ رہا تھا۔

پھر جب پھول دئی اس کا مُنہ ہی تکتی رہی۔ گھنشیام کے دل میں غصہ بھی آگیا بھیڑ کی پروانہ کرتے ہوئے بلکہ بھیڑ پر بھی اپنے کو ظاہر کرتے ہوئے اس نے پھول دئی کو ایک زور کی جھڑکی دی۔

"ری بولے کیوں نا؟ میرا مُوہ تکے جائے بڑیا..... کاہے آئی تو"

پرانے گاہکوں کے سامنے پھول دئی اپنے لونڈے کی جھڑکی پر چُپ کیسے رہتی؟

"رے نواتنا کہ. ودھ کاہے کرے رہے؟ تیرو مال کھایو کسی نے؟"

گھنشیام کا غصہ اور تیز ہوا۔ اس کی آواز اونچی نکلی "میں پوچھوں ہوں تو آئی کاہے یاں؟

پھول دئی کا تجربہ وسیع تھا۔ گھنشیام کا غصہ اور بھڑ کانے کے بجائے اس نے اس کو اپنے پرانے گاہکوں کے سامنے شرمندہ کرنا چاہا۔ بھیڑ کی طرف مڑ مڑ کے اور ہاتھ پھیلا پھیلا کر اس نے گھنشیام کی بات کا جواب دیا۔

"رے تیرو بال رو رہا ماں ک دورے۔ دُودبی نا دوں ستے۔

مرا گوسی ادھار نا دے میں ناواں کا نہہ سے لاؤں؟"

ایک لمحے کے لئے بھیڑ خاموش ہوگئی۔ گھنشیام نے غصے میں آنکھیں کھولیں اور اس کا ایک ہاتھ ترازو کی ڈنڈی پر خود بخود آیا۔ لیکن بھیڑ بھر کی آنکھیں اس کو دیکھ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں ایک انقلاب آچکا تھا۔ ان میں اب دردناک سوال نہیں تھے۔ ایک ایک نظر

ترازو کی ڈنڈی کی طرح سیدھی تھی ـــــــ اس کا اپنا ہاتھ ڈنڈی پر ڈھیلا پڑ گیا اور اسے ایسا دکھائی دیا جیسے وہ خود ترازو کے ایک پلڑے میں پھنس گیا ہو، جیسے دوسرے پلڑے کو اس کی ماں نے نیچے دبا رکھا ہو اور اس کا اپنا پلڑا ہوا میں لٹک رہا ہو ـــــــ ناچار اس نے اپنے آپ کو ہی ایک جھٹکا دیا۔ ترازو کو ہاتھ میں سنبھالا اور بوری میں سے شکر کا ایک چھانو ابھرتے ہوئے پھول دئی کی بات کا جواب دیا۔

"اری امازی سیس؟ اتی سویرے میرے دورے ناواں کا منہ رکھا ہے بھگ۔ جا، دیکھے ناجاوے اتنے گاک کھڑے ہیں یاں؟ اِتے بابو؟"

ایک آن میں دیکھتی ہوئی آنکھیں پھر بھیک مانگنے لگیں، دھکا پیل شروع ہو گئی۔ گھنشیام شکر تولنے لگا۔ پھول دئی کو دھکے لگے اور اس نے اپنے آپ کو بھیڑ کے بیچ پایا۔ پھر ایک ایک دھکے نے اس کو پیچھے ہٹایا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی اور بڑبڑاتی گئی۔

"دیکھ لے بابوجی، یو میرو بیٹو۔ یو میرو بیٹو۔"

وہ بھیڑ کے پیچھے آ کھڑی ہوئی اور گھنشیام کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے پیچھے وہی بنجر میدان تھا۔ جو شہر کی اس حد سے اس پہلے گاؤں تک پھیلا ہوا تھا۔ افق اور پھول دئی کی پیٹھ کے درمیان کسی پست قد درخت کا بھی دخل نہ تھا۔ سورج نے نمودار ہوتے ہی اپنی پہلی کرنیں اسی پیٹھ کو سہلانے بھیجیں۔ لیکن یہ کرنیں بھی گرمی پکڑتی گئیں اور پھول دئی کی پیٹھ کو کریدنے لگیں۔ پھر جیسے پیٹھ چیر کے انہی کرنوں نے پھول دئی کے اس کانٹے کو بھی چھوا جس کو اس نے "میرو بیٹو میرو بیٹو" دُہرا کے گہرائیوں میں ڈبو دیا تھا۔ اب اس کے لئے وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل تھا۔ لیکن اس کا پوتا گھر میں رو رہا تھا اور گھوسی دودھ نکال رہا تھا۔ پر وہ دودھ کیسے لیتی؟ تب ہی نا جب گھنشیام پیسے دیتا! اس کو وہیں انتظار کرنا تھا، جب تک بھیڑ چھٹ جائے ـــــــ لیکن یہ دھوپ!

ناچار پھول دئی سڑک کے کونے پر جو نیم تھا، اس کے نیچے آ بیٹھی۔ نیم تلے کی ہواؤں نے جیسے اس کے بند کھول دیئے۔ کمر لٹکا کے اس نے اپنی ٹانگیں بھی پھیلا دیں......

یہ گھنشیام پھول دئی کا بیٹا تھا۔ یہی جواب لمبی مونچھوں والا تھا۔ کبھی یہ بھی دودھ کیلئے روتا تھا جیسے اب اسی کا بیٹا۔ لیکن پھول دئی اُسے رونے کب دیتی تھی۔ وہ اُس کو دن رات پلاتی رہتی اور اب۔ اُس کی جو بہو تھی اپنے ننھے کو گود میں بھی نہ لیتی تھی۔ منڈو کے دودھ بھی نہیں اترتا تھا ...... کیا زمانہ تھا وہ جب باجرے کی روٹی تھی اور سرسوں کا ساگ تھا۔ دودھ کی دھار تیز جاری رہتیں جب گھنشیام پی بھی چکتا۔ پھول دئی کے خزاں رسیدہ سینے میں بہار کی سرسراہٹ سی ہوئی ـــــ آہ وہ دن۔ آہ! تب یہ پھولدئی نہیں تھی کہ اپنے لہنگے کی طرح بوسیدہ ہو رہی ہے اور تو اور، اس کے دانت اتنے سفید ہوتے تھے کہ بوڑھا ماٹھو بھنگ پینے سے پہلے بھی اُسے پھول دندی کہہ کر پکارتا تھا اب یہ دانت کہ جیسے اُن پر ہلدی اور تیل کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اُسے دانتن کرنے کی فرصت برسوں نہیں ملی تھی۔ پھر جہاں دن پر دن گزرنے سے پھول دئی سکڑتی جا رہی تھی۔ یہ کم بخت دانت بڑھتے ہی جا رہے تھے ـــــ پھول دئی کی ٹانگ پر ایک چیونٹی نے کاٹا۔ ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی تھیں ہی۔ اُس نے اپنے ہاتھ ٹانگوں پر پھیرے ـــــ آہ! اس نے پہلے اس طرف بھی دھیان نہیں دیا تھا۔ ٹانگیں کیا، یہ تو لکڑی ہو کے رہ گئی تھیں۔ کتنا گوشت ہوتا تھا ان ہڈیوں اور چمڑے کے درمیان ـــــ پھول دئی کی پنڈلیوں میں جیسے گوشت اچھلنے لگا اور اس کے ہاتھ جیسے بھری بھری ٹانگوں کو محسوس کرنے لگے اور پھر اس کے ہاتھ پنڈلیوں پر رک گئے نہ جانے کیا سوچ کر۔

اُس کا دولہا؟ کیا ہاتھ پیروں والا آدمی تھا۔ جب دیکھو اس کے ہاتھ بے چین ہیں۔ ٹٹول رہے ہیں، مروڑ رہے ہیں، دبا رہے ہیں۔ جیسے پارہ بھرا تھا اس میں، اس کی ہر بوٹی پھڑکتی رہتی تھی، اتنی کہ پھول دئی کبھی کبھی بہت تنگ ہوتی تھی۔ تھی جوان وہ بھی۔ کھیل اس کو بھی بھاتے تھے۔ لیکن بھئی جوش ہی جوش کیا؟ دنیا میں دس اور دھندے ہوتے ہیں، کچھ ان کا بھی ہوش ہو۔ بیاہ کس کا نہیں ہوتا؟ اور یہ آدمی ہی کیا ہوا کہ دن بھر بیوی کی بوٹیاں نوچتا رہے اور جب شام ہو جائے تب جاگے رات اور صبح کے آٹے کا خیال آ رہے۔ بڑا وحشی تھا وہ نہ جانے پھر دو ایک گھڑی شام کو

کہاں ہڈی پسلی توڑ آتا تھا۔ دکان سے لوٹتا ہوا واپس آتا تھا، آٹا دال، سبزی، نمک اور تیل لے کے۔ پھر کھا لیتی تھی وہ، زندہ رہنے کو۔ لیکن وہ زندگی ہی کیا! چوڑیاں خریدنے کو اس کے پاس دھیلہ نہیں تھا۔ یہ جو دو کڑے اور ہنسلی تھی کتنی لگائیاں ان پر ہنسی تھیں۔ تانبے پر چاندی بھر تار جیسی پتلی چیزیں .... یہ شخص اسے گاؤں سے بیاہ کے لایا تھا۔ کتنی خوشامدیں کی تھیں اس نے۔ ماں سے کہا تھا کہ چاندی تک سے لاد دوں گا۔ چاندی ہی نہیں سونا بنا دوں گا اور جو حالت پھول دئی نے آ کے دیکھی تھی اس پر اب اسے ہنسی آتی تھی۔ بیاہ سے پہلے یہ شخص اس کوٹھری میں بیٹھا پیستا تھا۔ وہی بڑے بناتا تھا۔ مونٹھ بتاشے اور زیرے کا پانی بناتا تھا خوانچہ لے کے گھوم پھر کے کچھ بنا لیتا تھا۔ پھر بیاہ کے متوالے نے کیا کیا تھا؟ ایک برات اور ان چاندی کی تاروں کے لئے اپنی سِل تک بیچ ڈالی تھی۔ بیاہ کے بعد اس کے پاس کیا تھا؟ کرایے کی خالی کوٹھڑی تھی۔ جہاں کچھ اور نہیں تو ایک شوقینی کھاٹ ضرور تھی۔ دن بھر وہیں چمٹا رہتا تھا اور کچھ کام سوجھتا ہی نہیں تھا اسے۔ بس پھول دئی کو دیکھتے رہنا، اسی کو سونگھنا، اسی کو چاٹنا۔ عجب مٹھائی کی دکان بنی تھی پھول دئی ان دنوں، وہ دانت دبا دبا کر کہتا بھی تھا ——— "ری میرے لڈو، میرے پستے کی لوز، میری ملائی، میرے ...." پھول دئی کو دودھ یاد آ گیا۔ وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی، لیکن دکان کے سامنے اب زیادہ لوگ تھے۔ وہاں زیادہ شور تھا۔ وہ اگر چلا کر بھی گھنشیام کو بلاتی وہ کیسے سُن سکتا؟ ——— کیا ظلم کی بات تھی یہ چار آنے پیسے بھی اب پھول دئی کے پاس نہیں تھے، مرے نے دھیلے دھیلے کو ترسانا شروع کیا تھا۔ جیسے یہ دکان اس کے باپ کی تھی .... باپ کی کیا ہوتی؟ موئے کنگال کے پاس ایک سل بٹہ تھا۔ خوانچہ کے تھوڑے سے برتن تھے۔ وہ بھی اس نے بیچ کھائے تھے۔ اس سے اچھا تو وہی بوڑھا ماٹھو تھا جس نے اسکے برتن مول لئے تھے اور سل بٹہ بھی۔ پھر وہ خوانچہ لے کے گلی گلی گھوما بھی نہیں تھا۔ اس نے تو اپنی کوٹھڑی میں ہی دہی بڑے چاٹ کی دکان ڈال لی تھی ......

عجب بوڑھا تھا یہ ماٹھو بھی! کیا کیا جوش مارتے پلا تارہا گھنشیام کے باپ کو جب

بخار نے اُس کو رُلا دیا تھا۔ پھر جب وہ مر بھی گیا، بوڑھا اس دن رو دیا کتنا تھا پھوٹ پھوٹ کے وہ اتنا رویا تھا کہ پھول دئی کو اپنا آپا بھول گیا تھا اور اسی پر رحم آیا تھا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکی تھی کہ بڈھا اتنا کیوں رویا ـــــــ میاں کے زندہ ہوتے اس نے یہی سمجھ رکھا تھا کہ ماٹھو ان دونوں کا دشمن ہے۔ ایک تو اسی ظالم نے پھول دئی کے آدمی سے سل بٹہ اور خوانچہ کے برتن خریدے تھے اور پھر رہتا بھی تھا۔ ساتھ والی کوٹھڑی میں جہاں دکھا دکھا کے خوانچہ بھی لگاتا تھا۔ بیچ کی دیوار میں ایک جھری بھی تھی۔ کتنی بار پھول دئی نے بڈھے کو اس جھری میں سے جھانکتے پکڑا تھا۔ جانے چوری چوری کیا کیا باتیں جھری میں سے دیکھتا رہتا تھا۔ مزے کی بات ہوئی تھی اس دن، جب پھول دئی نے بڈھے کی یہ بات اپنے میاں سے کہہ دی تھی۔ اسُ دن اس کا میاں بلی کی طرح تاک میں بیٹھا تھا اور جونہی بڈھے کی آنکھ جھری کے ساتھ لگ گئی تھی۔ اس کے میاں نے بڈھے کی دیکھتی آنکھ پر پٹاخ سے تھوکا تھا........ لیکن یہ ماٹھو اس دن خوب رو دیا تھا، اتنا کہ پھول دئی نے اس کی بات فوراً مان لی تھی۔ رہی تھی وہ اسی اپنی کوٹھڑی میں ہی۔ اپنے لئے روٹی بناتی تھی ماٹھو کے لیے بھی چار روٹیاں اتارتی رہی........ یہ روٹیاں پہلے سے بہت اچھی تھیں۔ آٹا دال گھر میں جمع رہتا تھا، ماٹھو دلیس سے گھی منگاتا تھا۔ موسم موسم کی سبزیاں لاتا تھا۔ پھر دکان میں دہی بڑے تھے ہی پکوڑے بھی تھے اور بتاشے بھی۔ پھول دئی تو گھر سا کرنے لگی تھی اور سب سے بھلی بات یہ تھی کہ پھول دئی کو اب نوچتا کوئی نہیں تھا۔ اس کی بوٹیاں آرام کر رہی تھی کیونکہ بڈھے کے ہاتھ پیر گرے گرے رہتے تھے........ ویسے رات کو خوانچہ اٹھا کر وہ بھی ایسی گرم گرم باتیں کرتا تھا جیسے اسے بھی بڑ بھس لگ گئی ہو۔ کبھی کبھی اسے جوش بھی آتا تھا جب وہ اسی جوش کو دباتے ہوئے پھول دئی سے کہتا تھا۔ "ہاں پھول دندی آج منے سوچ آوے ہے........ کہ تم منے بوڑا سمجھو سو........ بوڑا سمجھو سو، ہوں پھول دندی منے بوڑا سمجھو سو؟" پھر وہ پر معنی کھانسی سی کھانستا تھا........ "ہوں پھول دندی منے بوڑا سمجھو سو ـــــــ!" پھر وہ ایک

جوان کی طرح کھڑا بھی ہو جاتا تھا اور قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چھوٹے سل بٹے کو اٹھا کے پھر زمین پر رکھ دیتا تھا اور اسی سل کو بے رحمی سے پیر کے نیچے دباتا تھا۔ پھر بھنگ کی چٹکی کو سل اور بٹے کے شکنجے میں لا کر کچھ پھول دئی سے کچھ اپنے آپ سے بولتا: "پہلے سبزی تو گھوٹ لوں ــــــ" پھول دئی نہ ہاں کہہ سکتی نہ نا۔ وہ تو ایسے بنتی تھی جیسے اس سے کچھ نہ کہا گیا ہو۔ پھر جب ماٹھو بھنگ گھوٹنے بیٹھتا اس کی جیسی گوشت کی بھری بوریاں اٹھک بیٹھک کرنے لگتیں۔ اُسے بہت پسینہ آتا اور وہ ہانپنے لگتا۔ اس کی سفید مونچھوں کا گچھا بھی پھنکاروں کے ساتھ اٹھتا اور بیٹھتا۔ اس کے بدن سے ایسی بھکرانداُٹھتی جیسے گرمی میں باسی دہی بڑے اُلبس گئے ہوں۔ پھول دئی اتنے میں سمجھ جاتی کہ بیچارا بوڑھا بہت بوڑھا ہے۔ پھر جب وہ گھوٹ چکتا پیاس کے مارے وہیں پی بھی لیتا اور پیتے ہی ایک نئی دنیا کی باتیں کرنے لگتا۔ اس کو یہ بھی پتہ نہ رہتا کہ پھول دئی اپنی کوٹھری میں چلی گئی ہے اور سو بھی گئی ہے.......... اس دن پھول دئی کو شرارت سوجھی تھی، اُس نے بھنگ کی پوٹلی چھپا دی تھی۔ لیکن ماٹھو نے اس کے پیر چھوئے تھے۔ اس دن مرنے نے ہاتھ بھی چھوئے تھے، ایک بچے کی طرح رو بھی پڑا تھا۔ لیکن صرف اسی پوٹلی کے لئے۔ اس دن پھول دئی کے رہے سہے شک بھی دور ہو گئے تھے۔ بوڑھا دراصل گھنشیام جیسا بچہ تھا۔ اس دن سے پھول دئی اُسے گالیاں بھی دینے لگی تھی جیسے وہ گھنشیام کو دیتی تھی۔ پھر جیسے وہ گالیاں بھی ہو گئیں تھیں کیونکہ ماٹھو بھی پھر مر ہی گیا تھا...... ماٹھو کے مرتے ہی پھول دئی سل بٹہ اور برتن اپنی کوٹھری میں لے آئی تھی۔ وہ اب اکیلی رہنے سے کیا ڈرتی؟ گھنشیام بھی تو چار سال کا ہوا تھا۔

اپنی کوٹھری میں پھول دئی نے بڑے شوق سے دکان لگائی تھی۔ اپنا دروازہ چوڑا تھا، کچوڑیوں کے لئے بھی باہر باہر ہی جگہ نکلی تھی۔ پہلا خوانچہ دیکھ کر ہی گاہک آنے لگے تھے۔ لیکن یہ وہی بڑوں کے گاہک باتیں بھی سنا جاتے تھے۔ بہر حال اُس نے اپنے کام سے مطلب رکھا تھا۔ کوئی اگر بڈھے کی وراثت کی طرف اشارہ کرتا تو اس میں شرم کی کون سی بات تھی، برتن ہی تو چھوڑ

گیا تھا مرا۔ وہ برتن اس کے اپنے تھے۔ پھر اگر کوئی بے ڈھنگا مرد زبان نکال کر دہی بڑے کھانے بیٹھ جاتا یا ایسی ویسی باتیں کرنے لگتا، دہی بڑوں کی جگہ اُسی کو گھورنے لگتا تو پھول دئی اس بند تختے کے پیچھے گھنشیام کو لوری دینے لگتی۔ لوری کے بہانے نظر ہائیوں کو کوسنے دیتی ——— "رائی نون تیرے دیدوں میں۔ رائی نون تیرے دیدوں میں" ——— گاہک بھنا کر یا تو اور دہی بڑے مانگ لیتا یا اپنی آنکھیں ملتا ہوا چلا جاتا .... پھر اس نے دہی بڑے بھی ذرا بھاری کر دئے تھے۔ ساگ کے پکوڑوں کے ساتھ ساتھ پیاز کے پکوڑے بھی تلنے شروع کئے تھے۔ پکوڑوں کے پکوان کڑاہی سے نکلتے ہی بکنے لگے تھے۔

ماٹھو کی کوٹھڑی میں بہت دنوں تک کوئی کرایہ دار نہیں آیا تھا۔ لوگ پھولدئی کو سنا دیتے تھے کہ بڈھے کی روح کوٹھڑی سے نہیں گئی ——— کیونکہ بڈھے کی لاش پوری طرح جلی نہیں تھی۔ پھولدئی کو یہ تو معلوم تھا کہ اس دن لکڑی گیلی ملی تھی۔ لیکن وہ اُن لُچے، لنگاروں کی بات سمجھ جاتی تھی جو اس کو ڈرانا چاہتے تھے۔ ڈرتی کیا وہ؟ چلو ماٹھو کی روح ہی سہی۔ ماٹھو ہی کون سا وہ تھا جو اُس کی روح سے پھول دئی کانپ اٹھتی؟ اُس نے کئی بار جھری میں سے ماٹھو کے نام سو سو گالیاں بھی بکیں، روح ہوتی تو جواب نہ دیتی؟ یہ کہو کہ پھول دئی کبھی کبھی جھری میں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ اب جو ماٹھو وہاں تھا نہیں وہ کس کی پھولی ہوئی توند کو دیکھتی؟ پھول دئی تو خالی دیواروں کو دیکھ دیکھ کر تنگ آ گئی تھی، اسی لئے اس کا دل چاہتا تھا کہ کسی دن چاٹ بناتے بناتے مولا بھڑ بھونجے سے کہہ دے کہ کم سے کم چنوں کے لئے ہی وہ کوٹھڑی کرائے پر لے۔ مگر نہیں بابا۔ مرد کے ساتھ بے مطلب کی بات کرنا اچھا نہیں۔ مولا چالیس برس کا سیانا ہی سہی لیکن بھئی مرد کے ساتھ ایک بات کرو دس اپنی ملا کر دنیا سے کہتا پھرے گا ——— تو پھول دئی نے مُولا سے کچھ بھی نہیں کہا تھا.........

یہ بات تو ضرور تھی کہ مولا پچاس کے پیٹے میں تھا۔ پھر تھا بھی ٹرطھ مُنہا سا۔ کون یہ یقین کرتا کہ جس پھول دئی نے جوانوں پر تھوکا نہیں اسی نے ٹڑھ مُنہے کالے کلوٹے بھڑ بھونجے کو وہاں بلایا؟

ویسے تو بھڑ بھونجا روز خود ہی چلا آتا تھا۔ پورے پانچ آنے کے دہی بڑے کھالیتا تھا۔ عین اُسی وقت آتا تھا جب پھول دئی دوپہر ڈھلتی دیکھتی اور کل سات آنے کا گلہ گن چکی ہوتی۔ وہ جب اس کو آتے دیکھتی دل ہی دل میں بارہ آنے گن کر خوش ہو جاتی۔ پھر مُولا انگلیاں چاٹ چاٹ وہی بڑے ڈھکوستا جاتا تھا۔ اور کبھی وہ پیاز کے گرم گرم پکوڑے بھی نکلواتا اور وہ کُرم کُرم کرتا وہیں بیٹھ جاتا اور چونکہ پھول دئی کو اس کی پسند کا مسالہ خوب یاد تھا۔ چٹخارے بھر بھر کے کہتا رہتا تھا۔ "پھول دئی کیا کہنے ہیں تیرے مسالے کے ...... کیا کہنے!" لیکن پیاز لیتے ہوئے جب وہ کہتا تھا: "پھول دئی یہ پیاز کم کرلے بائی۔ جوان ہوں تو کھادیں۔ اَمکو تو تنگ کرے ہے پیاز۔" پھول دئی کو شرم سی آجاتی اور وہ اپنی آنکھیں نیچی کرلیتی۔ مُولا کُرم کُرم کرتا ہوا چلا جاتا اور پھول دئی کے بارہ آنے بن جاتے۔ وہ پھولی نہ سماتی۔ پھر یہ بھی سوچتی کہ بھڑ بھونجے کی پونجی خاصی ہوگی جو وہی بڑے روز پانچ آنے کے کھاتا ہے......

بھڑ بھونجا تو روز ہی آتا تھا اور جس دن نہ آتا تھا پھول دئی پریشان کیسے نہ ہوتی؟ ایسے منحوس دن اسکے سات آنے بھی پورے نہ ہو جاتے۔ وہ دن بھی ایسا ہی تھا جب وہ انتظار کے بعد ذرا لیٹنے لگی تھی اور گھنشیام نے اس کی پنڈلی کو دانتوں سے کاٹا تھا۔ پھول دئی کی جان نکل گئی تھی اس وقت اس کی چیخ نکل گئی تھی...... بچہ اتنے زور سے کیا کاٹتا، لیکن اس وقت پھول دئی کے جیسے سینکڑوں دھل گے کٹ گئے تھے۔ اُسی وقت اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی بوٹیاں مدت سے جمی پڑی تھیں۔ ایک بوٹی پر دانت لگنے سے اس کی ایک ایک بوٹی دکھنے لگی تھی۔ عجب دورہ تھا وہ کہ پھول دئی اُن دکھتی بوٹیوں کو کٹوانا چاہتی تھی۔ اس دورے میں اُس نے کتنا چاہا تھا کہ گھنشیام کے دانت اُس کے باپ جیسے ہو جائیں۔ پھر دورے کے بعد بھی دورے کا ڈر اس کے دل سے نہیں گیا تھا۔ اُسی شام کو ڈر کے مارے ہی اُس نے بھڑ بھونجے سے کوٹھری کی بات کہہ دی تھی۔ اور بھڑ بھونجے نے کوٹھری کرائے پر لے بھی لی تھی......

لیکن اس بدھونے کوٹھری میں پہلے چنے ہی رکھے تھے، کچے چنوں کی بند بوریاں، اور چونکہ پھول دئی

کی عادت تھی۔ اُس نے تھری میں سے بند بوریوں ہی کو دیکھا اور جب بوریوں کے منھ بند ہی رہے
تھے۔ اُس نے چنوں کے نام ہی گالیاں بکی تھیں۔ پھر اپنے پاگل پنے پر وہ خوب ہنسی تھی، اس ہنسی
کا سبب بھڑ بھونجے نے جب پوچھا تھا تو پھول دئی نے کہا تھا کہ وہ نئے پڑوسیوں پر ہنس رہی
تھی جو بوریوں میں منھ چھپائے بیٹھے ہیں اور گالیوں کا جواب تک نہیں دیتے۔ بھڑ بھونجے کا منھ
اُس وقت اور ٹیڑھا ہو گیا تھا، اُسے پسینے آ گئے تھے اور اُسی رات کو اُس نے اپنی کھٹیا وہیں ڈلوا دی
تھی۔ اس بہانے کہ چنے کم ہو گئے ہیں اور وہاں چوکسی کی ضرورت ہے۔

بھڑ بھونجا خاموش طبیعت کا آدمی تھا۔ پھول دئی کی کوٹھری میں چپ چاپ آتا تھا
اور وہاں سے بھی چپ چاپ جاتا تھا۔ جیسے وہاں بھی کوئی بوری اُٹھانے آیا ہو۔ نہ بات
نہ چیت نہ کھیل نہ کود۔ بس آئے جیسے چنے خریدنے، خریدنے بھی کیا؟ یہاں کون سے بھاؤ
پوچھنے تھے؟ پھر وہ کش مکش پسند تھا ہی نہیں، اس نے کبھی کھینچا تانی کی ہی نہیں تھی۔ بس ڈیڑھ
مطلب کی بات کرتا تھا......... پھول دئی کو پڑوسی جو ملا بھی تھا گھنا تھا۔ اس کا جی تو
جلد ہی بھر گیا تھا۔ اس کو تو ٹیڑھے منھ سے نفرت ہو گئی تھی۔ پہلے تو اُس نے اس کا منھ اتنا
ٹیڑھا بھی نہیں سمجھا تھا۔ پھر کبھی کبھی جب وہ مسکرانے کی کوشش بھی کرتا تھا، پھول دئی اپنی
آنکھیں بند کر لیتی تھی .... اس کے بدن پر جیسے بھاڑ کی ریت بکھری ہوئی تھی۔ اس کی
کھال بھی بھنی ہوئی تھی اور اس کے بدن سے ایسی چراہند اٹھتی تھی جیسے ساگ کے پکوڑے
کڑاہی میں جل رہے ہوں.......... پھول دئی تو اس گھڑی کو کوسنے لگی تھی۔ جب اُس نے
مولا سے وہ بات کہہ دی تھی، لیکن پھول دئی ان دنوں کیا کرتی؟ بغیر پڑوسی کے وہ رہتی کیسے؟
پھر یہ پڑوسی وہی بڑوں کا بھی شوقین تھا۔ گھنشیام کو بھی کچھ دن بعد اپنی دکان پر لے جانے
کی سوچ رہا تھا۔ لیکن تھا وہ ایسا کہ پھول دئی کو اس سے نفرت ہوئے بغیر رہ نہ سکتی تھی۔ خاص
کر وہ اس وقت سل کے بٹے سے اس کا منھ توڑنا چاہتی تھی جب وہ جاتے جاتے بھی اپنی
زبان نہ کھولتا تھا اور انٹی میں سے ایک روپیہ نکال کر پھینک جاتا تھا۔ لیکن پھول دئی غصہ

پی جاتی تھی اور اس روپلے کو بھی گلے میں ڈالتی تھی۔ جیسے اُس نے بتیس دہی بڑے نیچے ہوں۔
پھر پھول دئی کو پرماتما نے وہ دن بھی دکھایا تھا جب اس کے دل میں ہمت آئی اور
بھڑ بھونجے کا مقابلہ کرنا آسان دکھائی دیا ــــــــ ہوا یہ تھا کہ اس دن بھڑ بھونجہ عادت
کے خلاف پریشان سا ہو رہا تھا۔ اُسے یہ شک کھائے جا رہا تھا کہ اُسکے سالے نے اُسے پھول
دئی کی کوٹھری میں گھستے دیکھا ہے۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے جب اپنی دھوتی کی گانٹھ
لگائی تھی۔ اس کی انٹی میں سے ایک چھوٹی سی تھیلی گر گئی تھی۔ اس کو تو ہوش تھا نہیں۔ پھول دئی
نے گرتی ہوئی تھیلی کو دیکھ لیا تھا۔ دیکھ کر اس کا دل رک سا گیا تھا، وہ کچھ بول نہ سکی تھی۔ اتنے
میں بھڑ بھونجا کوٹھڑی سے باہر چلا گیا تھا۔ اس تھیلی میں اُس نے ایک اَن دیکھا ہرا ہرا نوٹ پایا
تھا۔ لیکن وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ یہ بھی نہ اندازہ لگا سکتی کہ پورے سو کا ہے...... ایک
لمحے میں اُسے دہی بڑے، بتاشے، کوٹھری، بھڑ بھونجا اور سارا دلدر بھاگتا دکھائی دیا تھا۔ پھر جب اس
نے نوٹ کو اپنے لہنگے کے نیفے میں ڈال دیا تھا اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی کمر میں طاقت کی
ایک نئی لہر دوڑ رہی ہے اور اس کے ہاتھ فولاد کے بن گئے ہیں۔ جن سے وہ بھڑ بھونجے کو بھی ہٹھی
کی طرح پیس ڈالتی۔ بھڑ بھونجا اسی وقت لوٹ آیا تھا۔ لیکن پھول دئی بھی تیار بیٹھی تھی۔ وہ اس
طرح بھڑ بھونجے کو کھانے کو دوڑی تھی کہ بھڑ بھونجے کی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ
اُس نے نوٹ انٹی میں باندھا تھا کہ صندوق میں رکھا تھا۔ پھر اس نے لاکھ معافیاں مانگی تھی۔ لیکن پھول دئی
اب اس کا کیا مانتی! اس کی ناک میں اب تو ایسی چراہند گھس رہی تھی۔ جیسے اُس نے سب وہی
بڑے اور پکوڑے چولھے میں جھونک دیئے ہوں......

نیم کے نیچے پھول دئی تقریباً لیٹ گئی۔ اس کے خیالوں میں گھنشیام یا دودھ کا سایہ تک
نہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک نئی مسکراہٹ ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے سامنے اب ہریالی پھیل
رہی تھی، سبزیوں کی وہ نئی دکان جو اس نے بھڑ بھونجے کا قصہ ختم کرتے ہی ڈالی تھی ــــــــ
کہاں وہ کوٹھری اور کہاں وہ چوڑی دکان۔ پھول دئی نے پہلے ہی دن منڈی میں اتنی سبزی خریدی

تھی کہ ٹھیلے میں لدوانے کے لئے اُس نے کئی مزدوروں کی ضرورت محسوس کی تھی...... پھر اسی
ایک ٹھیلی والے کو جیسے بھگوان نے بھیجا تھا، جس نے دیکھتے دیکھتے درجنوں کا کام نبھایا تھا، کتنی
پھرتی تھی اُس کی حرکتوں میں، کتنی طاقت! پھر بھولا اتنا کہ پیسے بھی اس نے ٹھیرائے نہیں تھے۔
وہ ایک ایک جھپٹ میں ایک ایک ٹوکری رکھتا گیا تھا، اور پھول دئی اس کی اجرت کا اندازہ
دل ہی دل میں بڑھاتی گئی تھی۔ وہ ٹوکری پر بوری اور بوری پر ٹوکری قرینے سے دھرتا گیا اور پھول دئی
کو اپنے ہاتھ پیر ٹوٹتے دکھائی دے رہے تھے، ایک ایسے مرد کے بغیر اس کی نئی زندگی رُکتی
دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی دکان پر یہ ٹوکریاں اور بوریاں کون اُتارتا؟ دکان میں اتنی سبزی
کون سنبھالتا؟ اور اگر وہ اس ٹھیلی والے کو دکان تک ساتھ لے چلتی تو اُس کی اجرت کتنی
بڑھتی؟........ اس مرد کی اجرت وہ کہاں دے سکتی تھی! لیکن اس مرد کے بغیر دکان
بھی کیسے چل پڑتی؟........ اس وقت پھول دئی ہار کے وہیں زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ ڈر ڈر
کے اس نے اس کا نام پوچھا تھا اس نے اپنا نام مکندی بتایا تھا، گھبرائی ہوئی پھول دئی نے شکرقندی
بھا تھا...... کیا خوب مکندی تھا وہ، پھول دئی نے سونگھ کے اس کو بھی دیکھا تھا سوندھا
سوندھا سا جیسے کورے گڑھے میں ابھی ابھی پانی ڈالا گیا ہو، جیسے کرارا پودینہ کھیت سے کٹ کے
آیا ہو، پھول دئی کی قسمت اچھی تھی کہ مکندی نے دن دن کی نوکری منظور کی تھی۔ دن دن میں ہی
اس نے پھول دئی کا ہر کام سنبھالا تھا دکان کو وہ فروغ دیا تھا کہ علاقے بھر میں مقابلے کی دکان
نہ رہی تھی۔ کیا طوفان کا آدمی تھا وہ۔ اُسے کہو کہ پھول دئی کے لئے پہاڑ اٹھا لائے تو اٹھا لاتا۔ جب
کہو تیار ہے۔ کسی کام سے گریز نہیں۔ پھول دئی کے بس وہی دن تھے۔ اُن دنوں اس نے کیا چاہا
تھا جو مکندی نے مہیا نہ کیا۔ پھول دئی تو راج کر رہی تھی ان دنوں۔ دن دن کا کیا مکندی نے اس
کو چوبیس گھنٹوں کا سہارا دیا تھا۔ پھول دئی اُس کو چھپا کے رکھنا چاہتی تھی، اُسے یہ ڈر تھا کہ مکندی
کو کہیں بہتر نوکری نہ مل جائے۔ خود وہ سب سے اچھی مالکہ بننے کی کوشش میں رہتی تھی۔ یہی مکندی
نہ ہوتا تو وہ سبزی کی دکان بنیئے کی دکان میں کیسے تبدیل ہوتی! گھنشیام کو اسی نے پالا۔ برسوں اس

کی سرپرستی کی۔ اُس کو اتنا بڑا کیا اور لالہ بنا دیا۔ آہ اسی گھنشیام کو جس نے پھر اسی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اسی مکندی کو! اسی مکندی کو! کم بخت نے پھول دئی کو بھی کیوں نہیں نکال دیا تھا اُس دن؟ خود یہ پھول دئی کیوں نہ گھر چھوڑ کے نکلی تھی اُس دن! ہائے گھنشیام اگر تو دنیا میں ہوتا ہی نہیں ......

"ری اوان نیائی" گھنشیام نے دکان سے گرج کر آواز دی۔ پھول دئی کو ایک جھٹکے نے زمانۂ حال میں واپس گرا دیا۔ کچھ ایسی پرانی دھڑکنوں میں جاگ اٹھی کہ وہ سمجھی کہ گھنشیام جھری میں سے اس کے سلسلۂ خیال کو دیکھ رہا تھا اور جیسے گھنشیام نے وہ گالی بھی سن لی تھی۔

"ری چھورا کو دُودھ نئی دیا تنے؟ یاں آ کے لیٹ گئی؟ بڑی بیپروا ہے بُڑی یا" دُودھ؟ ؟

پھول دی نے دیکھا کہ دن بہت چڑھ چکا ہے بشکر کی دونوں بوریاں خالی ہو چکی ہیں اور گھنشیام پھٹی ہوئی بوریوں پر کھڑا غصے میں لال پیلا ہو رہا ہے ——!

تحلیلِ نفسی

بدری کے بابوجی کو پنشن کی چھٹی ملی تھی۔ پہلے دن تو وہ گھر میں خوب جوش سے رہے جیسے ایک طویل سفر کے بعد بھائی بندوں میں واپس آئے ہوئے ہوں۔ لیکن دوسرے ہی دن اُن کے چہرے سے وہ ہلکی سی سُرخی بھی اُتر گئی اور نہ گلہ بھی کرنے لگے کہ یہ دن اچانک آگیا......

"اچانک کیسے؟" وہ پھر اپنے دل سے پوچھنے بھی لگے۔ "پانچ سال سے اسی دن تک دن گنتے رہے پھر سال بھر کی ایکس ٹینشن بھی ملی لیکن......" لیکن ان کو پھر بھی یہی احساس تھا کہ یہ دن اچانک آگیا۔

چند ہی دنوں کی ایسی سوچ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آدمی کو موت بھی اسی طرح اچانک آتی ہے۔ جانتے ہوئے کہ موت ضرور آئے گی آدمی امید رکھتا ہے کہ نہیں آئے گی۔ چنانچہ انہوں نے اس ڈر کا حوصلہ بڑھانا شروع کیا کہ موت آکر ہی رہیگی اور اسی ڈر کی بنیاد پر موت تک کا ایک پروگرام بنا ڈالا جس کا پہلا حصہ یہ تھا کہ ملک بھر کے متبرک مقاموں کی یاترا کی

جائے، جہاں مندروں، مہنتوں کے درشن ہوں۔ پاک پانیوں میں اشنان ہوں۔ تاکہ عمر گزشتہ کے گناہ دور ہو جائیں۔

اپنے پرانے نوکر کے ہمراہ پھر وہ چل بھی پڑے اور میں اور بدری بھی ان کے ساتھ متھرا تک چلے گئے۔ بدری اس لئے کہ بابوجی کو ایک پرتکلف سینڈ آف[۱] دینا تھا اور میں اس لئے کہ تحلیل نفسی کا میرا اپنا شوق تھا۔ معمول کی تلاش میں میں ان دنوں کہیں بھی چلا جاتا۔ پھر مفت کی سیر، متھرا تک ہی سہی، کیا بری تھی؟

مندر مندر گھوم کر میرے پیروں میں چھالے پڑ گئے اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ تحلیل نفسی کے ساتھ ساتھ تحلیل روحی کا بھی عامل ہوتا تو مورتیوں سے ہی باتیں پوچھ لیتا۔ وہاں کچھ نفس والے جو ملے بھی پجاری تھے۔ جن کی نظریں میری نظروں سے تیز تھیں۔ وہ فوراً مجھے جانچ لیتے اور سمجھ جاتے کہ پارٹی میں کون کتنی توجہ کا حق دار ہے۔

آخر ہم بندرابن کے ایک مٹھ میں داخل ہوئے جس کا نام جانے کیا وے کُنٹھ تھا۔ وے کُنٹھ یعنی جنت کی پہلی جھلک جو میں نے وہاں پائی یہ تھی کہ مورتیوں کی نسبت آدمی زیادہ تھے۔ اپنے سے آدمی، کھاتے پیتے، تھکے ہوئے اور آرام کرتے ہوئے۔ اور وہ جو ریش دراز بزرگ ہمارا استقبال کرنے کو آگے بڑھے کتنے بھلے دکھائی دیئے! ان کی مسکراہٹ سے صاف ظاہر تھا کہ وہ چندہ یا دکھشنا نہیں مانگیں گے اور جب میں نے ان کو پرنام کیا انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا:۔ "آؤ بیٹو کہاں کہاں کی یاترا کر کے آئے؟ بہت بھوک لگ رہی ہوگی بتاؤ کیا کھاؤ گے؟ راج بھوگ کہ موہن بھوگ؟"

میں جو بھوک سے وحشی ہوا جا رہا تھا اپنی تحیر بھری خوشی کو ظاہر کرنے سے پہلے اور شکریہ ادا کرنے سے پہلے ایک بھوگ کا نام فوراً بتانا چاہتا تھا۔ لیکن جب بابوجی بھی خاموش رہے میں بھی اس ششش و پنج میں پڑا کہ دو میں سے کون سا بھوگ اچھا ہوگا۔ اس وقت جب ہم

۱؎ SEND OFF

سب خاموش تھے۔ بابوجی کے نوکر نے خوب کام کی بات کی۔ اپنی بے ڈھنگی زبان میں مہاتماجی سے بے دھڑک بھوگوں کی تفصیل پوچھ لی۔ مہاتماجی تھے کہ اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا اور تفصیل بھی سنا ڈالی۔ راج بھوگ میں میٹھے چاول تھے۔ کھیر تھی اور پرونٹھوں کے ساتھ سات ترکاریاں تھیں۔ موہن بھوگ میں پوریاں تھیں۔ کچوریاں تھیں اور قسم قسم کی مٹھائیاں تھیں۔ ہم اتنا سن کر بھی خاموش رہے۔ لیکن اب کی خاموشی مجھے بُری لگی۔ کیونکہ ظاہر تھا کہ ہم میں سے ایک ایک اب اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ کونسا بھوگ منگائے اور فائدے میں رہے اور مہاتماجی کی آنکھیں ہم میں سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھیں ——— یکایک میرے دماغ میں ایک فیصلہ اچھلا، جس کا اظہار میں نے تقریباً چلّا کر کیا۔ کہا: ”مہاتماجی ہم میں سے دو راج بھوگ کھاتے ہیں اور دو موہن بھوگ“۔ سب کے چہرے کھل اٹھے اور بدری نے تو میری خاصی داد دی۔ ہم سب نے وہیں دن بھر کی تھکاوٹ کا جیسے بدلہ لیا۔ سب نے راج بھوگ بھی کھایا اور موہن بھوگ بھی۔ بابوجی نے بھی خوب کھایا لیکن وہ نظروں سے تھالیوں کو بھی تولتے رہے۔ کیونکہ انہیں مٹھ میں چندہ دینا تھا اور دیتے ہوئے تھالیوں کا دھیان رکھنا تھا۔ نرے ہم ہوتے تو کھاپی کے ہی چمپت نہ ہوتے؟

مٹھ کے بڑے مہنت کاشی چلے گئے تھے لیکن مہاتماجی نے بابوجی کو مایوس واپس نہ بھیجنا چاہا۔ انہوں نے کہا: ”مٹھ میں ایک اور مہاپرش ہیں۔ بال برہمچاری بڑے ودوان اور پہنچے ہوئے۔ درشن بھی انکے نرالے ہیں۔ چند دنوں میں مٹھ سے جانے والے ہیں۔ کیا معلوم پھر کب لوٹیں؟“ ——— اسی وقت کونے والے کمرے سے عورتوں کا ایک جھنڈ نکل آیا کہ بھنبھنا رہی تھیں۔ ان میں بوڑھیاں تھیں، ادھیڑ تھیں اور جوان بھی تھیں۔ چند بوڑھیوں نے ٹیڑھی انگلیاں اچنبھے میں ہونٹوں پر رکھی تھیں کہ کلجگ میں بھی ایسے درشن میسر ہوئے اور جو جوان تھیں آنکھوں میں صاف ارادے لئے جا رہی تھیں کہ کچھ بھی ہو ایک بار پھر آئیں گے اور جو بھی بول رہی تھی برہمچاری کی تعریف میں ہی کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔ پھر ان ہی میں سے ایک نے بابوجی

کا ارادہ سمجھ لیا اور کہا کہ برہمچاری جی آرام کرنے لگے ہیں۔ یہ سنتے ہی بالوجی بے تحاشا کمرے کی طرف بڑھے کہ اگر وہ سو بھی گئے تو وہاں کی یاترا کا درت گئی۔ اور میں بھی شوق کے ساتھ ان کے پیچھے ہو لیا۔ یہ امید لے کے کہ بال برہمچاری کی نفسیات انوکھی ہوں گی۔ ممکن ہے میرے سوالوں کا جواب دے۔ ممکن ہے میں اس کے غیر معمولی پرہیز کی نفسیاتی بنیاد کھوج لوں۔

برہمچاری جی تخت پر لیٹ رہے تھے۔ لیکن ابھی ان کی بڑی بڑی آنکھیں گھوم رہی تھیں اور تینوں عورتوں کی ممنون نگاہوں کو روشن کئے جا رہی تھیں۔ جن میں سے ایک ان کے سرہانے پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ سب میں چھوٹی تھی اور اس کی نظریں حیا میں انہی کے ماتھے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ جو دو اور تھیں پائنتی بیٹھے ان کے پیروں کو دبا رہی تھیں۔ جب ان دو عورتوں نے مجھ پر دلیری سے نظریں گاڑ دیں اور گیروی دھوتی کو ہٹا ہٹا کے پنڈلیوں کو پکڑ پکڑ کے دباتی رہیں اور میری طرف بار بار نظریں اٹھاتی رہیں، میں بدری کو یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ جو بظاہر دکھا رہی ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے، دراصل شرم کے مارے منہ چھپانا چاہتی ہیں۔ لیکن جب میں بدری کی امید میں پیچھے مڑا، میں نے دیکھا کہ بدری کمرے میں گھسا ہی نہیں تھا۔ کچھ دیر میں نے اس کا انتظار بھی کیا اور جب بالوجی کھسک کے تخت کے قریب گئے اور برہمچاری جی کے دھیمے اور مختصر سے الفاظ کو سن کر کچھ کہنے بھی لگے میں موقع پا کر بدری کی تلاش میں باہر نکل آیا۔

بدری پھاٹک سے باہر سر جھکائے کھڑا تھا۔ گہری سوچ میں۔ ناخنوں کو دانتوں سے کتر رہا تھا۔ کئی گزوں کے فاصلے سے ہی میں نے یہ دیکھ لیا کہ اس کا رنگِ مزاج ان مختصر سے لمحوں میں ہی پلٹ گیا ہے۔ میں سمجھا کہ اس کمرے میں سے نکلتی ہوئی کوئی ایک اس کی طرف مسکرا کے گئی ہو گی اور یہ سوچتا ہوا کہ یہ پرانی وضع کی لڑکیاں بھی بلا ہوتی ہیں کہ پہلی ہی نظر میں سب کچھ بتا دیتی ہیں۔ شاید اسی لئے زود مار ہوتی ہیں۔ میں بدری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ——

"اچھا صاحب تو یہ بات ہے۔" میں نے آتے ہی رازدانی کا دعوےٰ کیا۔ "ہاں بھئی۔ کیا کہنے ان سیدھے پیروں کے، لمحے بھر میں آدمی کو الٹ دیتے ہیں۔ پھر ان کے وہ پایل! چھنن چھن،

چھنن چھن قدیم رومانوں کی یاد تازہ کر دیتے ——— " کہتے کہتے ہی میں نے بدری کے چہرے کا اتنا مطالعہ کیا یہ بات تو صاف ہوئی کہ معاملہ کچھ اور ہے چنانچہ میں نے اپنا انداز بدل دیا اور کہا۔" او ہو بڑی گہری سوچ ہو رہی ہے کیا بات ہے مسٹر؟ تم اندر کیوں نہیں آئے؟ بھئی بات کیا ہے؟" ——— اور جب وہ چپ ہی رہا میں نے اس کا ہاتھ کھینچ لیا اور اس کی فضول سی سوچ پر جھاڑو سی پھیرتے ہوئے کہا ——— " ارے میاں تم تو وقت ضائع کر رہے ہو یار۔ اندر بھی چلو گے کہ نہیں؟ یہاں تو برہمچاری جی کے مزے آ رہے ہیں۔"

لیکن بدری نے بڑے زور کے جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور وہیں اپنے ناخن کترنے لگا۔ پھر اس جھٹکے کی تندی پر پشیمان سا ہو کر اپنے ہونٹوں سے مسکراہٹ سی کھینچنے لگا۔ جس سے یہ بات واضح ہوئی کہ وہ ایک بھاری الجھن کا مقابلہ کر رہا ہے پھر وہ کمرے کی طرف میرے دوش بدوش ایسے چلا جیسے ہر قدم پر کمرے میں گھسنے کا ایک تازہ ارادہ کر رہا ہو۔ میں بھی اس افسوس میں بھاری قدم اٹھاتا چلا کہ بدری کو یہ کیا ہو گیا۔ جب ہم دونوں کو مل کر اندر والے منظر کا لطف لینا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ بدری کے قدم یکایک رک گئے وہ واپس مڑا اور پھاٹک کی طرف تقریباً دوڑا۔ اس لمحے جو رنگ اس کے چہرے پر چھا گیا۔ صاف بتا رہا تھا کہ بدری کی کیفیت خاصی غیر معمولی ہے۔

پھاٹک کے پاس میں جتنا اُس سے سبب پوچھتا رہا نہ اتنا ہی مجھ سے بگڑتا گیا۔ میں اسے کمرے میں چلے آنے کو کہتا گیا اور ایک کیفیت اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی گئی اور جب میں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اس نے سنجیدہ آوازوں میں مجھے برا بھلا بھی سنایا اور مجھ سے بھیک سی بھی مانگی کہ میں اُسے اس وقت اکیلا چھوڑ دوں۔ میری طرف نہ اس کے وہ سنجیدہ الفاظ نہ وہ بھیک ہی معمولی باتیں تھیں۔ نہ کبھی میں نے وہ رنگ اور لکیریں یا اس کے چہرے پر دیکھی تھیں جو خوفناک تیزی کے ساتھ بدلتی رہیں ——— ان لمحوں میں ایسی کون سی بات ہوئی تھی جس نے مجھ جیسے معقول بدری کو اس حد کا غیر معقول بنا دیا تھا

کہ اگر بابوجی بھی باہر آتے، کہتے کہ بدری میں اوپری روح گھس گئی ہے۔ وہ تو جھاڑا پھونکی بھی شروع کرواتے۔ لیکن بدری کی ان غیر معمولی لکیروں میں میرا لفتنہ صاف تھا۔ میں نے بدری سے کہیں بڑے رستوں کو لاشعور کے پنجے میں بے بس ہوتے پڑھا تھا۔ ٹھیک میرا بدری بھی کسی غیر واضح کڑی کے ہلنے سے ایک ایسے سلسلے سے کھینچا جا رہا تھا۔ جس پر اس کا عبور نہیں تھا اور میں جو اس کے سامنے کھڑا تھا، میں نے ایسے ہی سلسلوں کے گمنام محرکوں کو لاشعور کی کوٹھریوں سے باہر گھسیٹنا سیکھا تھا۔ میں نے جھٹ سے اپنا نوٹ بک نکالا اور اس حیرت کو دل سے نکال پھینکا کہ پہلا نفس جو مجھے تجزیہ کے لئے ملا اور اتنی دور آکے ملا وہ بدری ہی کا تھا جس کی نفسیاتی صحت پر میں نے اس دن تک شک نہیں کیا تھا۔

"بدری میری طرف دیکھ" میں نے عامل کے اختیارات ہاتھ میں لئے۔ "دیکھ کیا سوچ رہا ہے۔ مت چھپا۔ بول۔ دیکھ۔ میری طرف دیکھ" عین ایک نفسی بیمار کی طرح وہ میرے سوالوں کی کھوجتی ہوئی روشنی سے اپنی آنکھوں کو بچاتا رہا۔ پھر وہ کچھ سنبھلا۔ جواب تو اس نے دیا نہیں لیکن میرے سوالوں سے اس کی الجھن بھاگتی ہوئی دکھائی دی اور جب میں نے اس سے یہ کہا۔ "بدری کوئی تازہ خواب یاد ہو بتا دو گے!" بدری پھر اپنا بدری بن کر کھکھلا کر ہنس اٹھا۔ ہنسی کو روک کر اس نے کہا "اچھا تو آپ تحلیل نفسی کر رہے ہیں میرا۔" اور پھر ہنسنے لگا ـــــــ

"اوہ عامل صاحب۔ خواب تو نہیں ایک کہانی یاد آرہی ہے کہو تو وہی سنا ڈالوں" ـــــــ "ہاں ہاں وہی سناؤ" میں نے اپنے معمول کو اپنے پر ہنستے ہوئے بھی دیکھ کر دل نہیں ہارا۔

بدری کے دل پر غم کی گھٹا سی چھا گئی اور گھاس پر بیٹھ کر اس نے وہ کہانی شروع کی۔

"ایک تھے بھارگو صاحب جن کی ہر بات پر مجھے پیار سا آتا تھا۔ بڑے الو کھے تھے وہ۔ چوٹی کے عالم تھے۔ زندگی کے فلسفے پر تقریریں کر سکتے تھے۔ زمان و مکان کے

مسئلوں کو خوب سمجھتے تھے۔ لیکن یہ فلسفے ان کو اپنی گہرائیوں میں ڈبوئے رکھتے تھے اور زندگی کی عام سطح تک ان کو ابھرنے دیتے ہی نہیں تھے۔ زندگی کی عام راہوں سے وہ بالکل ناواقف تھے اور مجھے ان باتوں پر پیار شاید اسی لئے آتا تھا کہ وہ بے بس ہو کر گھر سے باہر کی زندگی میں میری ہی رہنمائی میں چلتے تھے۔ میں نہ ہوتا دفتر میں ان کی افسری بھی قائم نہ رہتی۔ ہر صبح میں ان کو یہ سکھاتا کہ دن بھر کس قسم کا رنگِ مزاج ظاہر کریں اور جب میرے سامنے ہی منھ بنا لیتے اور اپنی کرسی میں اس دن کے انداز میں بیٹھنے کی کوشش میں لگ جاتے تو مجھے ہنسی نہیں آتی تھی وہی پیار آتا تھا۔

لیکن ان میں بناوٹ کی صلاحیت کہاں تھی؟ وہ بے ضرورت سچ بھی بول اٹھتے تھے اور مجھے اکثر شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ مثلاً جب میں نے دفتر میں یہ بات پھیلادی ہو کہ بھارگو صاحب کا دھوبی نالائق ہے وہ خود ہی نہ معلوم کیوں کسی نہ کسی سے یہ کہہ دیتے کہ ان کی بیوی دھوبی سے نفرت کرتی ہے اور خود ہی ان کے کپڑے دھوتی ہے۔ ان کی قمیض اور کوٹ بھی ——

کلرکوں کی یک رنگ زندگی میں ایک ایسا شوشہ ہل چل سی پیدا کرتا۔ وہ لوگ کئی دن تک اسی بات کو دُہراتے۔ نہ معلوم ان کو اس انکشاف سے کیا تسلی ملتی۔ جیسے زرد کاغذ کے اٹم گردے میں تحلیل ہو جاتے اور ایک نئی روشنی ان کی چوطرفہ الماریوں پر جھلک اٹھتی، جن میں فائلوں کی جگہ اُنکے اپنے کوٹ، اپنی پتلونیں لٹکتی دکھائی دیتیں۔ ان کی کھڑی لکیروں والی پتلونیں اور نکٹائیاں۔ ایسے وقت وہ اپنی قسمتوں کو بہتر سمجھنے لگتے اور کہتے۔ "بیچارے بھارگو صاحب! کتنی گنوار بیوی ہے!" پھر رام جانے ان کو کون بتاتا تھا کہ مسز بھارگو ایک وقت پچیس روٹیوں کا ناشتہ کرتی ہے، باسی چاول چائے میں گھول کر پیتی ہے اور دن بھر سٹور کے چوہوں کا شکار کھیلتی ہے —— بھارگو صاحب کو لاکھ سمجھایا لیکن انہوں نے اسی طرح اپنی کئی باتیں کہہ ڈالیں۔ ایک آدمی سے آج ایک بات اور دوسرے سے کل دوسری۔

بہر حال مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ خود بھارگو صاحب کو اپنی بیوی سے بے حد

محبت ہے۔ پانچ بجتے ہی وہ دفتر سے یوں بھاگتے تھے جیسے پانچ بجکر ۵ منٹ پر وہاں بم کا گولہ پھٹنے والا ہو۔ سیدھے اپنے گھر کی راہ لیتے تھے۔ دفتر اور گھر کے درمیان کسی درمیانی منزل کو انہوں نے کبھی پہچانا نہیں تھا۔ ان کی دنیا انہی دو واضح سروں کی تھی۔ اگر دفتر باپ تھا تو گھر ماں۔ دو سروں کے بیچ میں کبھی تیسرا اُمڈتا دکھائی پڑتا تو وہ اُس بچے کی طرح پریشان ہو جاتے جس نے اچانک اپنی ماں کو ایک نئے آدمی سے لپٹتا دیکھا ہو۔ وہ اپنی تنخواہ کی کوڑی کوڑی بیوی کو دیتے تھے۔ کپڑوں کے بھاؤ، درزی کی اجرت سوداسلف کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ ان کا دخل گھر کی کسی بات میں نہیں تھا۔

وہ گھر کی تمام باتیں مجھے بتا دیتے تھے۔ میرے ہر اُلٹے سیدھے سوال کا جواب بلا جھجک دیتے تھے۔ میں انکے کونوں کونوں کو ٹٹولتا تھا۔ وہ کبھی بھی ہچکچائے نہیں۔ نہ کبھی انہوں نے میرے سوالوں کو بُرا مانا۔ چنانچہ اس سرے پر بیٹھے بیٹھے ہی میں ان کے اس سرے والی زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ منظر کتنا خوشگوار تھا۔ ایک گھر جہاں مذاقوں کا تصادم نہیں۔ تھکاوٹوں کے بعد جہاں چین ہے خاموشی ہے نیند ہے۔

پھر ایک دن میں نے دفتر میں ان کے کمرے کی چک اٹھائی اور دیکھا کہ ان کا سانولا چہرہ خون کے جوش سے جامنی ہو رہا ہے۔ ان کی آنکھیں کھڑکی سے باہر آسمان کو گھور رہی ہیں اور دہک رہی ہیں۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ میں نے پہلی نظر میں انکے چہرے پر خونی ارادے سے دیکھے۔ لیکن جونہی انہوں نے میری طرف دیکھا اسی رنگ۔ اور انہی آنکھوں میں میں نے ایک نئی کیفیت دیکھی پھر مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے وہ رو رہے ہوں۔ انہوں نے ایسے سانس لئے جن میں مجھے فلک شگاف چیخیں سنائی دیں۔ عجیب رونا تھا یہ جو شدت کا تھا لیکن تھا خشک اور خاموش۔ اور یہ رونا ایک بچے کا نہیں تھا۔ یہاں تو مہارگو صاحب مجھ سے صدیوں بڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ رونا یا تو اس فلسفی کا تھا جس نے کائنات کی ان گنت گردشوں کو رائیگاں ہوتے دیکھا ہو یا اُس قلندر کا جس نے تنہائی

میں حقیقت کا نظارہ کیا ہوا اور رو رہا ہو کہ خود ایک حقیر قالب میں بند ہے۔ بھارگو صاحب نے جیسے آنسو پی لیے اور میرے سوالوں کے لیے تیار ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کئی بار ان سے ہو چکا تھا۔ یکایک ان کی آنکھوں میں عجیب روشنیاں کڑکنے لگتی تھیں پھر کانوں میں عجیب آوازیں گنگناتی تھیں۔ البتہ عجیب کہ ہوش میں واپس آکر ان کا بیان کرنا مشکل تھا۔ اتنا وہ کہہ سکتے تھے کہ نہ وہ آوازیں اس ہوا کی تھیں۔ نہ وہ روشنیاں آفتاب کی۔ اس وقت ان کو ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ان کی دو ذاتیں ہیں؛ ایک جو اڑ کر ان روشنیوں میں گھل گئی دوسری جو لاچار اپنی جگہ پر روتی رہی ــــــــــ میں وہ باتیں کیا سمجھ لیتا۔ ایک بات جو سمجھ میں آئی یہ تھی کہ میرے ہاتھوں میں بھارگو صاحب نہیں بلکہ ان کی کینچلی تھی۔ ان کی باتوں پر اب پیار کی جرأت کیسے کرتا؟ میں اُن کی تعظیم کرنے لگا۔ رہی ان کی بھولیں۔ گھر سے باہر کی بھول بھلیاں اب بھی انکو چکراتی تھیں؛ راہنمائی کی ان کو اب بھی ضرورت تھی؛ لیکن ان کو راستہ دکھاتے ہوئے مجھے اپنی برتری کا احساس نہیں ہوتا۔ اب میں زیادہ سے زیادہ ایک مستری تھا جو اپنی پیچ دار مشین کی الجھنیں اور سلجھاؤ ایک بہت بڑے شاعر کو سمجھا رہا ہو ــــ"

بدری پھر ایسے خاموش ہوا جیسے اس کی کہانی ختم ہوئی ہو۔ میں نے کہا:

"لیکن بدری........" "لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم سنتے رہو۔" اس نے لہک سے کہا اور اس کے لہجے میں افسوس کی جگہ غصہ آگیا۔

"بھارگو صاحب ایک دن گاؤں چلے گئے۔ جہاں سے انہوں نے مجھے ایک خط بھیجا۔ اس خط نے میرے تصورات کا محل دھپ سے گرا دیا۔ وہی تصورات جو میں نے ان کے گھر کے متعلق باندھے تھے۔ بلا تکلف انہوں نے اپنے گھر کی ایک ایسی الجھن کا ذکر کیا تھا جس کا سایہ بھی مجھ جیسے شکی کے بدترین خیالوں میں کبھی نہ گھسا تھا۔ پھر زندگی کو بوجھ سمجھ کر انہوں نے نوکری سے استعفےٰ ابھی دینا چاہا تھا۔ لیکن میں ان کا استعفےٰ کیا پیش کرتا۔ خط پڑھتے ہی مجھے وہی آگ لگ گئی جو ایک دل والے سرپرست کو لگنی چاہیے تھی۔ اسی دن میں ان کے

گاؤں چلا گیا اور وہاں جاکر دیکھا کہ بھار گو صاحب نے میرے پہنچنے سے پہلے ہی ایک افسوس ناک غلطی کی ہے۔ سارا کنبہ جوڑا تھا اور نقطہ بہ نقطہ تفصیل بھی سنا ڈالی تھی کہ انہوں نے کیا دیکھا اور کیسے دیکھا۔

"کیوں صاحب! یہ لڈو رام مارواڑی پیسے والا آدمی ہوگا؟" آتے ہی مجھ سے ایک عمر رسیدہ آدمی نے پوچھا۔ بھار گو صاحب فوراً بول اُٹھے۔ "ارے یہ کیا جانیں اُن کو۔ اُس کے پاس نانوا بھی کوئی ایسا دیکھے نہیں۔ پھر اس کا کیا قصور؟ بابا جی ہمارے ہاں نانوے کی کونسی کمی تھی؟"

"حد ہوگئی۔ حد ہوگئی" میں نے کہا۔ "بھار گو صاحب آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں یقین نہ کرلیتا۔" اور جو وہاں بیٹھے تھے انہوں نے بھی اسی لیے یقین کیا تھا۔ نہیں تو ان کی بیوی کے متعلق ان کی بھی وہی رائے تھی جو اس وقت تک میرا تصور تھا۔

"حد ہوگئی، حد ہوگئی" میں اس بات کو اپنے دماغ میں جذب کرتا گیا اور بڑبڑاتا گیا ۔ـــــ کس بات کی کمی تھی ان کو۔.......... نہ کھانے کی نہ پینے کی.......... خاوند ہیں تو ایسے مسکین سے۔ کسی بات میں دخل نہیں۔ اپنے لئے کسی چیز کی طلب نہیں........... اتنے سیدھے ...." بڑبڑاتے ہوئے میں اچانک خاموش ہوگیا۔ کیونکہ میرے دل میں ایک شک پیدا ہوا۔ لیکن فوراً ہی مجھے انکے بچوں کا خیال آیا اور میں اب بڑبڑایا نہیں بول اٹھا.........." اور پھر تین بچے بھی.......... حد ہوگئی صاحب .... حد......"

" بھار گو صاحب نے پھر اُس واقعہ کی چشم دید تفصیل سنانی شروع کی۔ اصلی خود رنگ لفظوں میں، وہی ایک بچے کی طرح سیدھی سادھی صاف صاف باتیں۔ وہاں چونکہ کچھ بزرگ بھی بیٹھے تھے میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنا چاہتا تھا اور جب میں وہاں سے اٹھا تو بھار گو صاحب بھی میرے پیچھے باہر آئے اور باہر آکر ایک شاعر کی طرح بولنے لگے۔

"میں ایسا پٹ گیا ہوں بدری پرشاد کہ اب میرا نہ دن کہیں ہے نہ رات۔ میرا گھر ہی اُجڑ گیا دفتر کہاں سے آؤں اور دفتر سے کہاں جاؤں؟ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ دن اور رات کی دو حدوں کو بھول جاؤں گا۔ وقت کے اٹوٹ سلسلے میں کھو جانے کی کوشش کروں گا۔ کناروں کو بھول کر سمندر کی وسعتوں میں بہتا پھروں گا.........."

اس دن وہ خوب بولے۔ میں نے جس بھی نکتہ نگاہ کو ظاہر کرنا چاہا۔ اسی پر انہوں نے میرا سلسلۂ کلام چھین کر تقریریں کیں اور مخالف نتیجے ثابت کئے۔ 'جذبات' غیرت اور وارفتگی کی نفسیات پر فاضلانہ باتیں کیں اور استعفےٰ دینے پر تلے رہے۔

"بہر صورت بھارگو صاحب" میں نے آخر میں کہا۔ "ایک عورت کے پیچھے اپنا تمام ٹاٹ الٹ دینا کہاں کی دانائی ہے؟ عورت نے وفا نہیں کی اس کو اپنی قسمت پر چھوڑیئے۔ اس کی بے ایمانی کا اعلان کیجئے اور اپنی آزادی حاصل کیجئے۔ مزے لیجئے دنیا کے۔ دنیا میں اور مزے کم ہیں کیا؟ ایک جوں کے مارے کرتہ بھی پھینکنا کونسی مردانگی ہے؟" بھارگو صاحب نے اس جوں والی تشبیہ کی داد دی۔ پھر وہ میری باتیں بھی ماننے لگے اور شام تک ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ نوکری چھوڑنا بے وقوفی ہے اور یہ کہ اگر اس بات کو چھپایا گیا لوگ نہ معلوم کیا کیا قیاس لگائیں گے اس لئے باضابطہ اعلان کیا جائے اور اس عورت کو گھر سے باضابطہ نکالا جائے۔ پھر بھارگو صاحب نے وعدے کئے کہ وہ خوب کتابیں پڑھیں گے۔ سینما دیکھیں گے اور سوسائٹی جتنی دلچسپیاں مہیا کرتی ہے ان کا لطف لیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم دونوں دفتر میں حاضر تھے۔"

"پھر وہ عورت کہاں گئی؟" میں نے بدری کو روک کر پوچھا:۔

"اس کا بھائی بھی اس دن گاؤں میں بلایا گیا تھا وہ اس کو اسی دن اپنے گھر لے گیا۔ میں نے اس عورت کو کبھی نہیں دیکھا تھا نہ مجھے اب اس بات کا شوق تھا کہ میں ایسی عورت کو دیکھ لوں۔ مجھے اس کے بھائی سے بھی نفرت ہوئی جس نے بے حد بدکلامی کے ساتھ

بھارگو صاحب کی پیش کشوں کو ٹھکرادیا۔ بھارگو صاحب چاہتے تھے کہ بیوی اور بچوں کے لئے مناسب خرچہ بھیجتے رہیں لیکن اس آدمی نے نہیں مانا ـــــــ بہر حال بھارگو صاحب دھیرے دھیرے نئی زندگی میں مصروف ہوتے دکھائی دیئے اور میں بھی اپنے ذمہ کا کام کامیابی کے ساتھ نبھانے لگا۔"

بدری اس نقطے پر اچانک رُک گیا اور آنسوؤں کے ساتھ کش مکش کرنے لگا۔ "کون سا کام تھا تمہارے ذمہ کا؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"بتاتا ہوں" بدری نے وہ آنسو جو نکل ہی آئے تھے پونچھ لئے اور کہا:۔ "جوش و خروش اور ترکیب سے میں ان کی بیوی کی باتیں جس تس کو سُنانے لگا۔ سناتے سناتے میرا حال یہ ہوا کہ خود میرے دل کو بھی ایک ڈائن کا سایہ دہلانے لگا۔ میں نے اسکو کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن اس اَن دیکھی عورت کی ایک ایک حرکت، اس کی ایک ایک نظر میرے دل میں مجسم موجود تھی۔ کتنے لوگوں کو میں نے سنایا۔ کتنی کتنی بار، اور سنایا بھی اس فن سے کہ دنیا میں بات جم گئی اور جس نے بھی بات سنی اسی نے بھارگو صاحب کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ان کو شہید مان لیا۔ پھر وہ دن بھی آیا کہ بھارگو صاحب کو دیکھ کر میرا جی خوش ہوتا تھا کہ صحیح قسم کے لباس اور صحیح قسم کے انداز میں چلنے لگے تھے۔ اور میں ہی کیا سب لوگ ان کو دعائیں دیتے تھے کہ اس چوہے مار عورت کا سایہ ان پر کبھی نہ پڑے۔

"لیکن بھارگو صاحب ایک صبح گھر سے غائب ہو گئے۔ ہم نے بہت تلاش کی پر ان کا پتہ کہیں نہ مِلا۔ اس دفعہ نہ تو انہوں نے کسی کو چھٹی لکھی۔ نہ دفتر میں استعفےٰ ہی بھیجا۔ بس غائب ہو گئے اور جب کئی روز ہم نے انتظار کیا اور وہ نہ آئے سب نے مل کر نہ صرف اس عورت کو بلکہ صنف بھر کو خوب گالیاں دیں۔

"او ہو سمجھ گیا" میں نے بدری کی خاموشی کو پھر غلط سمجھ کر کہا۔ "یہ جو عورتیں کمرے سے نکلیں........"

"نہیں۔" بدری نے مجھے وہیں روکا۔" ابھی کہانی ختم کہاں ہوئی جو تم کڑیاں ملانے لگے۔ بھارگو صاحب کا اس طرح غائب ہونا کیا عجیب نہیں تھا۔ میں اس واقعہ کو چپ چاپ کیسے قبول کرتا؟ یہ پتہ لینے کے لئے کہ کہیں انکی بیوی یا ان کے سالے نے ان کا پیچھا کیا ہو یا ان کو پریشان کسی اور طرح کیا ہو۔ میں ایک دن ان کے محلّے میں چلا گیا اور ان کے پڑوسیوں سے پوچھ تاچھ کی ٹھان لی محلے میں میں نے ایک دروازے پر دستک دی اور میری حیرانی کی حد نہ رہی جب دروازہ میرے پرانے ہم جماعتی گیانی نے کھولا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے چلّا اٹھا۔

"ابے تو یہاں کیسے؟ پھر تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں رہتا ہوں؟" اور جب میں نے بھارگو صاحب کا ذکر کیا۔

"کون؟ ارے یہ تو نہیں سالا بھارگو جو بھاگ گیا"؟ گیانی زبان سے وہی سکول کا لڑکا تھا۔

"ہاں وہی بھارگو صاحب جن کی بیوی .... اس کی اصلاح کرتے ہوئے میں نے اپنی رٹی ہوئی کہانی شروع کرنی چاہی۔ لیکن گیانی نے مجھے بولنے نہیں دیا۔

"ابے وہی وہی، وہ تو بڑا حرامی تھا........"

"میں نے پھر کوشش کی کہ اس کو روکوں لیکن اس نے میری ایک بھی نہ سُنی کہتا گیا کہ اس جیسا فریب کار، ظالم اور جلانے کیا کیا کبھی نہ دیکھا۔ یہ کہ بیوی کو دو سال پیٹتا رہا۔ پیٹ پیٹ کے اس کو پنجر بنا دیا۔ اُسی کو کہ دیوی تھی جس نے منھ سے کبھی آواز تک نہ نکالی۔ ایک بار گھٹنا توڑ دیا کم بخت نے اس کا۔ بچاری نے پڑوس والیوں کو کہا کہ خود سیڑھیوں میں لڑھک گئی تھی۔

"اس کی تو جان کے پیچھے پڑا تھا کم جات" گیانی کی بیوی چائے کی پیالیاں میز پر رکھتے ہوئے کہہ گئی اور جب میں نے ان کو سمجھانا چاہا تو گیانی طیش میں آ گیا۔ "یہی تو بات ہے بیٹا کہ اس نے تم جیسوں کو اُلّو بنا رکھا تھا۔ سنا ہے کہ اس کے دفتر والے اس سے محبت کرتے تھے۔

حرامی ہوں گے وہ بھی۔ سب کے سب اس کی مدد کر رہے تھے۔ تین چھوٹی چھوٹی بچیوں اور ایک سیدھی سادھی عورت کا خون ہوا۔ محض اس لئے کہ بھارگو سالا ایک فیشن ایبل بڑھیا کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"بڑھیا ہی تو۔ اور کیا؟ چالیس کے پیٹے میں ہوگی وہ بھی۔" اس کی بیوی نے کہا۔

"سالے دفتر والے اس انتظار میں ہوں گے تاکہ دُلہن کے ساتھ انگریزی میں بات چیت کرینگے۔ یہ بھی ایک مرض ہے آجکل۔ انگریزی بولنی آتی نہیں سالوں کو۔ بس عورت کے ساتھ دو لفظ سیدھے ٹیڑھے بولے جیسے ساتویں آسمان پر بیٹھے۔ اکیلا میں ہوتا نا دفتر میں بدمعاشوں کو مزا چکھاتا.......۔"

"گیانی!" میں نے چیخ کر کہا "میں بھی تو اُسی دفتر میں ہوں۔ تم کس عورت کی بات کر رہے ہو؟"

"ہیں؟ تو تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا؟"

"گیانی۔ وہ عورت نہیں ہے۔ وہ ڈائن ہے۔ وہ تو پکڑی گئی۔ وہ......"

گیانی اور اس کی بیوی دونوں ہنس پڑے اور انہوں نے مجھے بدھو پکارا۔ پھر انہوں نے بھارگو صاحب کے متعلق دہشت ناک کہانیاں سنا ڈالیں اور جب انہوں نے مس ماتھر کا نام لیا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ نام میں نے بھارگو صاحب کے مُنہ سے کئی بار سنا تھا۔ گیانی بولتا گیا۔

"خاوند کی تلاش میں بوڑھی ہوگئی تھی۔ کوئی اور نہیں ملا تو اسی کو چمٹ گئی۔ اس کے غازول نے اور انگریزی لہجے نے سالے کو اندھا کر دیا تھا۔ اسی کے لیئے راستہ صاف کرنا چاہتا تھا۔ پھر ہوگئی سالے سے بُری۔ بڑھیا نے کسی اور لونڈے کو ٹانچا۔ یہ لونڈا اس کے دفتر میں نیا نیا آیا تھا۔ آریہ مندر میں جھٹ پٹ انکی شادی بھی ہوئی۔ اور یہ سالا گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ کیونکہ بیوی کو تو بدنام کر چکا تھا اور گھر سے نکال چکا تھا۔ اب بھاگ نہ جاتا تو کیا کرتا؟"

"میں اپنے ماتھے سے پسینے پونچھنے لگا اور گیانی سگریٹ کا کش لگا کر اُچھل سا پڑا۔

"اور ہاں یہ لڈو رام کی بات بھی اُسے خوب سوجھی تھی۔ اپنی کہانی کے لئے آدمی بھی اس نے خوب چن لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ محلے بھر میں یہ آدمی کم زبان ہے۔ کیا بولے گا مقابلے میں۔ پھر آدمی ہی وہ ہے کہ ایسی جھوٹی بات کا مشتہر ہونا ہی پسند کرے گا۔ تردید کیا کرتا وہ، وہ چاہتا کہ لوگ اُسے چھپا رستم سمجھنے لگیں۔ وہی لوگ جو اسے بے کار سمجھتے تھے۔"

"پھر گیانی نے مجھے پورا یقین دلانے کے لئے بیوی کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا ناٹک رچایا۔ میاں بیوی نے کانا پھوسی کی اور بیوی گھر سے باہر چلی گئی۔ گیانی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اپنی سیڑھیوں میں کھینچ کے لے گیا۔ وہاں ان کی دیوار میں ایک جالی سی کٹی ہوئی تھی۔ مجھے اس نے وہیں کھڑا کیا اور اشاروں سے خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ جالی کے دوسری طرف لڈو رام کا کمرہ تھا۔ جس میں اب گیانی کی بیوی گھس رہی تھی۔

"رام رام جی! کیا کر رہی ہو؟"

"رام رام بی بی۔ تم تو آوہی نہیں۔ آج کیسے راہ بھولیں؟"

پھر گیانی کی بیوی نے قصداً بھار گو صاحب اور ان کی بیوی کی بات چھیڑ دی دونوں نے بھار گو صاحب کو کوسنے دیئے اور ان کی بیوی کو مہادیوی پکارا۔ پھر گیانی کی بیوی نے شرارت سے لڈو رام کی بات چھیڑ دی۔

"جیجا جی کہاں ہیں جی جی؟"

"ارے ہونگے وہیں دکان پر اور ان نے کا منہہ جانا ہے؟

"تم تو جی جی ان سے نراج ہی رہتی ہو۔"

"ارے میں تو بہت تنگ ہوں بہن۔ تجھے تو مجاک سوجھے ہے۔ تم تو بات مدرت کی کردنا۔ بس مجاک کری جاؤ۔ کتنی بار کہہ چکی ہوں تجھ سے کہ بی بی کہہ دے میاں سے یہ ذری سی بات۔ پر بی بی کون کسی کی کیا مانتے؟"

"گیانی کی بیوی کی آواز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ہنسی دبا رہی ہے۔

"جی جی میری جبان سے یہ بات نکلے نا۔ نگوڑی بات ہی تو ایسی ہے۔ ایسی بات کبھی بھی نا جائے۔ یہ بھی میری تو ہنسی چھوٹ جائے۔ وہ پوچھیں ہوا کیا میں ہنستی جاؤں۔ وہ دوڑیں مجھے پکڑنے کو۔ میں بھاگوں وہ پکڑیں تو جی جی وہ بات ان کو بھول جائے اور مجھے بھی۔ پھر دیکھو اگر یاد بھی آوے مجھ سے تو کبھی نا جائے"

"کبھی نا جاوے؟" لڈورام کی بیوی جل اٹھی۔ "اتنی سی بات دولیے سے کبھی نہ جاوے؟"

"مجھ سے تو کبھی نہ جاوے بھائی۔"

"جی ہاں کون کسی کی مدت کرے ہے میں تو......... میں تو........" وہ رونے لگی۔

"میری تو جندگی ناس ہو گئی۔ ماں ہوتی تو ایسا بیاہ ہی کیوں ہوتا؟ بیاہ نا مٹی......" پھر اپنے باپ کو کوسنے دینے لگی۔

"گیانی کی بیوی کی آواز میں سنجیدگی آ گئی۔ "جی جی پتا کو کیوں کوسے ہے؟ ان کو کیا مالوم تھا۔ کسی کو کیا الوم دے۔ ماں باپ تو بس اتی سی بات دیکھیں کہ ہٹا کٹا آدمی ہے۔ کوئی نکش نہیں۔ پھر کمائی بھی چنگی ہے۔ تیری ماں کو ہی وہ بات کیسے پتہ لگتی؟"

"کاہے نہیں؟ مائیں تو پہلے گلی گلی پوچھ لیں۔"

"مجھے تو بہت افسوس لگے ہے جی جی۔ پر بھگوان کی باتوں میں کوئی کیا کرے۔"

"اری جی بی بھگوان نے روگ دیئے ہیں۔ پر ان روگوں کے الاج بھی تو دیئے۔ وہ تو الاج کرواوے نا۔ میں پوچھوں تم نے بیاہ کروایا کیوں۔ الٹا پوچھے کیوں ری تجھے کھانا پینا نہیں ملتا؟ کپڑا نہیں ملتا؟ بک بک کرتی جاوے۔ بہن میں بڑی تنگ ہوں۔ دیکھ میرا ایک بھی جایا ہوتا تو میں نام نہ لیتی۔ میں کہوں ہوں وہ مائیں کون ہوتی ہیں جن کے دس دس بچے ہو دیں۔"

"جی جی بچہ تو ہمارے بھی نا ہے۔" گیانی کی بیوی شرارت پر تلی ہوئی تھی اور واضح باتوں کو اور واضح کرانے میں طوفان کی ادا کار ثابت ہوئی۔

"پر تجھے تو آس ہے نا۔ کدی ہو ہی جاوے گا۔ یاں تو........"

پھر ہچکیوں کی آواز آئی اور .... "دیکھ بی بی۔ دیکھ۔ میں ہاتھ جوڑوں ہوں۔ تو ہی تو ایک ہے میری کہہ دے دولہے سے کہ کوئی دوائی لا دیں ان کے لیے۔ اچھی کہہ دو........"

بدری بولتے بولتے پھر رُک گیا۔ میری طرف نفرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اس لئے کہ میں کہانی کا لطف لینے لگا تھا اور میں ہنس رہا تھا۔ کہانی کو پھر شروع کرتے ہوئے اس نے پہلا لفظ میری طرف ایک پتھر کی طرح پھینک دیا۔

"میں گیانی کے گھر سے ایسا نکلا جیسے سو بید لگوا کے نکلا تھا اور جب چند دن میں دفتر نہ جا سکا دفتر والے یہ سمجھنے لگے تھے کہ میں بھارگو کی تلاش میں لاپتہ ہو گیا ہوں۔"

کہانی اب ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ بدری نے اپنی آواز دھیمی کی اور کہا۔

"اس واقعہ کو آج پانچ سال ہوئے ہیں اور یہ کہانی دلوں سے نکل چکی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس محلے کی بیویاں اپنے خاوندوں کو شرمندہ کرنے کے لئے "بھارگو" کے نام سے پکارتی ہیں اور خاوند اس نام سے اتنا ڈرتے ہیں کہ براہِ راست گالیوں کو اس پر ترجیح دیتے ہیں۔ اور مجھے جب کبھی اُس ان دیکھی عورت اور اُس کی تین بچیوں کا خیال آتا ہے مجھے کچھ ایسا احساس کاٹے جاتا ہے جیسے میں نے ایک قصائی کے چھُرے تیز کر دیئے ہوں جن سے ان چار معصوموں کی گردنیں اس قصائی نے کاٹ دی ہوں۔"

"لیکن بدری اس کہانی کا کمرے سے......."

"تعلق کیوں نہیں پگلے۔" بدری نے خوف زدہ آنکھیں کھول کر کہا "کمرے میں یہ کون ہے یہ کس کے مزے آ رہے ہیں؟ یہ کس کے بہروپ رہے ہیں؟ بھارگو صاحب ہی تو برہمچاری ہو گئے ہیں۔"

تحلیل نفسی کا نوٹ بک میرے ہاتھوں سے گر پڑا اور اُسی وقت بابو جی بھی پھاٹک کی طرف آتے دکھائی دیئے۔ غصے میں لال پیلے ہو رہے تھے۔ آتے ہی انہوں نے ہم دونوں کو بے دین پکارا اور اس بات پر کہ ہم نے ایسے بڑے مہاپرش کے درشن نہیں کئے تھے۔ بہت بگڑنے لگے

اس معمولی سی بات پر انہوں نے بدری کو گالیاں بھی دیں اور میں شدت کی بے عزتی محسوس کرنے لگا۔ لیکن ابھی میں اسی حیرانی میں خاموش تھا کہ بابوجی کو بھی یہ کیا ہوگیا ہے کہ بدری نے میرا ہاتھ کھینچ لیا اور مجھے الگ لے کر کہا۔

"مجھے یہ افسوس ہے بھائی کہ تمہیں تحلیل نفسی کا الف بے نہیں آتا ـــــ آتا ہوتا تو بابوجی کے غصے کی نفسیات سمجھ چکے ہوتے۔ دیکھو بابوجی نے ابھی ابھی ایک نئی بات دیکھی ہے۔ ایک نیا تجربہ حاصل کیا ہے۔ نئے تاثر میں انہوں نے مجھے اپنے سامنے مجسم دیکھا ہے۔ میں ان کا بیٹا ہوں اور ان کی شادی ہوچکی ہے ان کا خیال ہے کہ وہ اب برہمچاری نہیں بن سکتے۔ مجھے گالیاں نہ دیں اور کیا کریں؛ دیکھو میں ان کو درست کئے دیتا ہوں۔ میں ان کو یہی کہانی سُنا ڈالوں گا۔ تاکہ وہ اپنی غلطی درست کرلیں۔ اور یہ سمجھیں کہ آدمی کبھی بھی برہمچاری بن سکتا ہے۔"

کوفتہ

شہر میں ڈھنڈورا پٹ گیا کہ گھاسی رام کا بیٹا بابو مسلمان ہوگیا۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں۔ طرح طرح کی کہانیاں گھڑی گئیں اور اپنی برادری کے بنیوں نے ہی دکان دکان سے گھاسی رام کی یہ بات باتیں ملا ملا کر مشتہر کی۔ اڑیل مہاجن گھاسی رام، چوٹی کا رئیس، آج تک بیوپار کے ایک بھی مقابلے میں کسی نے پچھاڑا نہیں تھا۔ پیسہ تھا، عزّت تھی، برادری میں نام تھا اور اب یہ حال تھا کہ حویلی میں دبکے رہے۔ پھر دبی بلّی چوہوں سے کان کٹواتی ہے۔ گماشتوں سائیسوں تک کو بُلا بُلا کر جھینکتے رہے۔ وہ جو غیر ہی تو تھے۔ ذرا بھی نہ پسیجے۔ وہی جو اتنے زبان دراز تھے اب خاموش تماشہ دیکھتے رہے۔ کسی نے الٹا سیدھا راستہ ہی سُجھایا ہوتا۔

یہ لب سالمی ٹٹ پونجیے تک ان کے خدمت گاروں پر آوازیں کستے رہے۔ کوئی پوچھتا تھا لالہ کیا حج کو چلے گئے؟ کوئی پوچھتا تھا لالہ نے "مصلے" منگوایا ہے کیا۔ طرح طرح کے جملے اور جملوں

کے بعد پچر پچر تھوکتے تھے۔ گوشت کو چاہے کسی بھی بے ضرر نام سے پکاریئے، زبان دانتوں میں تصور آہی جاتا ہے۔ مگر یہ تھوک نہ گوشت پر برستا تھا۔ نہ گوشت خور بابو پر۔ جیسے یہ گناہ لالہ نے ہی کیا تھا۔ موقع وہ تھا کہ لالہ سے ہمدردی کی جائے تدبیریں بتائی جائیں۔ اسے لوگ صلواتیں سناتے رہے۔

کئی دن تک لالہ دکان گئے ہی نہیں۔ دلالوں نے انہیں گھر آپکڑا۔ بڑے حضرت ہوتے ہیں یہ دلال۔ کاروبار کی باتیں تو رکھ دیں طاق پر۔ وہی بات چھیڑ دی اور جھوٹے آنسو بہا کر لالہ سے تفصیل سُن لی۔ بابو مسلمان نہیں ہو گیا تھا۔ مگر مرے نے گوشت کا منہ کیا تھا۔ ایسی بری چیز کی کم بخت کو چاٹ لگی تھی۔ چھوڑنے کا نام نہیں لیا تھا۔ لالہ پرائشچت پر روپیہ لگانے پر آمادہ دیوتاؤں کی ہر طرح خوشامد کرنے پر۔ اُن کی یہ صلاح کہ عزیزوں کو توبہ کے شکرانے میں کھیر پوری بانٹی جائے۔ مگر توبہ کرنے والا تو کوئی ہو۔ بابو خاندان کا ناس کر رہا تھا۔ بلکہ سات پیڑھی کے روحوں کا، سننے والوں نے حیرانی ظاہر کی اور لالہ سناتے رہے۔ پھر ایک بولا۔ "بابو کیا سٹری ہو گیا ہے جو بکرے نگلنے لگا۔" انہوں نے تفصیل شروع کی۔ بابو غنیا کھا گیا تھا۔ اسے کھلوا دیا گیا تھا۔ پھر ایک اور بولا "بابو ایسا گدھا نہیں پہلے اُلّو کا گوشت کھلایا ہے کسی نے۔" پھر تیسرا بولا "لالہ بابو کی فصد کھلوا دو۔ کسی اچھے حکیم کا علاج کرواؤ۔"

ادھر لالہ بابو رام اپنے رنگ میں مست مچل مچل کے کھا رہے ہیں۔ دکھا دکھا کے۔ کسی نے اگر ذرا بھی اشارہ کیا۔ یا ابھی بولنے کو منہ کھولا۔ وہ دکان پر آ جمے اور کھلے بندوں چٹخارے بھرتے اسی چیز کی تعریف کرنے لگے۔ "میاں چٹورا کون نہیں پھر جب لذت ڈھونڈو تو پوری کچوری میں کیا دھرا ہے۔ اپنی قسم ایک بار تلپھٹ بھی چاٹ لو۔ زبان ہو تو دنگ رہ جائے، نام بھی نہ لو گے اور چیز کا۔ چھی چھی چھی! پوری کچوری اور آلو چھولے! یہ بھی کوئی کھانا ہے؟ اندھے ہیں یہ بنیئے۔ میاں کھاؤ تو چیز کھاؤ۔۔۔۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ اطمینان سے ٹیک لگاتے تھے اور وہ چاندی کا سگرٹ کیس ٹپ سے کھولتے تھے۔ لمبے لمبے گٹھے گٹھے عبداللہ کے سگریٹ دکان دار

کے منھ میں پانی لاتے اور جو بیٹھے ہوں، کھڑے ہوں، انکے بھی تو منھ ہی تھے۔ سگریٹ ایک ایک نکالے جاتے۔ خاموشی چھا جاتی۔ ہونٹوں، نظروں کے زاویئے بدل جاتے اور جو کچھ بابو رام کہتے دلچسپی کے ساتھ سنا جاتا۔

بابو رام ان لوگوں پر ترس کھاتا تھا۔ ناواقف تھے۔ محروم تھے۔ خود بابو کچھ دن پہلے انہی آدمیوں جیسا تھا۔ بھلا ہو ان کشمیریوں کا جنہوں نے کشمکش کی، بابو کی آنکھیں کھول دیں۔ پھر محنت سے پکایا، محبت سے کھلایا۔ سراسر مہربانی تھی ان کی۔ نہیں تو ان کو غرض کیا تھی۔ پھر یہ کشمیری ایسے ویسے تو تھے نہیں۔ مشہور تھی ان کی یہ بیٹھک۔ راجوں، رئیسوں کے جشن میں یہی پنڈت تو جاتے تھے۔ یہ جو کھانے تیار کرتے تھے، ان کے چکھنے کو پہلے زبانیں ہوں پھر تیتیں۔

یہ کھو بابو رام پڑوس میں رہتا تھا۔ پھر رنگیلا جوان تھا۔ اچھی سے اچھی وہ بھی پی لیتے تھے اور جب بابو نے پلائی پھر وہ اس کے بغیر پیتے ہی نہیں تھے۔ پیتے اکٹھے تھے وہی گلاس ٹکرا کر، مگر اُن دنوں بابو اور ان میں ایک خلیج تھی۔ اتنی ہی چوڑی جتنی تیل میں تلی ہوئی دال سیو اور گھی کیسر اور کشمیری مسالوں میں پکے ہوئے کوفتوں میں ہو سکتی ہے۔ شراب جیسی امرت اور اس کے ساتھ دال سیو! ہے بھگوان یہ بابو رام بھی کیسا انکھڑ تھا اُن دنوں، یہ کشمیری ان لمبے لمبے رنگے ہوئے سیو کے ٹکڑوں کو دیکھ کر کیوں نہیں ہنستے تھے۔ خود بابو کو اب سیو دیکھتے ہی ابکائیاں آتی تھیں۔

غرض اب بابو رام کے ٹھاٹ تھے اس نے الغاروں کوفتے ہی نہیں کھائے "کبر گاہ" "طبق ناٹ" "گوشتابہ" "شفتہ" سینکڑوں ہی نئے ناموں کے۔ نئے رنگوں کے۔ نئی نئی لذتوں کے گوشت چکھے۔ کھا کھا کے گوشت کا متوالا ہوا۔ اس حد تک کہ کٹورے بھر بھر کے ڈھب ڈھب قلیہ تک زبان چاٹ چاٹ کے غٹک جاتا تھا۔ برادری میں نئے راز یہ نئی ترکیبیں مفت بتلانا چاہتا تھا۔ وہ عوام کی مخالفت سے کیسے ڈرتا؟ اس کے پاس ایک نیا نظریہ تھا۔

بدقسمت تھے لالہ گھاسی رام جن کا کھانا حرام ہو گیا۔ انہوں نے دحشت کی لی۔ اور بےبس

پڑے رہے۔ دن رات کروٹیں بدلتے رہے اور کروٹوں کے ساتھ تدبیریں۔ کبھی یہ ارادہ کہ "ایسی ڈپٹ دوں کہ گھر کی دیواریں ہلیں" لیکن کئی بار ہلا چکے تھے۔ پھر یہ ارادہ کہ "للو پتو سے کام لوں۔ خوب مثالیں سناؤں۔ بزرگوں کی باتیں ——— پھر اپنے لڑکپن کی کہانیاں، ناتجربہ کاریاں۔ الھڑپن کی شوخیاں۔ پھر وہ کڑوے تجربے۔" لیکن وہ سناتے کس کو؟ بابو نے تو ان کا کلیجہ پکا دیا تھا۔ یہ جس طرز میں شروع کرتے تھے اسی طرز کو بابو کمال تک پہنچا دیتا۔ بُرا ہو اس تعلیم کا کتنی تیز اس کی زبان چلتی تھی۔ الٹا باپ کو انجان کہتا تھا اور ایسے سمجھانے لگتا جیسے دادا پوتے کو۔ گھاسی رام بے چارے غصہ پیتے جاتے یہاں تک کہ ان کا کلیجہ سلگ اٹھتا اور وہی ان کی دیواریں ہلاتی ہچکی نکل آتی اور بابو اڑن چھو ہو جاتا۔

ان کی حالت اب وارفتہ تھی۔ پھوٹ پھوٹ کے رونا بھی بے سود رہا۔ اشک شوئی کے لئے کوئی آیا ہوتا۔ دنیا کتنی بے رخ تھی اب مونچھیں جو اکھڑ چکی تھیں کسی کو خود ہی بلانا چاہا۔ مگر بلاتے کس کو؟ مدن لال کے کمرے پر ہی یہ سب مسکوٹ ہوتے تھے۔ کروڑی مل تو پرانا بیری تھا۔ پھر لوہے والوں کی تجویز تھی کہ اس معاملے میں پنچایت بلائی جائے۔ اب ایک سورج بابو تھے۔ لیکن وہ تھے کالستھ۔ کالستھ تھے پر گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا۔ برادری کے آدمی نہ سہی۔ گلی میں تو وہ بھی رہتے تھے۔ پھر ان کا کافی رسوخ تھا۔ تھانے میونسپلٹی میں ایک ایک کو جانتے تھے۔ اُن سے یہ ایسے ویسے لوگ بہت ڈرتے تھے۔

سورج بابو نے کسی رئیس کو ہچکیاں لیتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جب گھاسی رام بولے۔ "سورج بابو میری عزت بچاؤ۔ جا کے ان باورچیوں کو سمجھاؤ۔ نہ سمجھیں تو پولیس کی دھمکی دو۔ نہ ڈریں تو رشوت دو۔ میں ناتواں لگانے پر تیار ہوں۔ میرا یہی تو ایک پھوسڑا ہے۔"

دوسرا دن تیوہار کا تھا۔ صبح گیارہ بجے کے قریب سورج بابو بیٹھک پر آ ڈٹے۔ کشمیری گھر مہمان آئے جیسے بھگوان پدھارے۔ دوڑتے ہوئے زینوں میں آئے۔ مست آدمی تھے۔ بازو

پھیلا پھیلا کے خوب ملے۔" آؤ میرے راجا خوب آئے۔ بڑی عنایت کی داتا۔ ارے ہم تو آگئے ناتھ نہ پیچھے پگاہ اور تم ہوئے چودھری۔ چلے آؤ بڑے بھائی۔ پیتیلیاں ابل رہی ہیں۔ بکر قصاب کی داد دیتا ہوں۔ بیٹے نے روح خوش کر دی آج مال وہ مارا تھا.........." سورج بابو ان پھکڑ باتوں سے بہت کسمسائے۔ اپنے کاندھوں کو بھگت رام کے ہاتھوں سے چھڑا کر اس کی بات کاٹ دی۔ ایسے انداز میں کہا کہ غصہ بھی ظاہر ہو اور مذاق بھی۔" کیوں جی صبح صبح ہی پی بیٹھتے ہو۔ انٹ کی سنٹ بکنے لگے۔ میں یہ مال دال کب چھوتا ہوں؟" بھائی ابھی کہاں پی لی۔ ہم جب پیتے ہیں تو سب سالوں کو دکھا دکھا کر۔ باپ میرے۔ یہاں تو کسی لاٹھ کی پروا نہیں۔" سورج بابو نے فوراً مصالحت کی آواز میں کہا۔" ارے بھلے آدمی جانے دو ان چٹورپن کی باتوں کو۔ تم تو میاں سفئی ہو۔" (پھر ایک بناوٹی قہقہہ لگا کر) " تمہیں تو ہر وقت یہی دُھن رہتی ہے۔" (پھر دھیمی اور سنجیدہ آواز میں) " میں ایک بہت ضروری کام سے آیا ہوں۔ تم سے باتیں کرنی ہیں۔ لمبی باتیں۔"

" اد ہو! لمبی باتیں! تو تو میں ذرا فارغ ہو کے آتا ہوں۔"

گاؤ تکیے پر کمر لٹکاتے ہی آپ کو حقے کی طلب ہوئی۔ مگر یہ کشمیری خود گڑ گڑاتے ہوئے کش لگائیں اور دوسرے کو چلم پکڑائیں۔ کسی غیر ذات کی مجال نہیں تھی کہ نَے کو ہاتھ بھی لگائے۔ بھگت رام کا ایک آدمی سگریٹ کی ڈبیا رکھ گیا اور سورج بابو نے اسی سے کام چلایا۔ الٹی گنگا بہا رہے تھے یہ لوگ۔ سورج بابو نے سوچا۔ کھائیں بکرے اور ادھر کے برہمن کو بھی اچھوت مانیں۔ یہ آدمی کئی تھے۔ بھگت رام کے مسٹنڈے۔ کتنا گوشت کھاتے ہوں گے یہ!

اتنے میں ایک آدمی نے بغل کا دروازہ کھول دیا۔ جیسے ایک مندر کا دروازہ کھل گیا ہو۔ وہی دھوپ، دیپ چندن اور پھولوں کی مرکب خوشبو چاروں طرف پھیلی۔ سورج بابو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے رہے۔ چاندی کی مورتیاں۔ کیسر کے ٹیکے۔ زرق برق کپڑے۔ یہ چھوٹا سا مندر یہاں کیسے؟ ہے بھگوان۔ تمہیں حویلیوں میں نہیں دیکھا۔ رئیسوں کے گھر

ہیں۔ پجاریوں کے نہیں ادھر بیٹھک میں کیسے؟ گوشت کے اتنے نزدیک!

اتنے میں بھگت رام اور اس کے آدمی مورتیوں کے سامنے آ بیٹھے۔ اور پوجا شروع ہوئی۔ تیوہار کی خاص پوجا تھی آج۔

سورج بابو کو اپنے دھارمک گیان پر ناز تھا۔ بہت کم ہندو ہوتے ہیں۔ جنہوں نے رامائن۔ مہابھارت۔ بھگوت گیتا۔ بھاگوت کی کتابیں بھی پڑھی ہوں۔ رام لیلائیں جو ہر سال ہوتی ہیں۔ سورج بابو کا یقین تھا۔ یہ نہ ہوتیں تو سو میں سے ننانوے کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ دشرتھ کون تھا۔ خود سورج بابو نے کئی اور کتابیں پڑھی تھیں مگر انہوں نے بھی سنسکرت نہیں پڑھی تھی۔ ان مسٹنڈوں آتشزنوں نے کیسے پڑھی تھی؟ انہوں نے تو ایک آواز میں سنسکرت کے لمبے لمبے اشلوک گانے شروع کئے۔ بے حد حیرت کا مقام تھا یہ سنسکرت کے اشلوک۔ پھر ان کی آواز بھی میٹھی نکلنے لگی۔ بڑی میٹھی۔ سورج بابو بے چین سے ہونے لگے۔ کیونکہ اب وہ مسٹنڈے گہرے قسم کے بھگت دکھائی دینے لگے۔ اشلوک پر اشلوک، طرز پر طرز اور مورتیوں پر پھولوں کے ڈھیر۔ سورج بابو سے تخت پر بیٹھا نہیں گیا۔ دروازے کے اندر جگہ نہیں تھی۔ باہر ہی آ بیٹھے۔ پہلے ان کا بدن ہلنے لگا پھر ہاتھ بجنے لگے اور پھر جب ہون ہونے لگا تو مسٹنڈوں کے ساتھ بے اختیار ان کا بھی وہ لمبا سریلا "سواہا" نکلنے لگا۔ بھگت رام نے چمچہ گھی سے بھرا۔ کچھ بولے۔ ان کے پیچھے سب نے "سواہا" بولا اور گھی کا چمچہ آگ میں گرا۔ یوں ہون ہوتا رہا۔ گھی اور میوے جل چکے۔ شراب اور کلیجی کا ہون شروع ہوا۔ آگ میں سے دیوتا بھڑک بھڑک کر شراب اور کلیجی چھینتے گئے اور سورج بابو برابر سواہا کرتے گئے۔

ہون ہو چکا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ شانتی کے آخری اشلوک سورج بابو کی نس نس میں گھسنے لگے اور جب وہ آخری سجدہ ہوا۔ سورج بابو نے بھی اپنی ہتھیلی آگے کی۔ شراب کا چمچہ لیا۔ "ہری اوم" اور پی لیا۔ پھر جب وہ پیچھے مڑے دوسری ہتھیلی آگے آ رہی تھی۔ ان کے پیچھے نہ معلوم کب سے بابو رام بیٹھا تھا۔

پھر پرشاد کو چونکہ ٹھکرانا پاپ ہے اور چونکہ کشمیری ترکاری بھی خوشبوئیں ایسی اڑاتی رہتی ہے کہ گناہ بھی ہوتی ہیں اور لپا کرنے والی بھی۔ سورج بابو کچھ کچھ پرشاد کی عقیدت میں، کچھ کچھ خوشبو کے جبر سے مجبور ہوئے اور انہوں نے گوشت چاول کھا لئے۔

"پنڈت جی" سورج بابو نے کہا "میں آپ سے یہ پوچھنے آیا تھا کہ رودان ہوتے ہوئے آپ رسوئی کا کام کیوں کرتے ہیں؟"

اس سوال کے جواب میں پنڈت جی نے ایک طویل افسانہ شروع کیا۔ کشمیری پنڈتوں کی اولوالعزمی جن میں ایک فرد بھی ان پڑھ نہیں۔ وہاں ایسے پاٹھ اور اشلوک، برتن مانجھنے والوں کو بھی آتے تھے۔ خود بھگت رام کشمیر سے نکالے ہوؤں میں سے تھا۔ ناکامیاب، بے کار اور یہاں والے ایسے گدھے نہ ہوتے تو ان کو پکانے میں ہی استاد کون مانتا......سورج بابو کھڑے ہی تھے۔ ٹائم پیس کی طرف بار بار دیکھتے تھے اور بابو رام کی طرف بھی۔ جانا چاہتے تھے۔ جیسے ان کے سنجیدہ سوالوں کا جواب مل چکا تھا۔ پھر بھگت رام کا چہرہ بھی اب تمتما رہا تھا۔ پوجا کے بعد ہون۔ ہون کے بعد امرت اور امرت کے بعد الہام آ رہا تھا۔ یہاں والوں کا لفظ جو کلام میں آیا تو الہام نے زور پکڑا۔ اَن سنی گالیاں بکنے لگے۔ نئے استعارے، نئی تشبیہیں۔ سورج بابو ایک مشین کی طرح "جی جی جی" کرتے بیٹھک سے باہر آئے۔

گھاسی رام کا یہ آخری حربہ بھی گیا۔ الٹا سورج بابو نے کشمیری کی تعریف کی۔ اب تو کوئی صورت دکھائی نہیں دی۔ بابو رام کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ہاتھ جوڑے۔ پھوٹ پھوٹ کے روئے اور رحم کی دل سوز درخواست کی۔ بابو رام کا دل ہل گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ والد کے جڑے ہاتھ کھول دیئے۔ فرمانبرداری کا وعدہ کیا۔ والد صاحب والد ہی تو تھے۔ ان کا فیصلہ آخری ماننے کا بابو رام نے اقرار کیا۔ بڑے میاں کے جیسے درجنوں پھوڑے پھوٹنے لگے ہی تھے کہ بابو رام نے ایک شرط پیش کی۔ انصاف کی بات تھی۔ لالہ جی نے وہ کوفتہ کبھی نہیں دیکھا تھا وہ اس چیز کو برا کیسے کہہ سکتے تھے۔ ایک دفعہ چکھ لیں پھر جو برا کہیں بابو رام اس کا کبھی نام

بھی نہ لے۔

بابورام یہ کہتے ہی کانپنے لگا۔ کیونکہ گھاسی رام نے آنکھیں اس حد تک کھولیں اور منھ اتنا کھولا کہ بابو کو اپنا جسم گوشت دکھائی دینے لگا۔ لیکن گھاسی رام گوشت خور نہیں تھے۔ ان کا منھ اس حیرت سے کھلا کہ وہ یہ سن کر بے ہوش کیوں نہیں ہوئے۔ ان کی آنکھیں بھی کھلی رہیں جیسے ایک غشی کو بلا رہی تھیں، اور بابورام غلط فہمی میں وہاں سے بھاگ نکلا۔

کئی دن اور گزرے لیکن گھاسی رام کو غشی نہیں آیا۔ البتہ وہ اب سن سے پڑے رہتے تھے۔ اب وہ اضطراب نہیں تھا۔ بھول سے گئے تھے اس معاملہ کو۔ نہ اب کروٹیں بدلتے تھے نہ تدبیریں اور ادھر بابورام کو والد کا غم تھا۔ لیکن ان کا خوف بھی تھا۔ اس دوہری حالت نے اسکے سینے میں گہرائیاں سی کھود ڈالیں۔ جن کو وہ بھرتا گیا۔ تابڑ توڑ ان ہی قسم قسم کے کوفتوں سے۔

عین اُسی دن کہ لالہ نے دکان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ مہورت تھی اس دن اچھی۔ پھر اب لالہ کی شکل بھی ایک شہید کی سی ہو چکی تھی۔ برادری بنیوں کی ہی کیوں نہ ہو۔ شہید کی تو گنی عزت ہوا کرتی ہے۔ عین اُسی وقت ایک اور طوفان آیا۔

بابورام بر سرِ بازار پہلوان کی دوکان میں بیٹھا اپنی پسند کا گوشت کٹوا رہا تھا۔ بازار بھر کے دکان داروں اور اس لمحے کے خریداروں نے باری باری جا کر اس کو وہاں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ جاتے تھے۔ جا کے دیکھ بھی آتے تھے۔ تھوک بھی آتے تھے پھر اُن اپنی دکانوں کی طرف جلدی جلدی۔ چلے آتے تھے۔ یہ پہلوان کی بغل میں کٹ پیس والا بھی۔ اس کے منھ میں سے ندیاں سی بہنے لگیں جیسے بکروں کی جگہ آج بابو کی لاش ٹنگ رہی تھی۔

بازار میں یہ ٹولیاں جو بڑھتی گئیں لوگوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا۔ کتنوں نے بابو کی اس حرکت کو برادری کے نام چیلنج سمجھا۔ کتنوں نے آستین الٹ لیں اور اتنے میں بابورام پوٹلی لیے چلے آئے۔ چلے آئے۔ بھیڑ میں سے بھی چلے گئے۔ لوگ ایک دوسرے کے منھ دیکھتے رہے، بابورام کو پٹنا آسان ہوتا تو اب تک کئی بار پٹ چکا ہوتا۔ یہ بھگت رام کے مسٹنڈے اور پہلوان،

کے آدمی بازار بھر کو لوٹ لیتے ـــــــ بازار بھر کا غصہ لالہ گھاسی رام پر ہی اترنا چاہتا تھا اور جب یہ خبر لالہ گھاسی رام کو ملی ان کی کمر ایسی ٹوٹی کہ دم بھی ٹوٹنے کو آیا۔ اب کی یہ چوٹ معمولی نہیں تھی۔ اسی دوپہر کو ایک نئی آفت نے ان کو تڑپا دیا۔ دونوں منشیوں نے دکان سے استعفیٰ دیا تھا۔ یہ پہلی ضرب تھی ان کے کاروبار پر' ان کے روپے پر۔ اب ایسے پڑے رہنا ناممکن تھا۔ عمل کی ضرورت تھی۔ سخت ضرورت۔

گھاسی رام سیدھے ہو کے بیٹھے اور سوچنے لگے۔ اب یہ سوچ مایوس آدمی کی نہیں تھی۔ وہی پکی سوچ جو بازار کے اتار چڑھاؤ کو آنک لیا کرتی تھی۔ آج وہ انھوں نے اپنی عینک بھی لگائی جس کو لگا کر مشکل مسئلوں پر غور کرنے میں ان کو سہولت ہوتی تھی ـــــــ ان کی اس عینک میں سے ان کو پہلے وہی کشمیری دکھائی دیئے .... یہ لوگ! کتنے عجیب دغریب! برہمن۔ پنڈت خوبصورت۔ فارسی داں انگریزی داں۔ مہا شاستری۔ پھر گوشت پسند۔ یہ لوگ بڑے بڑے ہون کرنے والے۔ بڑے بڑے پاٹھ' پھر یہ گوشت اور تو اور رہا۔ یہ لوگ دیوتاؤں کو بھی یہی چیز چڑھاتے ہیں........ دیوتا اور گوشت کتنا بڑا پاپ! مگر ان کے چہرے کھلتے گلاب کیوں تھے؟ ان کے منہ کالے کیوں نہیں تھے؟ دیوتاؤں کا مذاق اڑاتے تھے یہ لوگ' دیوتاؤں کی بے عزتی' کلجگ! کلجگ!....... مگر کیا معلوم؟ غیب کی دنیا کس نے دیکھی؟ کیا معلوم دیوتا گوشت پسند کرتے ہوں...... بھئی واہ پسند ناپسند کی یہاں کیا بات؟ بھلا دیوتا بھی زبان اور تالو رکھتے ہیں؟ جسم ہو تو کھائے پیئے۔ روح تک یہ مجازی چیزیں کیسے پہنچیں۔ پھر یہ جھوٹ سچ کی کیا باتیں ہیں' کچھ ہی کھاؤ۔ کھانے میں کوئی روح کو تو چھوتا نہیں؟ گناہ پھر اس میں کیا؟ پھر کیا یہ لوگ ہندو نہیں جو دیوی دیوتاؤں کے نام گوشت چڑھاتے ہیں۔ مہا سبھاؤں کے سبھا پتی اکثر انہی لوگوں میں سے ہوتے ہیں...... مگر یہ باتیں برادری کو کون سمجھائے۔ وہاں تو شوشہ چاہیئے شوشہ۔ پھر کیا کیا جاتا؟ بابو کو گوشت چھوڑنا ہی تھا۔ مگر چھوڑے کیسے؟

"........ رام رام رام........ گدھا کیا بک رہا تھا۔ کہ پہلے ہم چکھ لیں۔ پھر

بتائیں کہ برا ہے۔ آخ تھو ا ہوں! کوئی اور راستہ ہی نہیں! نمک حرام! .... مگر پھر راستہ کیا ہے ؟"

اس نقطے پر پہنچ کر لالہ جی پھر سن پڑ گئے۔ عجیب تصویروں کے سلسلے آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ شہیدوں کی تصویریں۔ جنہوں نے قربانیاں دی تھیں، جنہوں نے تختۂ دار کو چوما تھا جنہوں نے زہر کی گولیاں ہنس ہنس کے کھائی تھیں۔ زہر کی گولیاں! ...... پھر یہ معقول سوال پیدا ہوا کہ یہ کوفتے کی گولی ایک زہر کی گولی سے زیادہ کڑوی تو نہیں ہوگی ......

آخر وہ وحشی پنے پر تلے۔ آج کمرے کی ایک دیوار سے دوسری تک مارچ کر رہے تھے اُن کی دوپلی ٹوپی کی نوک بھی پریشان زاویئے بنا رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح انہوں نے بابو رام سے کہا :-

"بابو۔ لاؤ۔ لاؤ۔ کہاں ہے وہ تمہارا کوفتہ لاؤ۔ میں دیکھ لوں گا۔ نگل لوں گا۔ نگل کے بتا بھی دوں گا کہ میری زبان اور پیٹ کس آسمان پر چلے گئے۔ ہر ہر۔ ہر ہر۔ ......"

بابو رام دیکھ کر ششدر سا رہا۔ پتاجی پاگل تو نہیں ہوئے تھے۔ وہ کمرے سے باہر سوچنا چاہتا تھا۔ گوشت کو ترک کرنے کے مسئلے پر غور کرنا چاہتا تھا۔ زبان کے چسکے کے پیچھے والد کو پاگل دیکھنا دشوار تھا۔ لیکن گھاسی رام نے اس کو باہر جانے سے پہلے ایک دفعہ روکنا چاہا تو روک بھی لیا اور شبہ کی نگاہوں کے ساتھ مگر ایک معقول آدمی کی طرح کہا۔" لیکن ایک بات ہے۔ بابو۔ اپنا وعدہ بھولیو نہ۔ جونہی میں نے چکھا اور کہا کہ بری چیز ہے۔ تمہیں اُسی وقت قسم کھا کے چھوڑنے کا اعلان کرنا پڑے گا۔

ان باتوں سے بابو رام کا توازن واپس آگیا۔ رام بھلا کرے لالہ کا دماغ لوہے کا تھا۔ پاگل ہوں دشمن۔ فوراً بابو نے وعدے دہرائے اور بھگت رام کی طرف دوڑا آیا۔

اس دن لالہ جی نے اپنے معدے کو خالی رکھا۔ معلوم تھا کہ الٹیاں آئیں گی۔ انہوں نے دن بھر اس تاریک لمحے کا انتظار کیا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور بابو رام بغل میں دبائے چلے آئے،

کٹوردان دیکھتے ہی لالہ جی بےچین ہونے لگے۔ ایسا محسوس ہوا کہ انتڑیاں باہر آنا چاہتی ہیں۔

"او بابو......... او بابو.......... اچھا۔ لے آ. ...... مگر دیکھ........ سُن

.... ذرا ٹھہر......" ان کا اضطراب بڑھتا ہی گیا ......" اچھا دیکھ...... مجھ

سے تو دیکھا نہیں جائے گا.......... میری آنکھیں باندھ دے .... میں چکھ لوں

گا......... یوں منہ کھولے رہوں گا۔ تم بس ڈال دینا......... ایسے ...... اوہ......"

بابو رام کو ایسا دکھائی دیا کہ وہ بغیر کلوروفارم کے اپریشن کرنے لگا ہے۔ مگر آج اس

کی ہمت خاصی تھی۔ آج کی چیز بھی انوکھی تھی۔ اس نے والد کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ لی۔ لیکن

لالہ اپنے کو تیار نہیں پا رہے تھے۔ اپنے پیچھے سب سے بڑا تکیہ رکھوا دیا۔ دائیں ہاتھ سے

سب سے بڑے اگال دان کو تھامے رکھا۔ بائیں ہاتھ سے اپنی آنکھوں کو پٹی کے اوپر سے

ڈھک دیا اور منہ کھولا...... کھلے منہ میں ایک تر تراتی گولی گری۔ لالہ کا تمام بدن کانپ اٹھا۔

اُگال دان اور تکیہ کو لالہ نے جیسے پنجوں سے پکڑ لیا لیکن اتنے ہی میں لالہ کی زبان نے کچھ میٹھا میٹھا

چکھا۔ میٹھا؟ میٹھا؟ روح سوز لہسن پیاز کی بدبودار نمکین مزے کی جگہ مٹھاس؟ یہ گلاب جامن

کا کیا مذاق؟ نہیں۔ یہ نورس گولہ سا تھا "اماں کچھ ہی ہو یہ تو مٹھائی ہے۔" سمجھ گئے بابو کی چال

تھی۔ کڑوی دوائی سے پہلے بتاشہ کھلا رہا تھا۔ یا یہ چال ہے کہ مٹھائی کو بھی ہم تھوک دیں اور

وہ ہنس پڑے اماں اتنے بوڑھے ہو گئے صبح و شام کھاتے رہے۔ مٹھائی اور اس بلا میں

تمیز نہیں کر سکتے۔ امتحان لے رہا ہے بچہ۔" یہ سوچتے ہی انہوں نے دانت ہلائے۔ زبان تالو

کے شکنجے میں گولی کو خوب نچوڑا۔ چبایا۔ اور نگل لیا۔ کتنی میٹھی تھی یہ بنگالی مٹھائی۔ دن بھر کے

بھوکے تھے وہ۔ کاش وہ کوفتہ جادو سے اسی مٹھائی میں تبدیل ہو جاتا۔ منہ کھولا۔ پھر وہی میٹھی

گولی آئی، پیاری گولی۔ اس وقت بھی لالہ نے مصلحت نہیں سمجھی کہ بابو سے پوچھیں کہ یہ بنگالی کی

نئی دکان کہاں کھلی۔ اس وقت کی گولی یوں ہی حلق میں سے پھسل گئی۔

"لاؤ اب وہ نجاست کی گولی بھی چکھاؤ۔"

بابو خاموش وہی میٹھی گولیاں ڈالتا گیا اور وہ بھی نگلتے گئے۔ اس گولی کی خوشبو بھی وہ تھی کہ آج تک لالہ نے سونگھی نہیں تھی۔ اس گولی میں ایک عجیب نرمی تھی۔ اتنی نرمی۔ پھر اس کے اجزا وحدت میں ملے گھلے کھانے گئے۔ یہاں تک کہ ایک نئے سوال نے تنگ کرنا شروع کیا۔

"کوفتے کی جگہ مٹھائی کیوں کھلا رہا ہے یہ بابو؟ ممکن ہے بابو نے گوشت چھوڑ دیا ہو۔ ممکن ہے میرے بابو نے گوشت کبھی کھایا ہی نہ ہو۔ میں نے اس کو اپنی آنکھوں سے کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ بابو کے طریقے انوکھے تھے اس نے حقیقت کو سیدھے طریقے سے کبھی بتایا نہیں تھا۔ ہیں؟ تو کیا......؟" ایک جوش بھری امید میں پٹی پھاڑ دی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کھول کے کٹور دان کو دیکھا۔ مٹھائی کی لال لال گولیاں۔ الائچیوں کے دوش بدوش لبدھڑے اناری رس میں ڈوبی ہوئیں اور دیکھا تو ان گولیوں کی شکل خوبانیوں سے ملتی تھی۔ کہیں بابو خوبانیاں ہی تو نہیں پکا لایا تھا؟ مگر خوبانیوں میں یہ مزا؟ ——— "کیسی تھیں یہ گولیاں لالہ؟"

بغیر سوچے سمجھے لالہ نے چٹخارے بھرتے اس مٹھائی کی داد دی۔ کل کا چھوکرا یہ بابو ان کو بے وقوف نہیں بنا سکتا تھا۔ بھلا مٹھائی کی بھی برائی ہو سکتی ہے؟

"یہ خوبانیوں کا مذاق کیا سوجھا؟ بھئی خوبانیاں تو خوب تھیں۔"

"میں آپ سے کیا کہا کرتا تھا۔"

لالہ کو تشویش ہونے لگی "تو وہ کم بخت کوفتہ نہیں لائے تھے؟"

"لالہ کوفتہ یہی تو تھا۔"

"ہیں؟........ لالہ نے یقین نہیں کیا۔

"اس کو کوفتہ خوبانی کہتے ہیں لالہ"

لالہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔

"یہ چیز میٹھی ہی بنتی ہے۔"

لالہ کے نیچے زمین ہلنے لگی۔

لالہ اس سے بھی بڑھیا، میٹھا، نمکین، کھٹا، سرخ، پیلا، اور سبز گوشت یہ کشمیری بناتے ہیں۔"

لالہ نے اگالدان اٹھایا، کتنی دفعہ انہوں نے منھ کھولا۔ آواز بھی نکالی مگر معدے نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ الٹ دیا ہوتا سارا۔ شکست خوردہ لالہ تکیئے کے سہارے "بے ہوش" پڑے رہے۔ لیکن ان کے کان ابھی کام کر رہے تھے۔ بابو نے اب بھی اپنی زبان بند کی ہوتی۔

"بڑی محنت سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ خوبانیاں لالہ۔ پہلے چھری سے ہی بہت باریک کٹوایئے۔ پھر مٹھی بھر چھوٹے کی دال۔ مقدار کے بادام پستے چلغوزے اور مسالے اس میں خوب ملا کر ابالے جایئے۔ یہاں تک کہ خوب گل جاوے۔ پھر اس تمام کو رگڑ رگڑ کر چٹنی سی بنایئے۔ پھر اسی میں گھی اور دہی ملایئے۔ پھر وہ ہاتھوں ہوں لالہ خوبانیاں ڈھالتے کے۔ گھی میں اس رنگ تک تلنے کے۔ پھر گھی، شیرہ اور کشمیری مسالوں میں ان گولیوں کا دم کیجئے۔ سنتے ہو لالہ اس میں کیسر پڑتا ہے۔ کیوڑہ، دار چینی۔ الائچی۔ لالہ، لہسن پیاز کا تو کشمیری کھانوں میں دخل ہی نہیں۔"

اس کے بعد لالہ جی میں ایک قدرتی تغیر آیا۔ پنشن خوروں کی طرح تصوف پر کتابیں ڈھونڈنے لگے دنیا کو مایا سمجھنے لگے۔ محنت کو وقت کی فضول خرچی۔ اپنے دن اچھے کٹے تھے۔ اب جو باقی تھے ابدی زندگی کی تلاش میں صرف کرنے لگے۔ زاد راہ کے لئے کافی کما رکھا تھا دنیا سے الگ الگ رہنے لگے — خدمت گاروں تک سے کھچے کھچے رہے۔ اس فانی کاٹھی کی خدمت کیا کرواتے اب نہ وہ پرمل کے لئے تڑپ رہی نہ سیتا پھل سے نفرت سب چیزیں میٹھی تھیں۔ سب چیزیں پھیکی۔ اور ان چیزوں میں گوشت بھی تھا۔ اگرچہ لالہ ابھی تصوف کے اس درجے تک نہیں پہنچے تھے۔ جہاں گوشت کھاتے آنکھیں بند نہ کرنی پڑتیں۔

ان حالات میں بابو کو گھر سنبھالنا پڑا اور اس نے دکان کا حساب انگریزی میں رکھا اور دو پڑھے لکھے کلرک نوکر رکھ لئے۔ نئے آقا نے گھر میں نئی روح پھونک دی، اپنی اپنی جگہ سب کو کچھ نہ کچھ نئی تسلی تھی، نئی امید۔ خود لالہ کو بھی یہ تسلی تھی کہ ان کو زندگی بھر میں پہلی تعطیل

حاصل ہوئی۔

بابو رام نے اپنے والد کی پہلی خواہش کو عمل میں لانا اپنا پہلا فرض سمجھا۔ باپ بیٹے کو گنگا نہان کے لئے جانا تھا۔ میلے کا دن تھا۔ نیک دن۔ لالہ پہلے کبھی نہیں گئے۔ اب وقت تھا کہ گناہ جھاڑ دیں۔ گنگا جی کا پانی سیروں پی لیں۔ اندر باہر کا میل جاتا رہے۔ کھایا پیا معاف ہو جائے۔ پھر یہ بھی ممکن تھا کہ بابو بھی یہ جل پی لے اور ایک نئی زندگی میں اُن پرانی عادتوں کو بھول جائے...... ممکن تھا

لالہ گھنٹوں گنگا جل میں رہ کر اور بابو کو بھی ساتھ رکھ کر بھیڑ کو چیرتے چلے آ رہے تھے۔ دونوں جو دھوتیاں نچوڑنے کھڑے ہوئے دائیں ہاتھ کو وہاں ایک بڑی دھرم سالہ دکھائی دی۔ دھرم سالائیں تو ادھر بھی تھیں۔ مگر لالہ نے ادھر کا ہی رخ کیا۔ وہاں کچھ زیادہ لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ لالہ بھیڑ میں ہی تو گھسنا چاہتے تھے۔ جہاں لوگ ہوں بالوگ! اتنے لوگ کہ لالہ اپنے تنہا دنوں کا بدلہ لیں۔ پھر وہاں کھلی دنیا میں ہر دیکھتی آنکھ سے اپنی اندر آنکھ ملا دیں۔ ہر چہرے کی طرف بے خوف دیکھیں۔ یہاں دنیا کی برادری تھی جہاں پنچایتیں نہیں تھیں، شوشے نہیں تھے، سازشیں، کانا پھوسی، بدگوئی، بدنامی۔ یہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ادھر کی بھیڑ کے لئے ایک کشش تھی۔ دھرم سالہ کے چوڑے آنگن کے بیچ، تخت پر، ایک فرشتہ صورت مہا پرش بیٹھے تھے۔ ان کا پہناوا بھی ان دیکھا تھا۔ ایک عجیب لمبا سا کرتا گلے سے ٹخنوں تک۔ برف سی پشمینے کا۔ سر پر ایک شنکھ نما ایک چھوٹا سا عمامہ، جیسے اس کی تہیں ایک باریک سوئی سے بٹھائی تھیں۔ پھر ان کا وہ چاند سا کھلتا منھ، ملبوترا، لال، چمکتا ہوا۔ جیسے دیوتاؤں کا ہوتا ہو، میٹھے اشلوک گا کے دیا کھیان کر رہے تھے، گہری گہری باتیں بتا رہے تھے۔ مہا ویدانتی ہوں گے وہ" لالہ نے سمجھ لیا۔ ان کا سریلا گلا۔ پھر ویدوں کے اصلی اشلوک، لالہ فدا ہونے لگے۔ وہیں دروازے پر بیٹھ گئے۔ سنتے رہے اور جب یہ مہاتما ترجمہ کرتے تھے۔ ان کا وہ ٹوٹا لہجہ، غلط تلفظ کتنا پیارا معلوم دیتا تھا۔ آسمان سے جیسے ایک اجنبی آیا ہو۔

بابو رام کو بہت بھوک لگی تھی۔ تقریر ختم ہونے پر بھی لالہ اُسے گھسیٹے جا رہے تھے۔

مہاتماجی اپنی کوٹھڑی میں جا گھسے تھے۔ لالہ بھی وہیں آگھسے۔ وہاں اور بھی لوگ تھے۔ لیکن مہاتماجی نے لالہ کے ایک چہرے پر بھگتی دیکھی، غم دیکھا، صدمہ دیکھا۔ ہمدردی سے لالہ کو پاس بلایا۔ دھیرے دھیرے اور لوگ وہاں سے چلتے بنے۔ پھر لالہ نے آنسو ٹپکاتے اپنی کہانی سنائی۔

بابو نے بہت کوشش کی۔ اس دوران میں وہ اپنی صورت ایک مجرم کی سی بنالے۔ مگر وہ ایک اور مصیبت میں مبتلا تھا۔ اس کوٹھڑی میں اسے کچھ اپنا اپنا سا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے حواس کچھ اپنی سی ہوا پی رہے تھے وہ تفتیش کی کشمکش میں مصروف تھا۔ پنڈت جی کے نیچے ایک نمدہ تھا۔ پھر چارپائی پر ایک کشمیری گبہ، ان کی یہ گول پگڑی۔ بھگت رام نے ایسی پگڑی کا ایک دفعہ ذکر کیا تھا۔ پھر یہ لمبا کرتا۔ یہی ہوگا۔ پیراہن کشمیریوں کا۔ جس کی یاد جاڑے میں بھگت رام کو بہت آتی تھی۔ پھر اسی لمحہ اس کی بے چینی ختم ہوئی۔ اندر سے ایک آدمی چائے کا "سماوار" لئے آیا۔ وہی بھاپ کی گھٹائیں نکالتا ہوا۔ الائچی، دارچینی اور چائے سبز کی متوالی گھٹائیں، وہی کشمیری "سماوار" اور کانسی کی کونڈے نما کٹوریاں۔

مہاتماجی بابورام کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے اسی کٹورے میں سے ایسی پی لی جیسے ایک کشمیری پی لے۔ بابو کی آنکھوں میں نئی امیدیں جھلک رہی تھیں۔ اندر سے کڑچھی پتیلی کی کھنک آرہی تھی اور بابو بار بار ادھر کی طرف دیکھتا جاتا تھا۔ اس کو ایک خوشبو ستارہی تھی۔ جیسے کوفتہ دم پر آیا ہو۔

مہاپرش نے ان کو وہیں روکا۔ کھانے کی دعوت دی۔ بڑی نوازش تھی انکی لالہ احسان میں پہلے ہی ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر وہ کھانا۔ نہ ایسے مہاتما کبھی پہلے ملے تھے نہ ایسا کھانا۔ یہ اربی نما سبزی نہ معلوم کس جنگل کی بوٹی تھی۔ لالہ نے خوب کھایا۔ وہ ایک آسمانی غش میں تھے۔ دنیا کی لذتوں کو بھولے ہوئے تھے ان کی نس نس میں نئی لذتیں گھس رہی تھیں۔ عالم بالا کی لذتیں۔ کھردری بے معنی، بدمزہ دنیا سے دور۔

کھاتے کھاتے کئی بار مایو اُچھل کے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر مہاتماجی کی بڑی بڑی آنکھیں

اسی لمحہ اُس کو روکتی تھیں۔

جب کھا چکے۔ مہا پرش نے لالہ کو بدا کرتے ہوئے چند آخری جملے کہے لالہ نے ہاتھ جوڑے اور کمال عقیدت مندی کے ساتھ سنتے رہے۔

"لالہ جی۔ ہم نے تمہاری کہانی سن لی۔ شانتی کا بس ایک راستہ ہے۔ تم نے جیسا بھوجن آج یہاں کھایا۔ ایسا ہی کھاتے رہنا۔ تم دونوں کا کلیان اسی میں ہے۔ یہ پدارت امرت برابر ہے۔ اس کو دیوتا کھاتے ہیں۔ بھیرو کھاتے ہیں۔ مہا مایا کھائی ہے۔ شرادھوں کے ذریعہ ہمارے پریت بھی اسی کو کھا کر جیتے ہیں۔ اس پدارت کا نسخہ میرا آدمی تمہارے بیٹے کو لکھوائے گا۔"

باہر آتے ہی بے صبر بابو نے راز فاش کر دیا۔ "لالہ یہ کوفتہ روغن جوش تھا۔ یہ کشمیری ...." بابو بولتا گیا۔ بہت بولنے کی اس کو عادت تو تھی ہی۔ اور لالہ اپنے قدم تیز کرتے گئے۔ ان کی آنکھیں ایک سیدھ میں گھر کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب طاقت ان کو دھکیلے جا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ایک نیا گیان جھلک رہا تھا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک خوشگوار فیصلہ کھیل رہا تھا۔

دوسرے ہی دن لالہ اور بابو ایک بگی میں سوار دکان کی طرف جا رہے تھے ایسے دوش بدوش بیٹھے تھے جیسے سمجھوتے کا ایک اشتہار جا رہا تھا۔ گو بابو کے ہونٹوں پر فتح کا لرزہ تھا۔ دونوں کی نظریں متفقہ زاویوں سے دنیا کو گھور رہی تھیں۔ اُن کے نئے ہارن کی خوفناک آواز سے بنیوں کے دل دہل اُٹھے۔ لالہ کی مونچھوں پر یہ نیا تاؤ کیسا تھا۔ لالہ خونخوار کیوں دکھائی دے رہے تھے؟ جیسے سارے بازار کو نگلنے چلے تھے۔

غلط فہمی

ایک خط میں یہ کہ وہ بیمار ہیں، دوسرے میں یہ کہ بخار کی بیماری ہے، تیسرے میں یہ کہ کھانسی بھی ہے، چوتھے میں یہ کہ ان کو پلورسی ہو گئی ہے اور وہ علاج نہیں کرواتے ـــــ چار مہینوں میں اطلاعات کی چار قسطیں، پھر بھی بملا نے حقیقت نہیں لکھی۔ میں جانتا تھا کہ تپ دق کو بہت دن پلورسی کہنا پڑتا ہے، خاندان کی کئی اور باتیں ہوتی ہیں جن کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن یہاں تو کسی بڑے خاندان کا سوال تو تھا نہیں۔ بملا تھی اور اس کا گھر والا اور اگر رام سرن کے بعد بملا زندہ بھی رہتی۔

اس خیال کو پوری طرح ظاہر کرنے سے میری بیوی نے مجھے روکا :-

"اف نو! میں کہتی ہوں آپ کا خیال کہاں کہاں جاتا ہے۔ ٹھیک بات کو بھی آپ غلط سمجھنا چاہتے ہیں۔ پرمیشور بملا کی مانگ بنائے رکھے۔ جب وہ لکھتی ہے تو پلورسی ہی ہو گی۔ آپ ایسی بدشگونی کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

میری بیوی کی عادت ہے کہ اکثر میری رائے کے خلاف رائے ظاہر کریں گی۔ میرے خیال میں یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتی ہیں۔ جب کبھی میں کہوں کہ میں نے یوں سمجھا ہے وہ کہیں گی آپ نے غلط سمجھا ہے اور میں یہ بات اس لئے پہلے کہے دیتا ہوں کہ کہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اُن کے دل میں اپنی چھوٹی بہن بملا کے لئے ہمدردی تھی۔ میں نے کہا :۔ "اچھا بھئی۔ پوری ہی سہی علاج تو اُسے کروانا چاہیے تھا۔ بملا بچاری پریشان ہو گی، چھوٹی سی تو ہے"۔

میری بیوی کا لہجہ بدل گیا :——"اجی چھوٹی نا، دودھ پیتی بچی، ٹھمک ٹھمک سے باتیں مٹھارے۔ ڈاکٹر کو بلاتے ہوئے اُس پر گھڑوں پانی پڑتا ہو گا نا؟——"

"اجی ایسی کوئی بات تو بھی نہیں ہے وہ؟"

"اجی کہاں؟ آپ بھی تو اس کے چاچا لگتے تھے نا؟ جو......."

"بھئی دولہا بھائی تو لگتا ہوں اُس کا"

"جی۔ رام سرن بھی تو میری چھوٹی بہن کے دولہا ہیں۔ لیکن میں ان سے آنکھ تک منہ بھی ملاتی۔ بدتمیزی کی بھی حد ہوتی ہے"۔

ایک عام مرد کی طرح میں نے اس نقطے کی سنجیدگی کو ایک قہقہے میں ڈبو دیا۔ پھر نقطہ بہ نقطہ سلسلہ گفتگو کی رہنمائی کی۔ حتےٰ کہ ہم دونوں اس فیصلے پر پہنچے کہ رام سرن کا علاج کرانا چاہیئے۔ علاج یہیں دلی میں ہو سکتا تھا۔ ایک تو انکے ہاں کوئی اچھا ڈاکٹر تھا نہیں۔ دوسرے ہم بھی اپنا کاروبار چھوڑ گھر کو تالا لگا کر پٹیالے کیسے چلے جاتے؟ رام سرن کے پاس روپے کی کمی نہیں تھی۔ یہ دوسری سہولتوں میں سب سے بڑی سہولت تھی۔ چنانچہ اسی رات کی گاڑی سے میں اکیلا پٹیالے چلا گیا......... اور ہاں۔ جاتے جاتے بیوی نے ایک شرط لگا دی کہ میں وعدہ کروں کہ کسی اور کو تمیز ہو یا نہ ہو میں خود بدتمیزی نہیں کروں گا۔

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ پلنگڑی پر رام سرن کیا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ سانسوں کے ساتھ رسہ کشی کر رہا تھا۔ میری آواز سن کر اُس نے گردن کو ذرا سا جھٹکا دیا اور سر کو میری طرف

ٹپک دیا۔ اُس کی گردن سر کو روک نہ سکی۔ کیونکہ اب زیچ کے زاویے بنانے کی قوت اُس کے سر اور گردن میں باقی نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھتا رہا اور سانس کھینچتا رہا۔ سانسوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا دھڑ بھی ہل رہا تھا۔ وہ سانس لیتا رہا اور مجھے گھورتا رہا ـــــ گھورتا رہا اور سانس کھینچتا رہا اور اس کی آنکھیں میری روح کو ڈرانے لگیں۔ جیسے جیتی جاگتی آنکھیں، زندگی کی یادگار آنکھیں، داستانیں سناتی آنکھیں، ایک پچکے ہوئے ٹین کے ڈبے میں سے، ڈبے کے زنگ آلود سوراخوں میں سے جھانک رہی ہوں۔ پچکا ہوا ٹین ـــــ گھورتی ہوئی آنکھیں!

وہ ملک الموت کے آغوش میں آ چکا تھا۔ یہ اُس کے سفید ہونٹ ہی نہیں بتا رہے تھے۔ بلکہ گڑھوں میں دھنسے اور سوجے ہوئے پپوٹے، حلق کی ایک ایک رگ، ہاتھوں کی ایک ایک انگلی بھی جو اتنی لمبی ہوگئی تھی کہ کھڑکی سے باہر افق کو چھوتی دکھائی دی۔ صرف یہی اشارے نہیں تھے کہ رام سرن چراغ سحری سا ہے بلکہ وہ الوداعی پرچم بھی گڑ گیا تھا جو معرکہ سر کرتے ہی تپ دق مریض کے بائیں پیر پر گاڑ دیتا ہے۔ سوجن جو اتنی نمایاں تھی کہ میری پہلی نظر اسی پر پڑی تھی۔

اتنی جلدی یہ سب ہو چکا تھا۔ اتنی جلدی۔ یہ جو دونوں آنکھوں والے انسان تھے، اتنے خاموش کیوں رہے تھے۔ کسی نے پہلے لکھ دیا ہوتا اور اب یہ اندھے سب کچھ کھو بیٹھے تھے۔ سب کچھ! اس میں شک نہیں کہ تپ دق ابتدا میں شبخون مارتا ہے۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں آتا ہے۔ لیکن پہلا مورچہ سر کرتے ہی یہ نقارے بجاتا قدم بڑھاتا ہے۔ خون کی ندیاں بہاتا ہے۔ دہکتی آگ جلاتا ہے اور اس کا ہر پینترا واضح ہوتا ہے، ہر گھات کھلی کھلی ـــــ مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ دونوں اب بھی ایک عجیب سی نیند میں کھوئے ہوئے تھے۔ موت اس کے نزدیک آئی تھی لیکن اس نے ابھی تک اُس کی چاپ بھی نہیں سنی تھی۔ ٹین کے سوراخوں میں دردناک التجائیں نہیں تھیں۔ اس کی خاموشی میں فلسفیانہ سکون تھا۔ مایوسی نہیں تھی۔ ویدجی کی گولیوں کے لئے اس کا منہ مشین کی طرح کھلتا اور پھر بند ہو جاتا۔ گولی گلے میں اٹک جاتی۔ وہ اُسے نیچے اتارنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کی ناک نہ اوپر چڑھتی نہ اس کے چہرے پر کوئی نئی لکیر پڑتی۔ بملا اس کے منہ میں

برابر دودھ کے چمچے ڈالتی جاتی، یہانتک کہ وہ دودھ واپس نکل آتا، لیکن ان اُبکائیوں میں بھی رام سرن کی یکرنگی میں فرق نہ آتا۔ جیسے بگڑے ہوئے بے جان پرزوں سے ٹپ ٹپ تیل گر رہا ہو۔

پھر یہ بملا ـــــ! اس کو سمجھ ہی نہ سکا۔ الھڑ تو تھی لیکن اتنی انجان بھی کیا ہوگی۔ تکان سے چور دکھائی دیتی۔ مگر اداس بالکل نہ لگتی۔ بلکہ اس کی سطحی پیلاہٹ کے پیچھے اس کی پتلیوں میں ایک چھپی چھپی سی امید چمک رہی تھی۔ وہ دیمک جس کی مجھے تلاش تھی جسے میں سمجھتا تھا کہ گہرائیاں کاٹ رہا ہوگا اسے میں نہ پا سکا وہ بھی گولیاں کھلائے جاتی تھی، ویدجی کی گولیاں چمچے پلاتی تھی۔ اس کا منہ پونچھتی اور اطمینان سے اٹھتی تھی، بیٹھتی تھی، گھر کے دھندے کرتی تھی۔ کھاتی تھی۔ پیتی تھی۔ جیسے میاں کو صرف زکام ہوا ہو ـــــ صرف زکام۔

میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا تھا کہ اب میں یہاں کیا کروں؟ دلی لے جانا تو ایک طرف یہاں کمرہ بدلوانا تک دشوار تھا۔ پھر جو دنیا میں دو چار دن کا مہمان تھا اُسے کیسے اپنا مہمان بنا کر لے جاتا؛ بہت ممکن تھا کہ راستے میں دم توڑ دے۔ لیکن میں جو یہاں آیا تھا۔ کچھ کرنے ہی آیا تھا۔ دیر بہت ہو چکی تھی اور اب صرف ایک راستہ تھا کہ میں بھی اس بالغ ٹی۔ بی کو بلوریسی ـــــ نہیں زکام سمجھوں۔ تسلیاں دوں اور یونہی جھوٹوں کہہ دوں کہ چلو بھئی تمہیں دلی لے چلیں اور جب میں نے یہ جھوٹ بول دیا، تو رام سرن کے جوابی رویہ سے بڑا خوف زدہ ہوا اس نے اپنی ادھ کھڑی ٹانگیں پھیلا دیں۔ دونوں ہاتھوں کی سینخیں پلنگ میں گاڑ دیں اور اپنی ساری ہڈیوں کو اوپر کھسکا دیا۔ میں نے تکیہ سنبھالا اور وہ اطمینان کے ساتھ تکیے کے سہارے بیٹھ گیا۔ پچکے ہوئے ٹین پر مسکراہٹ کتنی ڈراونی معلوم ہو رہی تھی۔

"بھیا جی خیال تو بہت اچھا ہے لیکن ...... آپ کو تکلیف ہو گی؟" ٹین میں سے صاف الفاظ نکل رہے تھے اور میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ جوں توں میں نے کہا: "یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ رامی! میں یہاں آخر کس لئے آیا ہوں۔ لیکن ...... لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ اتنی دور کیسے ......؟"

"ارے بھیا جی، یہ تو سب آسان ہے" اور اس کے اطمینان بھرے لہجے نے مجھے خوف

زدہ کر دیا۔ مجھے اس کی ہڈیاں کھڑی ہوتی معلوم ہوئیں۔ چلتی اور بھاگتی ہوئی اور رام سرن وضاحت کرنے لگا۔ "مانا کہ ہم ہل جل نہیں سکتے مگر........ اہہ اہہ اہہ اہہ ٹین کھڑ کھڑا رہا تھا"...... مگر آج کل کیا ممکن نہیں ؛ سالم سیکنڈ کلاس یا فرسٹ کلاس ڈبہ بک —— ہسپتال کی ایمبولنس کار —— کرایہ کے مزدور.......... اہ اہ اہ بھیا جی پیسہ ! آدمی سورگ تک بھی پہنچ جائے۔ اہ اہ اہ........"

میرے دل میں اب اس کے لئے ترس کہاں تھا؟ مجھے ایسا دکھائی دینے لگا کہ یہ لاش مجھ پر گرنا چاہتی ہے اور ابھی میں یہ سوچ بھی نہ چکا تھا کہ میں صاف صاف کیا کہہ دوں کہ تشریف لے جائیں جی اور آگے بڑھے۔ بملا کو آواز دے کر سفر کی تیاری کا حکم دیا۔ میں نے بملا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا کہ شاید وہ ہنس پڑے گی یا اُن دلدوز نگاہوں سے دیکھے گی جو یہ کہہ رہی ہوں "دیکھا میری قسمت کی ستم ظریفی اور ان کو دلی جانے کی سوجھ رہی ہے۔ یہ جو آخری سفر کے لئے تیار ہیں۔ یہ جو مجھے بھیانک اندھیرے میں چھوڑ کے جانے والے ہیں......." لیکن بملا نے میری طرف دیکھا تک نہیں بلکہ ایک بچے کی طرح اچھل پڑی اور ایک جھپاکے میں نیچے سامان باندھنے چلی گئی۔

اس منزل پر بھلا میں کیسے چپ رہتا۔ میں بھی بملا کے پیچھے ایسے دوڑا جیسے جا کر اس کا سر پھوڑ دوں گا۔ مگر میری اس حرکت میں بھی رام سرن کو غصہ دکھائی نہ دیا اور اس نے پکار کر کہا: ہاں بھیا جی۔ ذرا تم بھی جاؤ۔ اس اکیلی سے یہ کیسے......؟

" عجیب معاملہ ہے بملا۔ بالکل انجان بن رہی ہو تم۔ میاں کو اس حالت تک پہنچا دیا اور ہمیں خبر تک نہ دی۔ پھر اب جو......... اب یہ جو آخری سانس لے رہے ہیں..... تم......." میں بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ بملا اب بھی خاموش تھی۔ میرا خیال تھا یہ نئی خبر سن کر وہ غش کھا جائے گی۔ پھر........ پھر مجھے اس کے آنسو پونچھنے پڑیں گے اور —— اور —— لیکن بملا ایک ٹرنک میں سے کپڑے نکالتی گئی اور دوسرے میں ڈالتی گئی۔

" بملا ! تم ہوش میں کیوں نہیں آتیں ؟ رام سرن ختم ہو رہا ہے۔ سنا تم نے ؟" لیکن وہ میری

طرف مڑی تک نہیں اُس کی مصروفیت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ کپڑے، ٹرنک، ٹرنک، کپڑے اور میں غصہ سے دیوانہ ہونے لگا۔

"اچھا، تو تم دونوں پاگل ہو گئے ہو؟ اور میں! میں بھی یہاں پاگل ہونے آیا ہوں۔ سنتی ہو بملا! میں واپس جا رہا ہوں۔ جب یہ چل بسیں مجھے تار دیدینا" میرا دل دھڑک رہا تھا اور میں کمرے سے باہر نکلنے کے لئے مڑا۔

بملا جاگ سی گئی۔ لیکن میری طرف مڑی نہیں نہ مجھ سے کچھ کہا۔ یوں ہی کھڑے کھڑے ساون کی جھڑی لگا دی .... پھر جیسے یہ پانی مجھ پر برسنے لگا اس کے ایک ایک آنسو سے میرے غصے کے شعلے بجھنے لگے۔ میرے دماغ پر سے دھوئیں کے بادل چھٹنے گئے اور میں ایک انسان کی طرح سوچنے لگا ـــــــ

پہلا خیال یہی آیا کہ اُس کے آنسو پونچھ لوں۔ سر سہلا دوں۔ پھر میرے دل میں ملائم سے ملائم الفاظ جمع ہونے لگے، تسلیوں کے، دلاسوں کے اور اتنے میں اس کا سر میرے سینے کے ساتھ آلگا تھا۔ اس کی ایک ایک سسکی کے ساتھ میرا نقطۂ نظر بدل رہا تھا.......

بملا! بال بُدھ کی بالی۔ اتنی بھولی ـــــ، اتنی پیاری۔ پھر اتنی اکیلی؟ رام سرن؟ لاش اُف وہ رام سرن کی چاچیاں، پھوپھیاں، بھوتنیاں! جو کبھی کبھار آتیں تو بملا کو اُلہنے دیتیں کہ خصم کو نگل گئی ہے۔ شاید وہ بھی موقع کی تاڑ میں تھیں کہ ادھر رام سرن نے آنکھیں بند کیں۔ اُدھر بملا کے ہوش خطا ہوئے اور اس کے زیور گہنے کپڑے ....؟ میں یہ کیسے ہونے دیتا۔ ان دونوں کو مجھے ضرور ساتھ لے جانا تھا۔ رام سرن کی لاش ہی سہی۔ لیکن بملا تو جی رہی تھی۔ تن درست، بے داغ، چندرماں جیسی۔

رام سرن کو اپنے گھر جانا مشکل تھا۔ اس تپ دق میں لتھ پتھ لاش کو اپنے بچوں میں کیسے رکھتا۔ اگرچہ معاملہ ذرا پیچیدہ تھا۔ لیکن اس کو سلجھانے کے لئے میرے دماغ میں نئے نئے خیال برساتی پودوں کی طرح اچھلتے چلے آگئے اور بملا کے آنسو انہیں سینچتے چلے گئے.......

اور میں نے سوچا کہ تپ دق کا علاج پہاڑ پر ہوتا ہے۔ پہاڑوں میں شملہ سب سے نزدیک ہے ـــــ لیکن شملہ بے کار سی جگہ ہے وہاں ڈھب کے ہسپتال نہیں اور پھر وہاں کی بھیڑ بھاڑ ـــــ شملہ کے نزدیک وہ دھرم پورہ خوب ہے۔ جہاں دو مکمل سناٹوریم ہیں اور کئی ماہر ڈاکٹر ـــــ ہسپتال میں جگہ نہ ملی نہ سہی۔ وہاں وہ "آرکیڈیا" کا جنگل بھی تو ہے چھوٹی الگ الگ ہٹوں سے بھرا ہوا۔ یہ ہٹیں بیماروں کو ہی کرایہ پر ملتی ہیں۔ سوئیاں، دوائی، ڈاکٹر کمپونڈر سب وہیں چلے آتے ہیں ـــــ "اہہ اہہ اہہ اہہ بھیاجی پیسہ!"........

میری مشکلیں حل ہوتی دکھائی دیں۔ میں نے اپنی انگلیاں بملا کے بالوں کی طرف بڑھا دیں اور اب جو خیال آئے چٹکیاں لیتے ہوئے آئے۔ ہلکی ہلکی چٹکیاں، جیسے باہر کی دکھتی رگوں کو کوئی اندر سے دبا رہا ہو........ آرکیڈیا میں چیڑ کے درخت ہیں۔ ایکانت ہے۔ سکون ہے۔ کسی کا دخل نہیں۔ کسی کا ڈر نہیں۔ امن کی وادی ہے۔ بندشوں، مجبوریوں، ڈر کی باتوں سے بہت دور اس جنگل میں آزادی ہے۔ وہاں سوسائٹی کے اجارہ دار نہیں، بیمار ہیں، جن کے دل میں سوائے اپنی صحت کے اور کوئی تمنا نہیں۔ سوسائٹی کی دوسری مصروفیتوں کے لئے ان کے پاس وقت کہاں؟ پھر ہیں بھی وہ تھوڑے سے، اتنے درختوں میں ایک دوسرے سے دور دور ـــــ یہ جنگل موقعوں کا جنگل ہے۔ ان نادر موقعوں کا جن کے فراق میں ہر بیمار ہر انسان تڑپتا ہے جن موقعوں کی وحشیانہ کھوج آدمی بند کمروں میں کرتا ہے۔ جن کو لحافوں میں کروٹیں بدلتا ڈھونڈتا ہے اور جنہیں وہ سماج کی کروڑوں آنکھوں سے چھپانا چاہتا ہے۔ یہ بیمار، یہ انسان یہاں نہیں تو اور کہاں تن درست ہو سکتا ہے؟

رات بھر وہ ریل کے ڈبے میں سوتا رہا۔ وہ بھی اور بملا بھی۔ بملا مقابل کی سیٹ پر ایک خرگوش کی طرح ملائم ملائم سی لیٹی رہی، سوتی رہی۔ کبھی جاگ اٹھتی تو گردن اٹھا کر میاں کو دیکھتی اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ سانس چل رہا ہے وہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور میں رات بھر اس حیرت کے عالم میں جاگتا رہا کہ یہ آنکھیں جب کھلتی ہیں تو دو گلاب سے کیوں کھل اٹھتے ہیں۔

اور جب بند ہوتی ہیں تو دو کنول سے کیوں بند ہوتے ہیں؟ کنول ——— جو ابھی کھلیں گے
اور گلاب بن جائیں گے۔

پو پھٹتے ہی ہم کالکا کے اسٹیشن پر اتر پڑے۔ میں نے دو موٹر کاروں کا انتظام کیا اور جب
رام سرن کو موٹر میں لٹایا تو میری نظر اسکے ناخنوں پر پڑی جو کالکا کے آسمان کی طرح نیلے پڑ چکے تھے
لیکن انجن گرم ہو چکے تھے اور موٹر کاریں چل پڑیں۔ ایک میں بملا اور رام سرن، دوسری میں میں
اور سامان۔

پہلے میری نظریں اگلی گاڑی پر جمی رہیں۔ اس امید پر کہ اب رکی۔ ڈرائیور اترا اور بملانے ہم چیخ
مچائی۔ لیکن ایسا نہ ہوا، اور چند میلوں کے بعد میرے خیال میری ہی طرف مڑنے لگے........
میں کہاں جا رہا تھا؟ اور کیوں جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک لاش تھی۔ میں اس لاش کو دفن
کرنے جا رہا تھا لیکن کیوں؟ .... اس بدشگون "کیوں" کے ساتھ ہی میرے معدے میں
ایک چکی سی گھوم گئی اور میں قے کرنے لگا۔ خود معدہ گلے تک اچھلنے لگا اور مجھے ایسا محسوس ہوا
کہ سب کچھ باہر آجائے گا۔ میں نے ان اُبکائیوں کو خوب کھینچا۔ جیسے منھ کے راستے ہی اپنی
چھپی ہوئی گہرائیوں کو کھود رہا تھا۔ جیسے اُس "کیوں" کا جواب دبکے ہوئے کونوں سے اکھاڑ
رہا تھا۔ یہاں تک کہ میری رگ رگ تھک کر چور ہوگئی اور میں رات بھر کا جاگا ہوا اس اُڑتے
ہوئے موٹر میں سو گیا۔

آرکیڑیا میں پہنچتے ہی چوچارام چوکیدار نے ہماری تمام ضرورتیں مہیا کیں سب سے الگ
تھلگ ہم نے ایک خالی ہٹ کرایہ پر لے لی۔ چوچارام کے آدمیوں کی مدد سے رام سرن کو
پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ بملا نے اپنی رسوئی سنبھال کی اور بڑے اشتیاق سے اپنا سٹر پٹر کرنے لگی۔
میں نے رام سرن کو گولی کھلائی اور اس کی آنکھیں ڈگر ڈگر کرنے لگیں۔ کچھ دیر وہ اونگھتا رہا اور
پھر سو گیا۔ تب میں وہاں سے اٹھا اور بملا کی مدد کے لئے رسوئی میں گیا۔ لیکن اتنی دیر میں بملا
نے چوچارام کی بیوی کو بلوا لیا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ گھبرا سی گئی اور اس بات پر پریشان ہوئی کہ

میں نے اسکے میاں کو اکیلا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ میں الٹے پاؤں تیزی سے لوٹ آیا، جیسے کسی نے مجھے بے رحمی سے ڈپٹ دیا ہو۔ میں پلنگ کے سامنے کاٹھ کی کرسی پر آگرا۔ بیٹھے بیٹھے کیا کرتا؟ رام سرن کے پپوٹوں کو ہی دیکھتا رہا۔ اس وقت ٹین کے سوراخ بند تھے۔ خوب بند تھے۔ ابھرے ہوئے دو داغ سے۔ جیسے سوراخ جھالے گئے تھے ـــــ سفر کی تکان کے بعد رام سرن گہری نیند سو رہا تھا۔

کمرے میں امن تھا۔ رام سرن کے سانس میں نہ آواز تھی۔ نہ سینے میں کھینچا تانی۔ چہرے کی ہڈیوں پر نجار نے ایک ہلکا سا گلابی بُرش پھیر دیا تھا۔ جیسے ڈوبتا ہوا سورج دو بدنما ٹیلوں کو روشن کر رہا ہو۔ اس ہلکی سی روشنی نے ٹیلوں کے بے معنی اور بے حس پس منظر پر بھی زندگی کی ایک لہر سی دوڑادی تھی۔ وہ اُس وقت جیتا جاگتا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ زندگی کے لطف اٹھاتا ہوا سا اور میں نے سوچا شاید یہ بملا کی محبت کی مستی ہے۔ جس سے اس کو آتی ہوئی موت تک نہ دکھائی دیتی ہے۔ محبت کی ایسی مستیوں کا ذکر میں نے صرف قصوں میں پڑھا تھا۔ مگر اب تک میں نے ایسے قصوں کو محض قصے ہی سمجھا تھا اور جب کوئی کہتا کہ اس طرح کہ محبت بھی ہوئی ہے تو میں سمجھتا کہ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیکن اب اپنے روبرو محبت کی حقیقتوں اور توتوں کو دیکھ رہا تھا۔ محبت کرنے والا چاہے تپ دق میں بھسم ہوتا رہے۔ لیکن محبت اسے جلنے نہیں دیتی۔ یہی وہ نشہ ہوتا ہے جس میں عاشق موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیا کہا میں نے؟ نشہ؟ نہیں محبت ایک جلوہ ہے جس میں آدمی موت کو دیکھتا تو ہے۔ لیکن موت سے اگلی منزل کو بھی دیکھتا ہے۔ اور ہاں محبت کرنے والے دونوں دلوں میں ایک ہی کیفیت ہوتی ہے۔ فراموشی، غفلت۔ نشہ۔ جلوہ۔ بیمار اور تیمار دار دونوں میں۔ اگر ایک مر رہا ہے تو دوسرے کو روگ کا ڈر نہیں۔ کیونکہ محبت گوشت پوست میں نہیں ہوتی۔ ورنہ بہ ظاہر کتنی خلیج حائل تھی بملا اور رام سرن میں؟ کھلتی کلی اور سفوف ہوتی ہوئی ہٹی میں۔ پیاری پیاری زندگی اور ہیبت ناک موت میں۔ لیکن وہ بباطن مجھے ایک دکھائی دے رہے تھے۔ بیمار؟

تو دونوں بیمار! غافل تو دونوں غافل!

پھر میں یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اُن کو میری یا کسی اور کی کیا ضرورت تھی؟ پچھتاوا؟ میرے دل میں تو حسد بھڑک رہا تھا ــــــــ مجھے رام سرن کی مستانہ موت پر بھی حسد ہونے لگا ــــــــ لیکن اُسی وقت رام سرن کے بدن میں حرکت ہوئی اور اب میری توجہ اس ہمہ گیر سرخی کی طرف گئی جو اس کے تمام چہرے پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس کی چمڑی تمتما رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور میں نے ان آنکھوں میں پہلی بار وحشت دیکھی۔ اب ان میں ٹین کے سوراخ نہیں انسانی شعلے چمک رہے تھے۔ اس وقت وہ کانپ بھی رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنا چاہا۔ حلق تر کرنا چاہا۔ لیکن اس کا سانس اکھڑ گیا اور اُسے کھانسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ سنبھل کر اس نے مجھ سے پوچھا:۔

"بھیّا جی۔ آہ۔ آہ۔ تو کیا وقت آگیا ہے میرا؟" اُسے اچانک موت کہاں سے نظر آگئی۔ میری حیرانی کی حد نہ رہی۔

"افسوس! بھیا جی افسوس! یہ زندگی............ ہائے"۔

زندگی کے لئے رام سرن کا واویلا سن کر میرا دماغ گھومنے لگا۔ محبت۔ موت۔ موت۔ محبت۔ حقیقت۔ مجاز۔ محبت کا نو مولود تصوّر میرے دماغ میں تھرکنے لگا۔ دماغ کی اس ان کھلی اور چکراتی ہوئی کیفیت میں بھی مجھے اور کوئی سہارا نہ سوجھا اور میں وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بملا کی طرف جانا چاہتا تھا۔ لیکن رام سرن نے میرا ارادہ سمجھ لیا اور کہا:۔

"بیٹھو۔ کہاں جا رہے ہو؟ بملا کے پاس جا رہے ہو؟ اس کو یہاں بلاؤ گے؟....... بملا کو!" یہ کہتے ہی اس کی تمتماہٹ اور گہری ہو گئی۔ اس کے ایک ایک سانس نے کئی کئی آوازیں نکالیں۔ جیسے اس کے سینے میں ٹوٹے پھوٹے بانس اڑ گئے ہوں۔ ایک عجیب سی پریشانی کے ساتھ اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے اور میں سمجھا کہ واقعی اس کا وقت آگیا ہے۔ میں نے وہیں سے بملا کو آواز دینا چاہا۔ لیکن اس نے اپنی آنکھوں کے انگارے میری طرف پھینک دیئے

اور لٹک کر کہا :-

"نہیں! بملا کو مت بلاؤ۔ مت بلاؤ اُسے، مت بلاؤ۔ وہ۔ وہ۔ وہ تو......... ہاں اب وقت آگیا ہے۔ سنو بھیاجی۔ میں بتا دوں گا۔ ہاں۔ ہاں۔ بملا نے ہی تو مجھے......... اسی نے۔ پھر اسی کو بلاؤ گے تم؟ بھیاجی ی ی ی .... وہ تو بِس کی گانٹھ ہے"

اب میرے دماغ کے دائرے تیزی سے گھومے۔ پھر رک گئے۔ پھر گھومے۔ پھر رک گئے۔ پھر صاف نظر آیا کہ میرا کامدیو اپنے پرانے گھر میں دولتیاں مارتا ہوا گھس رہا ہے۔ اسی گوشت اور ہڈیوں کے پنجر میں۔ خون سے بھری ہوئی رگوں میں ابدیت اور لافانیت کے بناوٹی سایوں پر تھوکتا ہوا۔

اتنے میں رام سرن کا پیچ و تاب کم ہو گیا اور اب اس نے جو کچھ کہا دھیرے دھیرے کہا اور اس کی آواز قدرے صاف ہو گئی جیسے بالس سینے میں نکل چکے تھے۔

"اس نے مجھ سے جھوٹ بولا بھیاجی۔ وہ ہر روز وہی جھوٹ دہراتی گئی۔ ڈھائی سال میری زندگی اجیرن رہی۔ ڈھائی سال۔ پھر......... پھر اس روگ نے مجھے سہارا دیا۔ مجھے زندگی سے دلچسپی نہیں تھی۔ میں زندگی سے ڈرتا تھا۔ مجھے کھانسیوں اور بخاروں نے زندگی کی تھپیڑوں سے بچائے رکھا ـــــ تم منھ کیوں بنا رہے ہو بھیاجی؟ میں دیوانہ نہیں ہوں۔ تم نے سنا نہیں کہ آدمی تپ دق میں آخری لمحہ تک ہوش نہیں کھوتا۔"

اب میری محبت کا تصور اپنے پرانے ٹھکانے پر واپس آگیا اور مجھ میں کچھ بولنے کی سکت پیدا ہوئی۔ "بھائی صاحب آپ کا بخار تیز ہو رہا ہے۔ چپکے پڑے رہیے میں آپ کی باتوں کا مطلب نہیں سمجھا۔" اب میں اُسے چپ کیسے ہونے دیتا۔ میرا تجسس پھڑپھڑا رہا تھا۔ لیکن اُس کا سانس پھر اکھڑ گیا اور اس دفعہ کھانسی کا وہ شدید دورہ پڑا کہ مجھے وہ کھانستی ہوئی پتلی سی رگ، جو زندگی کو اٹکائے رہی تھی ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مگر وہ نہ ٹوٹی اور وہ پھر بولنے لگا۔

رام سرن کی ساری کہانی میں نے سن لی۔ گوپال جو ایک گنوار لونڈا تھا۔ گاؤں سے

بملا کے ساتھ آیا تھا۔ بملا نے کہا تھا کہ یہ لونڈا بیکار ہے۔ پڑوس کا بھائی ہے۔ اُس کے والد نے بملا کو بھی پالا تھا اسے اپنے بچوں کی طرح رکھتا تھا۔ بملا کی چاچی نے بھی اسے نوکری دلوانے کی سفارش کی تھی۔ چنانچہ وہ انہی کے گھر میں رہنے لگا اور اس دن تک رہتا رہا جب تک رام سرن کو شک نہ ہو گیا۔ اس نے جو تفصیل سنائی اس میں قدرتی منزلیں تھیں۔ منزلوں میں تعلق تھا اور مجھے ایک تسلی سی ہو گئی۔ میری مشکل آسان سی ہونے لگی کہ بملا اسی دنیا کی ہے۔ غیر مجسم "ابدیتوں" کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہیں۔ وہ انسان ہے چھوٹے چھوٹے میٹھے میٹھے موقعوں کی متلاشی۔

میری مُسکراہٹ کو رام سرن نے غلط سمجھا۔ اُس نے ایک پٹے ہوئے بچے کی طرح منہ بنا لیا اور التجا بھرے لہجے میں کہنے لگا: "بھیا جی۔ بملا میری جورو ہے۔ تم مان لو۔"

اس کی آنکھوں سے دو تین قطرے اس آہستگی سے نکلے جیسے اندر اندر کوئی اُس کی سوکھی ہوئی زندگی کو نچوڑ رہا ہو۔ ڈوبی ڈوبی آنکھوں کے یہ قیمتی قطرے ابھری ہوئی ہڈیوں پر سے ڈھلک کر جیسے میرے دل میں گرنے لگے۔ لیکن وہاں جیسے بملا بیٹھی تھی اور جوں جوں اُس نے اس کا برا کہا تھا وہ مجھے بھلی ہوتی دکھائی دی تھی ——— "بچی کہیں کی شیطان سی۔ اچھا؟ اچھا؟ اچھا؟" اندر اندر ہی میری رگیں بولنے لگیں اور میں اس کو اور اُس کے آنسوؤں کو دیکھتا ہوا بھی مسکرا رہا تھا ——— لیکن ایک بات کا اچنبھا تھا۔ میں اس کا اکیلا بہنوئی، کئی بار اس کی تھاہ لی تھی میں نے بھی، ایک بار بھی اس نے میرا حوصلہ نہ بڑھایا، میری واضح پیش قدمیوں پر بھی۔ پھر وہ گنوار چھوکرے پر......... ؟؟؟

رام سرن کی آنکھوں سے وہ تینوں قطرے نکل چکے تھے اور اب وہ سوکھی ہچکیاں لے رہا تھا۔

"بھیّا جی وقت آگیا ہے میرا ——— ؟ موت سے کوئی بھی نہیں بچا رے گا مجھے؟ شاید بچ جاؤں بھیّا جی۔ موت سے تو میں بہت ڈرتا ہوں اب۔ اب بہت ڈرتا ہوں بھیا جی۔"

"کیوں ایسی باتیں کرتے ہو رام سرن؟ میں اُسے ٹالنا چاہتا تھا۔ اپنے خیالوں میں اُس کا متواتر

دخل مجھے بہت ناگوار گزر رہا تھا۔ لیکن وہ بولتا ہی گیا۔

"اوہو! تم نے یہ سمجھا کہ مجھے زندگی پیاری لگنے لگی؟ غلط سمجھے بھیّا جی غلط سمجھے۔ میں تو مرنا چاہتا ہوں اور جانتا ہوں کہ اگر میں چاہوں بھی نہیں تب بھی مروں گا۔ اب "وقت" آگیا ہے۔ لیکن میں ابھی نہیں مرنا چاہتا۔ ابھی تو اس نے مجھ سے سچ سچ کہاں کہا؟ اس کا "جھوٹ" میری آتما کا بھی پیچھا کرے گا۔ آتما کا بھی ...... بملا سے تم ہی کہہ دو کہ وہ سچ سچ بتا دے۔ اس رات کو وہ معمول سے پہلے کیوں جاگی تھی۔ منہ اندھیرے کیوں نیچے گئی تھی۔ اس نے............ اس نے......."

باقی کہانی اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی اور میں نے وقفہ کا فائدہ اٹھا کر اسے سنا دیا:۔

"اگر وہ کہہ دے کہ اس نے وہی کیا۔ جو آپ کا خیال ہے تو؟"

اس جملے کو پتھر کی طرح پھینک کر میں کمرے سے باہر آگیا۔ میں اس کی بھونڈی صورت کو اور بھونڈی ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ کمرے کی گھٹی گھٹی اور گھناونی فضا سے باہر آکر میں نے رسوئی کا رخ کیا۔ کھلی کھلی ہوا نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ میں ایک نئے قدم کو من ہی من میں بناتا بملا کی طرف بڑھا۔

لیکن بملا یہ باتیں سنتے ہی بہت سٹ پٹائی۔ میں اس حیرانی میں وہیں گڑ گیا کہ یہ جنگل کی ہوا کیسی تھی کہ بملا بھی ذرا سی بات سے گھبرا اٹھی۔ کہنے لگی: "بھیا جی ان کا دماغ چل گیا ہے، اونچائی کی ہوا راس نہیں آرہی۔ وہ ایسی باتیں نہیں کرینگے"۔ پھر مجھ سے بھیک سی مانگنے لگی:

"وقت ضائع مت کرو بھیا جی، ڈاکٹر کو بلاؤ،......" بملا کے سامنے مجھے اس کی بات پر فوراً یقین آگیا۔ لیکن آر کیٹریا سے باہر آتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ دھڑکنوں سے ڈرتی جھجکتی دعائیں اٹھنے لگیں کہ رام سرن کی ہڈیوں کو کچھ بھی ہوا ہو اس کا دماغ بھگوان کرے ٹھیک ہو۔ اس نے جو باتیں کہی ہوں صحیح ہوں۔ نہیں تو ...... نہیں تو میں ایک بنیادی غلط فہمی کا شکار تھا۔ گوشت پوست سے دور کی محبت کو تو میں نے ابھی ابھی رد کیا تھا ـــــ رام سرن سڑی نہیں ہو سکتا، بملا رام سرن سے محبت نہیں کر سکتی۔ میرے دل کی دھڑکن "نہیں، نہیں، نہیں"

کرتی گئی اور میں ڈاکٹر کی کوٹھی کی طرف بڑھتا گیا۔

ڈاکٹر ڈھینگرا نے بھی کہا کہ رام سرن کا وقت قریب ہے۔ بملا نے پھر اس کے دماغ کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر نے کہا کہ اس حالت میں دماغ کا خراب ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

بملا نے یہ سوال دروازے پر آ کر کیا تھا اور قدرے اونچی آواز میں کیا تھا اور ڈاکٹر کے جاتے ہی رام سرن نے بملا کو اندر بلایا اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔" کیا کہا ڈاکٹر نے کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟" ــــ "ہائے ہوئی بھیا جی۔ ان کو کیا ہو گیا ہے ...." بملا یہ کہتی ہوئی، راتی ہوئی سی ڈر کے مارے کمرے سے باہر آ گئی۔

لمحہ بھر کے لیئے رام سرن کا چہرہ اس کی چادر کی طرح سفید ہو گیا۔ پھر ایک اور رنگ چھا گیا جیسے لٹھے کی چادر میں، کفن کی سفیدی میں چیڑ کا رنگ گھل گیا ہو۔ پھر یہ رنگ دھیمے دھیمے مدھم ہوتا گیا اور اس کا اپنا رنگ جم گیا۔ وہی پچکا ہوا ٹین اور دو زنگ آلود سوراخ۔

اس رات کو رام سرن کا بخار بھی کم ہوتا ہوتا اتر گیا۔ اس رات وہ خوب سویا بھی اور جب دوسری صبح اس کی آنکھیں پھر کھلیں، اس نے مانگ کے ٹوسٹ کھائے اور مجھے اس کی حالت میں ایک تبدیلی آتی محسوس ہوئی۔ ان چیڑ کے پیڑوں میں مجھے معجزے دکھائی دینے لگے۔ وہ کھا پی کے پھر سو گیا۔ دوپہر کو، سہ پہر کو، رات بھر تک۔ جیسے برسوں جاگنے کے بعد اسے پہلی بار سونے کا موقع ملا ہو۔

پھر وہ تیسری صبح آئی جب رام سرن کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی اور ہونٹوں پر رنگ سا جیسے مسلسل نیند نے اُسے تازہ کر دیا ہو۔ لیکن دودھ پیتے ہی وہ پھر جھونکے لینے لگا اس کی گردن ایک طرف کو لٹکنے لگی اور اس کے تکیے ایک ایک کر کے نکال دیئے گئے۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں بھی کھول دیں جو اتنی کھلیں کہ باہر آتی ہوئی دکھائی دیں۔ شاید اس کی یہی آرزو تھی کہ یہ آنکھیں ہمیشہ کھلی رہیں۔ رات کی تاریکیوں میں بھی کھوجتی رہیں۔ لیکن بملا نے رسم کے مطابق اپنی انگلیاں اس کے پپوٹوں پر رکھ دیں اور اس کو ہمیشہ کے لیے بند کیا۔

اب چیڑ کے ملبے ملبے بھوت تھے، میں تھا، بملا تھی اور رام سرن کی ٹھنڈی لاش۔ چیڑ کے اداس سایوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہٹیں تھیں۔ جن میں ٹی۔بی کی کھانستی ہوئی، کراہتی ہوئی لاشیں تھیں اور مجھے اب تن درست انسانوں کی ایک جماعت کی ضرورت تھی۔ چیڑ کے درختوں کو بھوتوں کو لاشوں کو میں کیا کرتا؟ مجھے تو رام سرن کی لاش کو نہلانا تھا، کفنانا تھا، ارتھی پر سوار کرانا تھا اس جنگل سے لے جانا تھا، پھسلتی ڈھلانوں سے اور پہاڑ کے ٹیڑھے گھٹنوں سے اتارنا تھا۔ جنگل کے راستے میں بڑے موڑ توڑ تھے۔ کئی ڈھلانیں اتر کر، کئی چڑھ کر انسانوں کو جلانے کی جگہ آتی تھی۔ اس وسیع اور گھنے جنگل سے بہت دور۔

لیکن آرکیڑیا کا خضر چوچا رام کرایہ دار کی اس "ضرورت" کے لئے تیار کیسے نہ رہتا۔ دیکھتے دیکھتے وہ سامان لے کر آیا۔ اور اس کے ساتھ اسٹیشن کے چھ قلی تھے جو لال لال وردیاں پہنے ہوئے بھی بڑے برہمن سے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ماتم کی مستقل لکیریں تھیں نہ جانے کتنوں کو لے جانے آتے ہونگے، وہاں ٹی۔بی کے دو ہسپتال تھے اور آرکیڑیا کا سارا جنگل لے جانے والے یہی تھے۔ بڑے تجربہ کار تھے۔ دیکھتے دیکھتے ارتھی تیار کی اور رام سرن کو لے کر چل پڑے۔ تھوڑے سے رپلوں کے لیے ——— "اہہ اہہ اہہ بھیاجی پیسہ"

بملا خاموش بیٹھی یہ سب تماشہ یوں دیکھی رہی جیسے دیکھنے کے سوائے وہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ میں اس کی بے حسی سے اکتا گیا۔ یہ موقع رونے دھونے کا تھا۔ آنسو پنچھوانے کا۔ دلاسے سننے کا۔ میں اس کا بہنوئی، اس کا ایک رشتہ دار اسی کے پاس کھڑا تھا۔ اب میرے سوا اس کا اور کون تھا؟ لیکن وہ بُت بنی رہی۔ ایک بھی آنسو نہ گرایا جس کو پونچھ کر میں ارتھی کے ساتھ چلا جاتا لیکن پھر میں چلا ہی گیا۔ یہ سوچ کر کہ اس کا صدمہ گہرا ہے۔ اس کی آواز سوکھ گئی ہے اور اس کے آنسو جل گئے ہیں۔

واپس آکر میں نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ بملا وہیں بیٹھی ہے اور جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا۔ میں اپنے چہرے کو ان زاویوں میں کھینچتا رہا کہ ایک گہرا رنج ظاہر ہو اور نظروں میں

ایک سنجیدہ فلسفہ ہو، آواگون کا، بھگوان کی مرضی کا، پرلوک اور شولوک کا اور ساتھ کنکھیوں سے دیکھتا بھی گیا کہ ہوش میں ہے کہ نہیں۔ میں اس کے پاس آکر بیٹھ بھی گیا۔ مگر وہ ابوالہول کی طرح دور جنگل کے دروازے کو دیکھتی رہی میں نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا: ــــــ "راکھ ہو گیا بچارا صبح تک باتیں کر رہا تھا" ــــــ لیکن بملا تھی کہ گم صم بیٹھی رہی۔ میں نے پھر رام سرن کی کئی خوبیاں گنیں، لیکن نہ معلوم اس دروازے میں کیا تھا جس سے اس کی نظر نہیں ہٹتی تھی۔ شاید غم کی دیوانگی میں وہ رام سرن کو واپس آتے ہوئے دیکھ رہی تھی ــــــ بیٹھے بیٹھے میرا دل پھر دھڑکنے لگا اور چتا کے شعلوں کو یاد کرنے لگا۔ جیسے اِن دھڑکنوں کو دبانے کے لیے چتا کی یاد ضروری تھی۔ "راکھ ہو گیا بچارا" بملا کو کیا اب تو میں اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ پھر تیزی کے ساتھ اسی دل میں حوصلہ افزا خیال آنے لگے بملا کا سرپرست میں ہی ہوں، میں ہی ہوں۔ بملا ہوش میں آکے رہیگی۔ اُسے ہوش میں آنا پڑے گا۔ میرے پاس اب وقت ہے۔ وقت جو توازن پیدا کرتا ہے۔ پرانی یادوں کو مٹاتا ہے، نئی امیدوں کو بناتا ہے ــــــ اگر بملا نے صدمے سہے ہیں میرا فرض ہے کہ اسے آرام پہنچاؤں۔ اس کی زندگی کو خوش گوار بناؤں۔ اسے اپنے گھر لے جاؤں۔ میری بیوی بھی تو اُس کی بہن ہے۔ سمجھ دار ہے۔ بیوہ بہن کو کہاں پھینکے گی اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ میں نے اس کی ٹھنڈی تاروں کو اُس وقت نہیں چھیڑا اور دل ہی دل میں کہا: "دیکھ لے جی بھر کے دیکھ لے، اس کاٹھ کے دروازے کو"

رات پڑنے تک وہ وہیں بیٹھی رہی اور جب سامنے کا پیڑ بھی تاریکی میں گھل گیا۔ بملا برآمدے سے اٹھی۔ کمرے میں جاکر چارپائی پر گر سی پڑی۔ میری اپنی امید جاگ اٹھی اور میں آگے بڑھا سمجھا تھا کہ تھکاوٹ نے اس کی بے حسی دور کر دی ہے۔ ہوش میں آکر اُسے دلاسے چاہییں لیکن اس نے مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر چارپائی پر ایسی حرکتیں کیں کہ میرے قدم رک گئے۔ "ابھی نہیں ابھی نہیں"۔ میں اپنے آپ کو کوستا ہوا باہر آگیا۔

وہ پہاڑ سی رات میں نے کمرے کے برآمدے میں جاگتے ہوئے کاٹی جنگل جیسے مہاکال کے منھ میں آگیا تھا۔ اندھیرے کی موٹی تہوں میں سامنے کی دیوار تک نہ دکھائی دیتی تھی۔ گھنا

جنگل، کالی رات، درندے بھی ہو سکتے تھے۔ وہاں، درندے میں نے دیکھے نہیں لیکن کھٹمل مجھے کھائے جارہے تھے۔ جنگل کی سردی میں بھی یہ جنگل کے کھٹمل کتنے وحشی ہوتے ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا تھا کہ ایک ایک کھٹمل میں ٹی بی کے کتنے جراثیم ہو سکتے ہیں۔ پھر نہ تو میں اپنے کمرے میں سو سکتا تھا۔ نہ بملا کے۔ نہ اُدھر نہ ادھر۔ عجیب رات تھی وہ۔ فضا میں سردی بھی تھی۔ اور بملا کے گرم گرم سانس بھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ ساتھ اُس کے گرم سانس برقی روئیں بھیج رہے تھے۔ عجیب کیفیت تھی، کہیں ٹھنڈی کہیں گرم، کہیں دبتی ہوئی کہیں بھڑکتی ہوئی۔ ڈر بھی اور تڑپ بھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کو تو میں سہہ لیتا، وہ جو اندر سے مشعلیں چلی آرہی تھیں انہیں روکنا مشکل ہو گیا۔ بس ارادے کرتا رہا کہ ایسی دوسری رات نہیں دیکھوں گا۔

چوتھی صبح ہوتے ہی میں دھرم پورہ سے دہلی آنے کی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ لیکن بملا پھر وہیں برآمدے میں آبیٹھی۔ میرے سوالوں کا اُس نے جواب ایک بھی نہ دیا۔ لاڈ کا موقع تو تھا نہیں۔ میں نے ایک بااختیار سرپرست کی ترشی سے کہا: "اٹھو بملا۔ تیاری کرو، پاگل مت بنو، جنگل میں کہاں تک رہا جائے گا" لیکن بملا گم ہو گئی تھی۔ اس کی بے حسی میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ ایک ٹک دیکھتی رہی اُسی دروازے کو۔

میں نے چوچارام کو آواز دی اور ہم دونوں ریل کے ٹکٹ خریدنے گئے۔ آخری انتہائی پر چوچارام نے اپنی جیب میں سے تار کی ایک رسید اور دو آنے نکال کر میرے ہاتھ میں رکھے۔ کہا کہ بملا نے اُسے ایک تار ہندی میں لکھ کے دیا تھا۔ کہا تھا کہ سٹیشن پر جہاں تار گھر بھی ہے۔ تار کا ترجمہ کراؤ۔ وہ تار اسی وقت بھجوانا چاہتی تھی اور چونکہ میں اس وقت مردے کو کفنانے میں مصروف تھا۔ اس نے چوچارام کو تاکید کی تھی کہ مجھے ترجمہ کے لئے پریشان نہ کرے۔

اس تار کی رسید نے میرے دل میں نئی دھڑکنیں پیدا کیں۔ جن کو دبانے کے لئے میں نے اپنے دل میں ایک ڈر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ بملا کا دماغ خراب ہو گیا ہے یہ جو گم ہو گئی ہے اس نے رام سرن کے نام تار دیا ہوگا — ہم نے ٹکٹیں لیں اور میں جلدی لوٹ آیا — آ کر دیکھا

میں گھستے ہی میں نے ایک لڑکے کو جنگل میں قدم بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ وہی تھا وہ جوان رام سرن کی کہانی کا گنوار لونڈا گوپال لونڈا؟ گوپال اب ایک ڈراونا جوان ہو گیا تھا۔ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ہرٹ کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے قدم ایسے اٹھتے تھے، جیسے ایک ایک پیڑ کو توڑ پھینکیں گے۔ اس کے خوف ناک قدم جیسے میری ٹانگوں کو ڈرانے لگے۔ میں وہیں گڑ گیا اور گوپال آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُدھر برآمدے میں سے ایک سایہ سا اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ یکایک سارا جنگل بملا کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ برآمدے میں جوان نے اپنے لمبے لمبے بازو پھیلائے اور ایک لمحے میں ان بازوؤں کی وسعت میں بملا غائب ہو گئی۔

"بدمعاش! خصم خور!" میں وہیں سے چلانا چاہتا تھا۔ لیکن میرا گلا بھی سوکھ گیا تھا۔ کیونکہ گوپال اور بملا کی جڑی ہوئی تصویر جنگل کی ہریالی میں جان سی ڈال رہی تھی۔ لاشیں زندہ سی ہونے لگی تھیں، درخت جھومنے سے لگے تھے اور مجھے اپنا آپا رام سرن کی خالی چارپائی سے بھی بُرا لگنے لگا تھا۔

پھر مجھ سے کسی نے بات تک نہ کی۔ وہ دونوں سامان باندھتے رہے۔ چوچا رام نے ان کو قلی لا کے دیئے اور جب وہ چل دیئے چوچا رام کی بیوی نے مجھ سے پوچھا: "سالا ہو گا آپ کا بابو جی۔ بی بی جی کا بھائی؟" میں نے ایک ایسی لمبی آہ کھینچی جس میں سے ایک "ہاں" بھی نکلی۔ اور اب میرا کلیجہ کھُرچا جا رہا تھا۔ میں نے چوچا رام کی بیوی سے روٹی مانگی اور کھا کے وہیں دھوپ میں سو گیا۔ یہاں نہ کھٹمل تھے نہ کسی کے سانس، خوب سویا اور اُس وقت جاگا جب سورج غروب ہو چکا تھا۔ پھر میرے سامنے ایک واجب سوال تھا کہ اب میں کیا کروں۔ جواب کی کھوج میں میری نظریں بھی دور اسی دروازے کی طرف مڑیں۔ دروازے کے پیچھے وہی چیڑ سے ڈھکی ہوئی ڈھلانیں تھیں۔ رات کے سائے بڑھے چلے آ رہے تھے اور چیڑ کے درختوں پر رنگ رنگ میں چھا رہے تھے: پچھلی قطاریں نیلاہٹ میں لپٹی جا رہی تھیں۔ اگلی قطاریں آسمانی رنگ میں، ان سے اگلی مونگیائی میں جو چیڑ میرے سامنے تھے وہ تھے قدرتی، چیڑ کے

رنگ کے۔ یہ پیڑ سب ایک رنگ کے ہیں میں نے سوچا، لیکن روشنی کا جادو ہے۔ کہیں ایک رنگ دکھائی دیتا ہے کوئی دوسرا۔ نہیں تو وہ پیڑ بالکل وہی ہیں جو یہ۔ آدمی روشنی کے پھندے میں کیوں آئے۔ اُسی رات کی گاڑی سے میں سیدھا اپنی بیوی کے قدموں پر آگرا اور کہا: "رانی تم کتنی سندر ہو۔ کتنی بھلی ہو، دیوی ہو تم دیوی۔ دو بہنیں لیکن دو میں کتنا فرق؟" ــــــ اس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہی اپنا پرانا جملہ شروع کیا۔ "یہ آپ کی غلط ...." میں نے اُسے جملہ پورا کرنے نہ دیا۔ پہلے کی طرح قہقہہ نہیں مارا۔ اُس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔☆

اخ تھو

۱
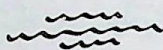
مچھلی پکانا آسان نہیں ایک فن ہے۔ لبسا ہند کو فلیور (FLAVOUR) میں تبدیل کرنا اور لبسا ہند جتنی تیز ہو اتنا ہی فلیور پیدا کرنا آسان کھیل نہیں۔ عورت بھی نہیں کر سکتی۔ وہی کر سکتا ہے جس نے مچھلی کی موچھ موچھ کا تجزیہ کیا ہو، جس نے راتوں بیٹھ کر تجربے کئے ہوں، جس کی ناک حساس ہو کہ بھاپ کے ایک ایک درجے کو سونگھے اور پہچانے۔ لبساہند سے فلیور تک کئی موڑ ہوتے ہیں، کئی منزلیں۔

اور اس دن جب مینھ برس رہا تھا اور چھٹی کا دن تھا۔ مچھیرا ایک بڑا سنگھاڑا بنگالیوں سے چھپاتا ہوا میرے پاس لے آیا۔ مچھلی کا جسم اکڑا ہوا یعنی تازہ تھا۔ کینٹوں کے نیچے اس کا لہو ابھی سرخ تھا۔ مچھلی کو دیکھ کر ہی میرے منہ میں پانی آیا۔ یہ مال کسی اور کے سپرد کیسے کرتا؟

کڑاہی میں تیل کڑکڑانے لگا۔ تیل کے بھنور سے لہریں اٹھنے لگیں۔ کبھی آنکھوں پر،

کبھی کپنپٹیوں کے اندر اور کبھی منہ کے اندر رطوبت کو جلانے لگیں۔ اور مونچھ سمیت سر زاویوں اور قوسوں پر بھی لال ہونے لگا۔

جب مچھلی اُبلنے لگی، تیل کی ماری ہوئی بساہند، ریڈیائی لہروں کی طرح فلیور بن کے نکلنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ گرم گرم فلیور باہر پانی میں نہیں جائے گا، گھر کے اندر ہی گشت کرتا رہے گا اور جب ہم نے جی بھر کے کھا بھی لی وہ مچھلی ایک ایک سانس میں بسی ہوئی تھی جو ہم نے لیا۔ رہی سانس، وہی ڈکار، وہی گرم گرم لذت، بیٹھک میں ایک مستی کا عالم تھا اور مجھے اوروں کا تو پتہ نہیں میں خود ایک کیف کے استقبال میں کھویا جانے لگا......

دیکھتا کیا ہوں کہ ہمارا دروازہ مچھلی کے منہ کی طرح کھل گیا اور میں زبان ماہی کی تلاش میں اسی منہ میں گھس گیا۔ لیکن وہ منہ کیا ایک دروازہ تھا، مچھلی کی کھوپڑی کھلی تھی، زبان ملی نہیں اور میں دوسری طرف جا نکلا۔

مجھے اس بات پر بھی حیرت نہ ہوئی کہ اسی دروازے کے پار ایک اَن دیکھا بازار گرم ہے۔ وہاں وہی اپنے بازاروں کی گہما گہمی اور چمک دمک تھی، لیکن افراتفری نہیں تھی۔ بازار قرینے سے لگا ہوا تھا اور لوگوں کی رواروی میں بے قراری نہیں تھی، بھیڑیں تھیں۔ لیکن بھیڑوں میں کھلبلی نہیں تھی۔ جسکا چہرہ دیکھو روحانیت ٹپک رہی ہے، جذبات کا ٹھہراؤ ہے نظروں میں تجسس نہیں۔ ہر قدم ایک فیصلے کے تحت اٹھتا ہے۔ ایک منظم سماج رواں دواں ہے۔ جی رہا ہے اور قرینے سے جی رہا ہے۔

دیکھا کہ ایک اونچی دوکان کے سامنے ایک لمبا کیو اطمینان سے کھڑا ہے اور چونکہ اپنی عادت تھی۔ میں بھی کیو کی طرف دوڑ کے گیا کہ دیکھوں کیا چیز ملتی ہے دوکان کے اوپر چیلیں منڈلا رہی تھیں اور اتر کے چھینا جھپٹی بھی کر رہی تھیں، ظاہر تھا کہ کوئی عمدہ گوشت بک رہا ہے۔ گوشت کی دوکانیں اور بھی تھیں لیکن وہاں کیو نہیں تھے۔ آگے جا کے دیکھا کہ دکان بڑی ستھری ہے، بیچ میں تین بڑی کامدار الماریاں کھڑی ہیں اور شیشے کے پیچھے تین لمبے لمبے گوشت

لٹک رہے ہیں۔

اس گوشت کی بناوٹ نئی تھی اور اس کا رنگ نہ لال تھا نہ سفید۔ دو رنگوں کے بیچ کا تھا۔ سطح ہموار ایسی کہ جیسے مرغے کا ہو، موٹا ایسا کہ جیسے بکرے کا ہو، نرم ایسا کہ جیسے مچھلی کا ہو۔ اس میں سے چھری جیسے ہوا میں سے گزرتی تھی۔

"مزے آئیں گے آج، جوان ہے یہ جوان"۔ ایک گاہک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ یہ لفظ "جوان" گوشت کے لئے استعمال ہوتے نہیں سنا تھا۔ گوشت برے کا ہو، بڈھے کا ہو، جوان کا نہیں سنا تھا۔ نئے لفظ کو سن کر میرے منھ میں بھی پانی آنے لگا تھا۔ لیکن گوشت خور کتنا ہی وحشی اور ہمہ گیر ہو، نئے گوشت کا نام پہلے سننا چاہتا ہے۔ گردن اٹھا کے دیکھا کہ الماری کی پشت میں سر اور پائے رکھے پڑے ہیں۔ دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگا۔ سر اور پائے تھے تو اندھیرے میں لیکن انسان کے کسی قریبی رشتہ دار کے دکھائی دے رہے تھے۔ میرے منھ میں آیا ہوا پانی گندے لعاب میں تبدیل ہونے لگا اور میرے معدے میں چکی سی گھومنے لگی۔ انجانے میں تھوکنا مناسب نہ سمجھا، پاس کے ایک بوڑھے سے میں نے پوچھا:۔

"میاں یہ کونسی نعمت ہے؟"

"بڑی نعمت بھائی، بڑی" اس نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ لیکن اتنی تیزی میں کہا جیسے میرے سوال کا پورا جواب دیا ہو۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کون سی نعمت میاں؟"

"بھائی بڑی کہہ رہا ہوں۔ بڑی" اُسکے لہجے میں اطلاع تھی طنز نہیں تھا اور ظاہر تھا کہ اس گوشت کا نام بڑی نعمت ہی ہے۔ جیسے ہمارے ہاں حلال اور مہا پرشاد کے نام تھے۔ لیکن میں تو اس گوشت کے جانور کا نام پوچھ رہا تھا اور میں اسی الجھن میں کھڑا تھا کہ ایک درویش رو بزرگ نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور الگ لے کر کہا:

"بیٹا، کیا سوچ رہے ہو۔ آؤ میں بتا دوں۔ اس گوشت کا نام ہے بڑی نعمت۔ روز بکتا

ہے لیکن آج کا گوشت اچھا ہے، جوان ہے، یہ گوشت کبھی کبھی ملتا ہے کیونکہ جوانوں کا شکا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ بوڑھے، بچے اور مادہ تو روز ہی بکتے ہیں ——— اور سنو۔ تم خدا کا نام کھڑے ہو کے لیتے ہو کہ لیٹ کے؟"

"حضرت اس جانور کا نام کیا ہے؟"

"میں سب کچھ بتا دوں گا، تم میرے سوال کا جواب دو"

"لیٹنے کھڑے ہونے کی قید ہی کیا ہے، صاحب؟"

"بس بس پھر ٹھیک ہے۔ تم تو تیسرے قسم کے انسان نکلے، نہ اُدھر نہ اِدھر۔ سنو اگر تم لیٹ کے نام لینے والوں میں سے ہوتے تو تم بھی پھر جوان تھے۔" درویش نے میرے گٹھے گٹھے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— "پھر آج اس دکان پر تین کی جگہ چار گوشت لٹکتے ——— !"

میں دھپ سے سڑک پر بیٹھ گیا۔ ایک آندھی سی چلی اور مجھے اُس درویش کے بال کبھی ٹھوڑی پر لٹکتے کبھی سر پر اچھلتے دکھائی دیئے اور ایک اندھیرے میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خود مجھے الٹا ٹانگ دیا گیا اور میری پیلی پیلی کھال اتار دی گئی اور........ لیکن میں تو تیسری قسم کا انسان تھا، میری کھال کیوں اترتی۔ اس بات کا حوصلہ دیتے ہوئے درویش نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"تم لوگ جھیلی کے اُس پار رہنے والے، بنتے بہت ہو، بڑی نعمت کو کھاتے نہیں، میاں، چکھ کے دیکھ لو ایک بار۔ یہ جو مار مار کے ضائع کر رہے ہو۔"

"بابا۔ بابا......" میری گھگی بندھ گئی اور ٹانگیں جو دوڑنا چاہتی تھیں۔

ہیں ——— "بابا۔ بابا۔ مجھے جھیلی کے پار دھکیلو۔ بابا جھیلی کے پار۔"

"ہوں۔ انسان جیسی نعمت کو کھاتے نہیں۔"

"آخ تھو۔ بابا۔ تھو۔ تھو۔ تھو ووو......"

"تھوکنا تو دیکھئے ان کا۔"

"تھو۔ تھو آخ تھو......"

"انسان کے بند بند جدا کر لیتے ہیں۔ بوٹیاں اتارتے ہیں۔ بوٹیوں کو بھونتے ہیں۔ کھاتے نہیں"۔

"تھُو۔ تھو۔ بابا۔ تھُو۔ کیا کہا؛ بھُونتے ہیں؟ تھُو ہم؟ انسان کی بوٹی کو؟ تھُو۔ تھو۔ تھو۔ بابا۔ انسان! اشرف المخلوقات، کائنات کے ارتقا کی آخری منزل۔ معدنیات و نباتات وحیوانات کا افسر عالی۔ انسان! وہی جس کے سامنے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا، جس کے روپ میں اوتار آئے۔ انسان۔ انسان......"

"ہاں ہاں ــــ یہ بھوننا بھی کیا ہوا؟ ذرا دیکھیے تو........" درویش نے ہاتھ لہرایا اور زمین ایک طرف کھل گئی اور ایک ایسی روح سوز بھبک اُٹھی کہ میں اپنا دامن منھ اور ناک میں ٹھونس کر بھی کراہنے لگا۔ درویش نے میری گردن پر اپنا بھاری ہاتھ رکھا اور مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ غلیظ دھواں اٹھ رہا ہے۔ دھوئیں کے نیچے ایک بستی کا خاکہ ہے کہ وہی اپنی گلیاں ہیں، گلی گلی میں کوڑا جل رہا ہے اور کوڑے میں ادھ جلے لوتھڑے سڑ رہے ہیں۔ دھواں اُن سے بھی اٹھ رہا ہے۔ لیکن کوڑے میں لوتھڑے کی طرح یہ دھواں بھی الگ ہے۔ اس کی رفتار بھاری ہے۔ سمت بھبک میں سڑاہند کے جو تیز ناخن ہیں دھوئیں کی یہی الگ الگ اور گہری لکیریں ہیں۔

"کوڑے میں بھُون رہے ہیں بڑی نعمت کو! دیکھو تو سہی۔ کھٹولوں کے پرانے اور سڑے ہوئے بان، گندی اور گلی ہوئی بوریاں، کالے سیاہ پوکھن، انہی کی آگ میں بھوننا چاہتے ہیں ایسی نعمت کو اور جب تعفن اٹھتا ہے، منھ ناک میں دامن ٹھونسنے لگتے ہیں۔ بدبو نہیں تو کیا خوشبو اٹھتی؟" آنکھیں پھاڑ کے پھر دیکھا تو وہی اپنی گلیاں تھیں، اپنی بستیاں، محلّے کے اس پار کی۔ وہ لوتھڑے نہیں اپنے چہرے تھے۔ یہی ٹانگیں اور یہی رانیں تھیں۔

درویش نے میری تھوکیں میرے اندر ہی اتار دیں، میری دھڑکن دبادی اور جب میں نے چند ایک لاشوں کو بوروں بانوں کی جگہ میزوں کتابوں میں جلتے دیکھا۔ جانے کیوں میں

اُس کی توجہ اس فرق کی طرف دلانا چاہتا تھا لیکن نہ دلا سکا۔ مجھ کو اُس نے بے حس کر دیا تھا۔ اب میں یا تو نیچے کھائی میں یا اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا۔

درویش نے کھنکھار کے ایک موٹا تھوک نکالا اور اسی کھائی میں پھینک کر کہا "آخ تھو اس جہالت پر اور اس گندگی پر۔ یہ بھبک چند لمحے اور آتی رہی تو اپنی فضا خراب ہو جائے گی۔ جانے کیا کیا بیماریاں پھیلیں گی یہاں ــــ" اس نے ہاتھ لہرایا اور وہ کھائی بھر گئی۔

پھر اس نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے ایک گرم خانے کے اندر لے گیا۔ گرم خانے کی دیواروں پر روشنی پھسل سی رہی تھی اور فرش کا رنگ ایسا تھا کہ جیسے دودھ بہہ رہا ہو۔ ایک کونے میں سنہری اینٹوں کا مقبرہ سا تھا جس پر دیوں کی کئی کئی قطاریں جل رہی تھیں۔ ہر دیئے کی لو یکساں تھی۔ لو کا رنگ خونی تھا جیسے کئی چھوٹی چھوٹی بے حس خون سے لتھ پتھ زبانیں باہر نکلی ہوں۔ دیوں کے اوپر چاندی جیسی دھات کے دائرے کھڑے تھے۔ جن پر اسی دھات کے بڑے بڑے ہنڈے چڑھے ہوئے تھے، ہنڈوں میں کچھ اُبل رہا تھا، اُن میں سے پھپکار ایسے نکلتی تھی جیسے ان کے نیچے منوں ایندھن جل رہا ہو اور ہر پھپکار کے ساتھ فلیور کی ایک لیسی لہر نکلتی تھی کہ میری ساری جان باقی جسم کو چھوڑ کر ناک سے دماغ تک جو گلی ہے اسی میں آ بسی۔

دفعتاً اس کمرے کے عقب میں ایک اور دروازہ کھلا۔ جہاں مونچھ سمیت سر تھے، داڑھی دار چہرے تھے، چھلی ہوئی رانیں تھیں، ادھ چھلے پھس پھسے پنڈلے بھری ہوئی پتلیاں، نکلی ہوئی زبانیں۔ گرے ہوئے جبڑے، پھیپھڑے، کلیجے، الم، غلم، خوشبو تھی کہ بدبو، وہاں بسا ہنڈ سے فلیور تک نہ موڑ دکھائی دیئے نہ منزلیں۔ میری جان ناک کی اسی گلی میں پھنس کر پھدکنے لگی نکلی ہوئی زبانوں نے میرے کانوں کے اندر جیسے چیخنا شروع کیا اور میں نے اپنے مونچھ سمیت منھ کو دامن سے لپیٹا اور رونے لگا۔

"بدبو کہاں ہے جو تم منھ کو لپیٹنے لگے، دیکھتے نہیں بڑی نعمت مسالے میں دھوئی جا رہی ہے۔ اور تازہ ہے۔ کتنا اکڑا ہوا گوشت ہے، کنپٹیوں کے نیچے دیکھو لہو ابھی سرخ ہے۔ میاں

یہاں تمہاری ادھوری تہذیب، تمہارے نیم حکیم سائنس کی پھوہڑ ترکیبیں نہیں ہیں۔ بڑی لغمت آگ کے سست پر لپکائی جاتی ہے، مسالے کی بھاپ میں، بڑی لغمت اور پھر بدبو؟"

میرے پاؤں میں ہلنے کی طاقت تو تھی نہیں، میرا سارا بدن ایک جگہ گاڑی ہوئی کل کی طرح کھٹ کھٹ ہلنے لگا اور میرا سر ایک دیوانگی میں اپنے سینے میں گھسنے کی کوشش کرتا رہا ——— جیسے سینہ کھل گیا اور میں اپنے سینے میں گھس بھی گیا۔ دیکھا کہ وہاں کلام الٰہی کی کئی کتابیں پڑی ہیں، کئی زبانوں میں، دائیں سے بائیں، اور بائیں سے دائیں کئی طرح کے حروف ہیں۔ لیکن جب میں نے پڑھنے کی کوشش کی اور محو ہو جانا چاہا وہ حروف مٹتے گئے اور اسی مایوسی میں اندر ہی اندر میری چیخیں نکلنے لگیں۔ درویش بولتا گیا۔

"اور یہ ہے مادہ گوشت، خاص صفائی چاہتا ہے۔ اس کی بوٹیاں یوں نہیں کاٹی جاتیں۔ اس کی لمبائی کے دو کئے جاتے ہیں۔ منھ، ناف اور.......... یہ دیکھو دو ہو گئے۔ اسی لمبائی میں پھانکیں کاٹی جائیں گی۔ عطریات میں دھوئی جائیں گی۔ یہ گوشت میٹھے قوام میں لپکایا جائے گا۔ پھر اس کی وہ چیز بنے گی جس کو زن شیرنی کہتے ہیں، بڑی لذیذ ہوتی ہے۔"

کھٹ کھٹ کھٹ میرا بدن ہلتا رہا اور سر کبھی سینے میں کبھی باہر گھستا اور نکلتا رہا۔ زن شیرینی کی تعریف سن کر میرے منھ میں ایک تھوک جمع ہوا۔ جس کو میں باہر پھینکنے ہی لگا تھا کہ سر اندر گھسا اور وہ تھوک بھی اندر ہی گرا۔ درویش نے پھر ہاتھ لہرایا ———

دیکھتا کیا ہوں کہ وہی اپنی کھلبلی۔ افراتفری اور ایک جلوس، جلوس کیا جیسے ایک جلتے ہوئے شہر کا دھواں جا رہا ہے، وہی داڑھیاں وہی ٹوپیاں، وہی شلوار وہی دھوتیاں، پتھر اینٹیں، نیزے تلواریں اور وہی نعرے اور بھیڑ کے بیچ پانچ پانچ ہلکی ہلکی سفید سفید جھکی جھکی مورتیاں۔ مورتیوں کے اوپر سوت کا دھاگا نہ تھا۔ ان کے وہ خم نمایاں تھے۔ جن کو میں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ میرا سر پوری طرح سینے سے باہر آگیا۔ میں نے گردن اٹھائی اور گرم خانے کے اس بھیانک منظر کی طرف آنکھ کانی کر کے اپنی مورتیوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ اپنے سے لوگ دیکھ کر ہمت سی آئی۔ بدن کا

کھٹ کھٹ رک گیا۔ دل میں انسانی جذبات ابھرنے لگے اور اب تو میں بولنا چاہتا تھا کہ دیکھ یہ ہے زن شیرینی کا وہ خام مسالا جس نے ہمارے ہاں نغموں کو جنم دیا، مصوروں کو اکسایا اور شاہکار پیدا کئے، جس کے سامنے ہمارے شہنشاہوں نے سجدے کئے اور .... لیکن بھیڑ میں ایک درانتی لہرائی اور ایک مورتی کا سینہ بگڑ گیا۔ مورتی گر گئی اور ایک نعرہ بلند ہوا۔ دوسری مورتیوں کی ٹانگوں میں اینٹھن آگئی اور میری جگہ وہی کھٹ کھٹ کرنے لگیں ــــ "توبہ، توبہ اتنے پھوہڑ ہمارے بچے بھی نہیں ــــ یہ چیز بھلا درانتی سے اتارنے کی تھی؟ دیکھو، جیسے چیلوں نے نوچ کھایا ــــ"

میں نے بھیڑ کی طرف پھر دیکھا۔ مورتیاں کالے کہرام میں ایسے گم ہو گئی تھیں جیسے گرجتی ٹکراتی گھٹاؤں نے ننھی منی بجلیاں نگل لی ہوں۔ درویش نے ہاتھ واپس لہرایا ــــ "اور یہ ہے شیرخوار گوشت، اس کی تو بس بریانی بنتی ہے۔ یہ گوشت آنچ بھی کم لیتا ہے اور وقت بھی.........."

"درویش۔ درویش" میرا سینہ بھی جیسے باہر آگیا تھا اور بول رہا تھا، درویش تجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود انسان ہے۔ تیرا بھی گوشت ہے۔ تیرے بچے ہونگے ان کی بھی بریانی بن سکتی ہے۔ درویش" کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ......." درویش، درویش ــــ"

"لیکن یہ گوشت تو اوروں کا ہے، پگلے، ہمارا گوشت کیسے بن سکتا ہے؟" لیکن مچھلی کے اس پار درویش.........." درویش نے ہاتھ پھر لہرایا ــــ پھر وہی کہرام ــــ دھوئیں میں سے ایک سورما نکل آیا اور ایک پہلوان۔ دونوں نے ایک بچے کو دیوار کے ساتھ پھیلایا اور گوشت ملائی میں ایک لمبی کیل ٹھوک دی۔ بچے کا سینہ گری ہوئی ملائی کی طرح بکھر گیا اور نعرے بلند ہوئے۔ کسی نے ایک اور کی بوٹیاں اتار دیں۔ بوٹیوں سے ایک ماں کی گود بھر دی اور کسی نے گن گن کے درجنوں کو آگ

میں جھونک دیا، ایک اور آیا اور اس نے بچے کو تمنزلے سے سڑک پر دے مارا اور بچہ ایک ڈبے کی طرح بکھر گیا۔

"کتنی بریانی ضایع ہو گئی! یہ نقصان یہ چیچپا لیڈر"

اس نے ہاتھ واپس لہرایا اور دیکھتا کیا ہوں کہ سنہری مقبرے پر ایک کڑاہی میں تیل کڑکڑا رہا ہے۔ ایک سر مونچھوں سمیت، آنکھیں کھولے، زاوئے زاوئے قوس قوس پر لال ہو رہا ہے اور تیل کے بھنور سے لہریں کبھی آنکھوں میں کبھی ناک میں گھس کر اندر کی رطوبت کو جلا رہی ہیں ——"

"یہ ترکیبیں، یہ سلیقہ کب آئے گا ان لوگوں کو؟"

کھٹ کھٹ کھٹ "بہ بہ بہ بس بس کر درویش ست ست تم اپنا س س سلیقہ۔"

درویش نے اب تو قہقہہ مار کر کہا!

"بھائی میں کب کہتا ہوں کہ تم لوگ بالکل جاہل ہو۔ میں کہتا ہوں کہ بس ایک قدم باقی ہے۔ بس اتنا ہے کہ تمہاری تہذیب اس منزل کی وضاحت چاہتی ہے جس کی طرف تم آتے ضرور ہو لیکن جھجک جھجک کر، صفائی سے نہیں، سلیقہ سے نہیں —— اور تم جو قسمت سے ادھر آگئے ہو، تمہیں تو انسان بنا کے ہی بھیجیں گے ——"

آخ تھو، تھو، تھو درویش۔ تھو۔ تھو ...."

"تمہیں پاک اور پوتر بنانا ہے۔ زبردستی کھلائیں گے۔ حیوانوں کا گوشت نہیں، گائے اور سُور کا نہیں۔ ہم تمہیں بڑی نعمت کھلائیں گے ——" اور اس نے اس لال لال، کرارے، دیکھتے ہوئے سر کو ایک مونچھ سے پکڑ کر کڑاہی میں سے نکالا۔ میرے معدے کی چکی ایسی گھومی کہ میرا سارا دھڑ ہلا اور میں اُچھل پڑا ——

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھک میں گھر کے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں اور کمرے میں وہی بھیلی بسی ہوئی ہے۔ وہ ہنستے گئے اور میں فلیور سے بھاگتا ہوا

باہر بارش میں سنبھلنے گیا۔

بیوی بھی باہر آگئی ——— "کیوں جی کیا بات ہے ؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ جی مالش کر رہا ہے"۔

"جی مالش کر رہا ہے تو تھوڑی سی مچھلی چکھئے نا۔ کہو تو سر کو لا دوں۔

پانی سے گاڑھا لہو

آخری شہر کی پستی سے بھی ان بلندیوں تک کافی فاصلہ تھا۔ اس جگہ سڑک کے مغربی کنارے پر گھنا جنگل تھا اور اسی میں کہیں ایک آرام گاہ چھپی ہوئی تھی۔ وہاں تک چڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ پھیپھڑے کی پھونکنی قدم قدم پر شہر شہر کی دھول نکال رہی ہے۔ تھک تھکا کر اوپر آگئے ساتھ ہی شام ہوگئی دم لینے کو اندر بیٹھے ہی تھے، نہ جانے کہاں سے بادل آگئے اور برسنے لگے۔ بند کھڑکیوں کے اندر ہی ایک نئے ماحول کے گہرے احساس میں کھاپی کر سو گئے۔

صبح کو پہلی دھند کے ساتھ ایک نئی ہوا جھریوں میں سے اندر آچکی تھی اور ایک جھونکا میری ادھ کھلی آنکھوں میں ایسے لپکا کہ جیسے اس بات کا احتمال ہو کہ کہیں السائے ہوئے پپوٹے پھر بند نہ ہو جائیں۔ جیسے ہوا کے پہلے ایک سوا جھونکے کا جادو ہونا ہو، کہ جیسے آنکھ کے ڈھیلوں کا برسوں پرانا اور چھپا ہوا درد یہیں ابھر آیا ہو کہ جیسے ڈھیلوں کے اس درد کو پہلے ہی ٹھنڈے پھائے

سے ٹھیک ہوتا ہوا اور پھر اس ایک جھونکے کے آدھے ٹکور سے ہی پتلیوں کے بیچ میں سے دو آنکھوں کے تارے گھونٹ بھر بھر پینے لگے اور بدن کے اندر اندر جتنے بھی اپنے راستے تھے، گرد سے اٹے، دبے پڑے، کھنچے تھکے، جلے پتے، راستے ہی راستے، اُوپر نیچے، دائیں بائیں، سب کے سب تر ہو گئے، سب کے سب دھل گئے، ایک ٹھنڈے پھاہے سے، ہوا کے ایک جھونکے سے۔

کمرے سے باہر روپہلی روشنی میں دھندلے دھندلے رنگوں کا ایک بھرا پُرا خواب تھا جو لمحہ بہ لمحہ اُبھرتا گیا۔ ٹھوس حقیقت بنتا گیا اور میرے احساسات حیرت کی ابتدائی منزل سے نکل کر درجہ بدرجہ اس حقیقت کو قبول کرنے لگے اور کہیں اندر روح سے گھلنے ملنے لگے۔

میری اونچائی کے عین مقابل، وادی کے اس پار سر بفلک ایک پہاڑ تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی اُدھر تھی ایک اِدھر۔ بیچ کا گریبان سا ایسے لٹک رہا تھا جیسے پورا کٹا ہوا ہلال ہو۔ ہلال اتنا بڑا کہ خود آفتاب کو گود میں لے لے۔ اسی ہلال کے بیچ میں آفتاب کی آمد کا جلوہ تھا اور اس پیش رو جلوے میں ہی ایک اَن دیکھی دنیا کا ذرّہ ذرّہ الگ الگ ظاہر ہو رہا تھا لیکن الگ ایسا کہ ایک ذرّے کو بھی دیکھو تو تصویر کی تصویر ذہن میں آجائے۔ لیکن اس دنیائے دلگیر اور حسن و مرکب میں گھاس کے تنکے تنکے کا، ہوا کی ہلکی سی اٹھکیلی کا، بوند بوند کی چمک کا، ڈھکی ہوئی اترائیوں کا، ٹہنیوں کے جال میں سے نیلے دُودھیے آکاش کے ٹکڑوں کا، ہری ہری چھتریوں میں سے روشنی کے جزیروں کا، سب کا اپنا اپنا وجود تھا، اپنی اپنی اہمیت تھی۔ ایسی کہ رنگ کی ایک بندیا کو کہیں سے اٹھا لو، کونپل کی ایک جنبش کو روک لو، یا آواز اور خموشی کے توازن کو اپنی ایک انگڑائی سے بگاڑ دو اسی وقت جیسے ایک سنگیت رک جائے، جیسے کئی تار ٹوٹ جائیں۔

اُدھر اپنے پہاڑ کے موٹے پیٹ سے، جنگل کے قدموں پر نہ جانے کن لازوال ذخیروں سے، کن برفیلے پاتالوں سے چھوٹ چھوٹ کر، اور کن نیلے آکاشوں سے چھن چھن کر وہی پانی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا جس کی پیاس لے کر ہم صحراؤں کی خاک پھانکتے ہوئے آئے تھے۔ قدرت کی اس لازوال میں آبِ حیات کا یہ متحرک گوشہ بھی تصویر کے مناسب نقطے پر تھا اور پھولے پھولے سبزے

میں نیلے سفید کی کناریاں کاٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تصویر کی اترتی ہوئی لمبائی میں، اپنا ایک ساز بجاتا ہوا، اپنا ایک سُر الاپتا ہوا سُر جو ساری لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا ہمہ گیر خاموشی میں جان ڈالتا تھا۔ سُر جو اس روح خیز خاموشی کا ہی اہم ترین حصہ تھا۔

ہلال کے مرکز میں اب سفید شعلوں کا چشمہ سا بن گیا اور میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ اپنے پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے ان گنت درختوں کا جو بھاری چھتر تھا وہ سنہری ہو چکا تھا۔ یہ چھتر یہاں وہاں کس مالی نے اُسے تراشا تھا۔ یہ چیڑ ڈھلانوں سے اٹھ کر آسمان کو چھوتے ہوئے۔ کسی ایک میں کہیں خم نہیں۔ ٹیڑھی مٹی سے نکل کر سیدھی کمر کئے ہوئے ان ڈھلانوں کی پھسلن پر یہ کندھے سے کندھا یہ کیسے ملاتے ہیں۔ کہیں دستوں کے دستے پہاڑ چڑھتے دکھائی دیتے ہیں، کہیں منہ کھلی کھائیوں میں رنگ بھرتے ہیں، کہیں تیکھے کناروں کو نرم کرتے ہیں، کہیں پچھلے جاڑوں کی برف پہاڑ کے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ تو اسی پر اپنی چھاؤں ڈال رہے ہیں، کہیں بادل کے ٹکڑے دستہ کھول کر نیچے آگئے ہیں، انہی کو گلے لگا لگا کر سہلا رہے ہیں اور جہاں بھی ہیں دور دور تک بھینی بھینی خوشبو کا ایک ایسا عالم پیدا کرتے ہیں کہ ہر نئی سانس آدمی کے دماغ کو اس حد تک سن کرتی جائے کہ آدمی آدمیت ہی کے حدود میں کھویا رہے۔

لیکن ادھر تکونی تھڑے پر دھوپ آگئی ہے اور میں ایک نئے شیر گرم ماحول میں دن کے اس کنوارے منظر کا واحد مالک ہوں۔ ایک نگاہ اٹھاتا ہوں تو پہاڑ کی جنوبی دُم تک وادی کی وادی میری پکڑ میں آجاتی ہے۔ پانی کے ستارے ہیں یا پتھر کا سُرمئی رنگ، دھان کا ہرا ہرا مخملی بچھونا ہے یا سرسوں کا کھرا کھرا سونا، دور کے چیڑوں کا نیلا دھواں ہے یا پاس کے درختوں کا گیلا گیلا رنگ۔ جہاں جی چاہے وہیں نظریں جماتا ہوں۔ یہاں سے جی بھر جائے۔ وہاں سے پینے لگتا ہوں۔ اِدھر نرم نرم پر نظریں لپٹ سی جاتی ہیں، اُدھر سخت سخت پر دوڑ سی لگاتی ہیں۔ ایک آن میں ساٹھ فٹ اونچے چیڑ پر جا بیٹھتی ہیں۔ دوسری آن میں بہت نیچے اتر کر چشمے میں ڈبکی لگاتی ہیں ــــ اور اگر ادھر دیکھوں شمال کی طرف۔ درختوں نے نظر کے راستے روک لئے ہیں۔ لیکن

یہی بات اچھی ہے کہ جنگل کی چھپی ڈھکی گلیوں میں آنکھ مچولی کھیل لیتی ہیں۔ وہ رہی منتطیل ایک رنگ کے پانی کی، پانی کہاں بہ تو راکھ اور رنگ کے جنگلی پھول ہیں جو ایک منتطیل میں بکھر رہے ہیں۔ وہ رہی بل کھاتی ہوئی سڑک افق کے پاس، سڑک کہاں؟ یہ تو وہی اپنا پانی ہے جو وہاں تک پہونچ گیا ہے۔

سوچ رہا ہوں کہ اس دھرتی پر یہ بھی ہے، ایسا گوشہ بھی جہاں انسان کی ہر بے چینی کو نیند آجائے۔ جہاں زندگی پکارے تو جواب مل جائے۔ لیکن یہ گوشہ کتنی دور ہے۔ زندہ انسان کی بستی سے۔ شاید حقیقت یہی ہے لیکن حقیقت تک فاصلے کیوں ہیں۔ فاصلے؟ منزل کی یہی طاقت ہے۔ طاقت؟ ہاں حسن طاقت ہے۔

میرے سر پر دھوپ آچکی ہے۔ یہ دھوپ ہوا کی خنکی کو مغلوب کر چکی ہے۔ چیڑ کا مخروطی سایہ اور چھوٹا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامنے پہاڑ کے تیور کس گئے ہیں، کہ بیچ میں چیڑوں کی جو میٹھی میٹھی لکیر تھی، وہی لمبی نوکدار اور بٹی ہوئی موچھ سی بن گئی ہے۔ یہ پہاڑ — کون چڑھے اس پر؟ چڑھے تو برسوں کی تربیت پاکر، بچاؤ کے پورے سامان کے ساتھ، آزمائی ہوئی ترکیبوں سے، اور پھر بھی ایک ایسی تپلی، ٹیڑھی، بھجکتی، لڑکھڑاتی لکیر بناکر کہ پہاڑ کے اتنے بڑے پھیلاؤ پر اگر ایک جلتی لکڑی کا دھواں بھی کہیں سے اٹھتا ہو، پہاڑ پر دھوئیں کی وہ اُودی لکیر تو دکھائی دے لیکن چار چڑھتے ہوئے انسانوں کی ننھی قطار نہیں دکھائی دے گی۔ پہاڑ ایک ملک گیر وسعت ہی نہیں بلکہ ایک ایسا وزن ہے جو تخیلات پر بھی بھاری ہو جائے۔ انسان اس کے دامن صدیوں تک کتر تا رہے، پہاڑ کو کھلی جتنا احساس نہ ہو جائے۔ پھر یہ پانی ایک بہتا ہوا راگ ہی نہیں، کہ چھینٹ بھر ہونٹ اٹھا اٹھا کر جھونکے جھونکے کے ساتھ سر ہی ملاتا جائے۔ دیکھا جائے تو اب بھی اس کے بہاؤ میں دھکے ہیں، حملے ہیں، بے حد اضطراب ہے، روڑے روڑے پر دھاوا ہے۔ چٹانوں پر چڑھائی ہے، اور اس میں طاقت ایسی ہے کہ ایک طغیانی سے نظام عالم کو توڑ دے اور ہوا کے یہ معصوم سے جھونکے جو صبح صبح مرہم لئے گھوم رہے تھے......

یکا یک میرے دماغ میں بات آگئی کہ آرام گاہ کی کھڑکیاں خوب اچھی طرح بند ہیں اور اس کمرے کی طرف دیکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خواہ مخواہ بے لگام وسعتوں میں کھویا ہوا تھا۔ ادھر ایک نظر میں گھر لوٹ سا آیا۔ یہ کمرہ ــــ درحقیقت حسن کا گہوارہ یہی تھا۔ مطلب یہ کہ باہر جو حسن تھا، بکھرا بکھرا سا تھا، آوارہ سا تھا، زور نما اور مغرور سا۔ وہی یہاں میرے کمرے میں آکر سمٹا سمٹا سا تھا، اپنا اپنا سا تھا، پیالے بھرتا ہوا سا، بلائیں لیتا ہوا سا، سامنے پہاڑ تو عظیم الشان ہے، جہانگیر ہے لیکن یہی اس چھوٹے سے گھروندے میں میری خدمت میں حاضر ہے۔ جگر کے ٹکڑے ہیں اسی کے یہ جو کٹ کٹا کے، گھڑ گھڑا کے قرینے سے جڑ کے میرے قدموں کے لئے زینے بن گئے ہیں۔ میرے کمرے کو استواری کے ساتھ اپنے سر پر بٹھائے ہوئے ہیں اور وہاں دھوپ کی آگ ہے یا بجلی کی کڑک، وہ ہی میرے کمرے کی روشنی ہے۔ ادھر دوڑتا دہاڑتا پانی پہاڑوں کو چیرتا نکل آئے۔ بڑے بڑے چٹانوں کو بہاتا لائے، جھاگ بھرے منہ سے آسمان سر پر اٹھاتا جائے یہاں میرے کمرے میں وہی نلکیوں میں خم کھاتا، موڑ موڑ پر سجدے کرتا، چپ چاپ چلا آتا ہے اور میں جہاں چاہوں، جتنا چاہوں، جس وقت بھی چاہوں اسی کی مٹھاس سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔ واقعی قدرت حسین ہے تو یہاں ہے میرے اپنے کمرے میں، جہاں دھوپ کے سات رنگ تو ہیں لیکن اس کی تپش نہیں، جہاں پانی میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے اور زور بالکل نہیں اور ہوا جو اندر ہے اس میں مرہم ہی مرہم ہے۔ آندھی نہیں ہے ــــ

تو پھر اس حسن کی قوت کہاں گئی؟ قوت؟ قوت؟ ہے تو ہمارے بازوئے توانا میں، ہماری اپنی ترکیبوں میں۔ جنگل کا یہ درخت بہت اونچا تو چلا گیا ہے۔ لیکن میرا جی چاہے تو چار چوٹیں ادھر اور رسی کا ایک پھندا ادھر۔ تھر تھراتا کانپتا ہوا۔ آسمان کی ٹھنڈی گود میں سے اپنے سر کو کھینچ نکالے گا۔ اور زمین کی لمبائی ناپتا ہوا میرے قدموں میں دھڑام سے آگرے گا۔ پھر کھڑا تھا تو مجھے ڈھکا ڈھکا یا اچھا لگتا تھا۔ اس کی چھال میں بھی ایک کشش تھی لیکن اب تو میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے، میرے اشاروں کا منتظر ہے۔ اس کی یہ چھال کتنی بے معنی لگتی ہے۔ چھال

ہے تو اس میں سیدھی آری چلے یا کوئی کیل ٹھک جائے ـــ میرا پلنگ ـــ ہاں یہ بھی کبھی ڈھکا ڈھکایا جنگل کا باسی تھا۔

پھر یہ فاصلے ـــ ؟ کس نے کہا یہ قوت ہے ؟ پہاڑ ـــ ؟ کس نے کہا یہ دیوار ہے ـــ ؛ ہم چاہیں تو ان بٹی ہوئی موچھوں کے بیچوں بیچ ایک کالی سرنگ ایسی نکالیں کہ پہاڑ کا چہرہ تو چہرہ اس کے اندر خانوں کی قلعی کھل جائے۔ نہیں تو اوپر اوپر ہی اس کی ہریالیوں میں ہم مٹیالی راہیں کھودیں گے، اس کی چوٹیوں پر بھاپ پھینکتے ہوئے جہاز اڑائیں گے اور اس سوئی ہوئی وادی کو ہلادیں گے، جگادیں گے اور یہیں اپنی ہواؤں پانیوں میں اپنا شہر بسائیں گے۔ بازار سجائیں گے۔ جہاں ہوٹل جگمگائیں گے اور ایک شور اٹھے گا۔ انسان کی قوتِ تعمیر کا جو صورتِ عالم بدل دے۔ انسان کی حدودِ خواہش کا جو آسمانوں سے آگے جائے اور جب خیال سے خیال ٹکرائے گا، فلسفے سے فلسفہ، ادارے سے ادارہ۔ ایک نئے نظام سے دوسرا، جب مناظرے ہوں گے، مقابلے ہوں، گے، الگ الگ رنگ لہرائیں گے۔ ان پہاڑوں پر وسعت کا گھمنڈ رہے گا نہ وزن کا۔ اس حسن تک فاصلے رہیں گے نہ فاصلوں کی قوت۔ اور یہ پانی ـــ

ہاں یہ وادی آخر اتنی بے جان نہیں ہے۔ اِس وقت بھی، ہاں، وہ، چشمے کے کنارے پر چشمے کے پانی سے، ایک عورت اپنے برتن مانجھ رہی ہے۔ ہونہہ۔ ایسا لگتا تھا۔ پانی کی چمک برتن کے سائے کو بھی نہیں سہے گی۔ لو۔ جل کرنوں کی نازک سلوٹوں پر، بھاری، بھاری، موٹے موٹے، دائرے پھیل گئے اور وہ رہی دوسری عورت، وہ تو کپڑے دھونے لگی ہے۔ اس طرف تو صابن کی پھولی پھولی جھاگ تیرنے لگی ہے، جھاگ کے نیچے وہ چم چم کرتے ہوئے ہیروں کے نخرے کہاں ـــ ؟ ایک عورت کے ایک کپڑے سے اتنی ساری وہ جھاگ بھی نکل رہی ہے اور جھاگ کے نیچے پانی کی ایک بھیلی بھیلی مونگیائی لکیر بھی مزے مزے چل رہی ہے۔

بہر حال چشمے کا پانی اچھا ہے۔ کہتے ہیں یہاں آکر بھوک بڑھ جاتی ہے کہتے ہیں کہ یہاں کے مرغے بڑے لذیذ ہوتے ہیں۔ خود اس جگہ کا نام مرغا ہے۔ مجھے کل شام آتے ہی اتنی بھوک

لگی تھی کہ صبح کے ناشتے کی فکر ہوئی تھی چوکیدار نے کہا تھا کہ تین دکانوں پر مشتمل بازار میں مرغیاں ہی مرغیاں ہیں اور سب مرغیوں میں ایک ہی مرغا۔ مجھے مرغیوں سے نفرت ہے۔ میں نے کہا تھا جس دام مرغا ملے، اٹھا لاؤ ـــــ

ہیں ـــــ ؟ وہی تو ہے۔ چوکیدار ـــــ نیچے ـــــ چشمے پر ـــــ مرغا حلال مرغا ذبح ہو رہا ہے ـــــ یہ بات! کیا جاندار مرغا ہے۔ کیا تاج دار مرغا ہے۔ لہو کی لکیر اتنی گاڑھی ہے کہ دور تک پانی کی پیٹھ پر سوار ہے۔!

زندگی کا گھونٹ

قدرتی بات تھی کہ گھر سے باہر کی آب و ہوا ہی مجھے راس آتی تھی۔ گھر بھابی کا تھا، چلو میرا بھی سہی۔ لیکن گھر کی چھوٹی سی چار دیواری تھی جسمیں ایک طرف وہی برسوں کے بھائی صاحب گھر میں بچوں کی سبھا لگائے، پاس بیٹھو، بات کرو، جواب میں سنو تو وہی حقے کی گڑگڑاہٹ، کھانسی کی کھنکار، یا دم سنبھل گیا تو بڑوں کی باتیں۔ دوسری طرف بھابی اور اُس کی رسوئی۔ وہی چخ چخ، وہی کھنک، وہی بات بات پہ بلاوے۔ منہ کھولو تو تیل کے سانس، ناک کھولو تو چھونک، وہی دھواں وہی دھسک اور بڑی اڑچن یہ کہ میرا اپنا وقت کھلنے کا تھا۔ دھوپ ہوائیں کھوجنے کا، زندگی کو ذرا ہلا کے دیکھنے کا۔ نہ کہ پتھرائی ہوئی دیواروں کو گھورتے رہنے کا۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ گھر کے ہر لمحے میں گھٹن ہے اور بس دروازے سے نکلتے ہی زندگی کے بھرے بھرے گھونٹ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ بھابی کی پہلی آواز بھی مجھے بُری بھی نہ لگتی۔ میں بستر سے کود اٹھتا، لے کے لوٹا دوڑ لگاتا، آنکھ جھپکتے دودھ لے آتا۔ بھابی کی بندھی سبزیاں لاتا۔ بھائی صاحب کے ساتھ چائے کے گھونٹ اتارتا اور

خالی ہو کر ایک آندھی چلاتا۔ جوتے پہ پالش کو چمکاتا۔ نہاتا، کوٹ پتلون اور ٹائی کس کسا کے گھر پڑے دیور کی جگہ سنسار نواسی بابو — نام نہیں بتائینگے — سمجھو ایک نئے آدمی کو 'نئے جیون کے نوجوان کو شیشے میں ٹھیک ٹھاک کر کے گھر کے سائے سے بھاگتا بھاگتا' جا کے بس کے اڈے پر ٹھنڈی سانس لیتا۔

بھابی کے دیئے ہوئے روٹی کے ڈبے کو میں پچھلے پان والے کے پاس ہی رکھ دیتا' روٹی کا ڈبہ بھی بھلا چیز تھی ایسی کہ ساتھ لئے پھرو —؟ ساتھ لیئے پھرو اور اسے بجاؤ۔ کہ سن لو لوگو ہم یہ ہیں۔ روٹی کے ڈبے والے، کہ جوتے کی چمک اور ٹائی کی چُستی جھوٹی ہے۔ بس کے اڈے پر یہ اپنے انداز میں کھڑا ہو جاتا۔ دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر زندگی کو دل ہی دل میں بلانے لگتا۔ کہ کبھی کیو میں کھڑی لڑکیاں جانے کیا سمجھ کر اکڑتی ہوتیں' میں جھٹ سے کسی پہچان والے آدمی کو پکڑتا۔ اُس پر تیز تیز انگریزی کی بارش کرتا اور ماحول میرے ہاتھ میں آتا۔ کھلی کھلی ہوا میں ایسے دس اور موقعے ملتے اور میں موقعے کو یوں ہی جانے نہ دیتا۔ اپنا دیکھ ہی لیتا۔

دنوں میں یہ بھی ایک دن تھا۔ وہی اور دنوں جیسا' لیکن نئی بات یہ تھی کہ نہ تو کیو میں کوئی پہچان کا آدمی تھا نہ کوئی لڑکی تھی۔ لڑکی ہی ہوتی تو دیکھتے دیکھتے بالوں کی بناوٹ پر تنقید کا ایک فلسفہ جاگتا۔ اُسکے کندھوں کو دل ہی دل میں ناپتا۔ بالوں کے نئے پرانے سبھی سٹائیلوں کو یاد کرتا' کھڑے کھڑے سٹایل بدلتا جاتا۔ جب تک کہ وہ کندھے ہلنے لگتے۔ کیو چلنے لگتا اور میرے دل سے بھی وہ بال اڑ جاتے۔ لیکن آج سڑک کے پار بھی کوئی بات نہ تھی۔ ذہن کو خالی رکھنے سے ڈرتا ہی تھا سو وہی بات ہوئی۔

مرا مرا سا ماحول تو تھا ہی' آنکھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئیں جب' خیالوں' خاکوں کا ایسا منحوس سلسلہ چل پڑا کہ دل بھر آیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ بڑا بدشگون دن تھا وہ۔ ایسا لگا کہ دھوئیں کی طرف لوٹ رہا ہوں۔ گلا گھٹ رہا ہے کہ زندگی بھر بھی کھوجتا رہوں۔ دل کی کلی نہیں کھلے گی' زندگی کا گھونٹ ایک بھی نہیں ملیگا — اپنی بس آ بھی گئی' پر من کی دھارا بدلی نہیں۔ جانا تھا اس لئے بس میں گھس گیا۔

بس میں دفتر تک کھڑا کھڑا گیا' کئی اُترے کئی چڑھے' بیٹھنے کو جگہ تھی۔ لیکن اُس دن موڈ بنا

ہی نہیں۔ اُس دن دفتر میں بھی میں نے بہت کام کیا۔ جا کے اوروں سے فائیلیں چھین کر اوروں کا کام کیا، یار لوگوں کے مذاق گھٹ گئے جب میری حالت بدلی نہیں۔ جب دس کے جواب میں میں نے ایک بھی نہ کہی۔

پانچ بج گئے، چھٹی ہو گئی، چل پڑے ہم بھی، لیکن آج نہ تو کیو کا دھیان تھا نہ بس کا۔ یونہی جی چاہتا تھا کہ پیدل چلو۔ پگڈنڈی پہ ہو لیا اور اپنا الگ الگ، کنارے کنارے، اُمیدوں سے قدم بچاتا ہوا یونہی چلتا رہا۔ دنیا میں ایک غیر معمولی گہما گہمی تھی اور میں دنیا کے کنارے پر تھا۔ سائیکل والوں کی فوجیں آ رہی تھیں۔ پہیوں پر پہیئے۔ پہیوں پر پہیئے۔ جیسے انہیں بجلی چلا رہی ہو، جانے کن امیدوں کا تعاقب کر رہے تھے۔ سڑک پر بسیں فراٹے بھرتی آ رہی تھیں۔ پھٹ پھٹیاں اُدھم مچا رہی تھیں۔ ماحول میں ایسی تیزی تھی۔ جس کا احساس میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میں آپ اس آندھی کا ایک تنکا تھا۔ جو آج ایک کنارے پہ آ کر اٹک گیا تھا۔

چلتے چلتے شام بھی ہو گئی، سردیوں کی بہار تھی اور جب اندھیرا ہونے لگا، مجھے جانے یہ ڈر کیوں کھانے لگا۔ کہ میں دنیا سے کٹ کر اندھیرے میں کھو جاوں گا۔ کہ یہ زندگی کنارے پہ آ گئی تو زندگی نہ رہے گی۔ کہ زندہ رہنا ہے تو بیچ سڑک میں آنا ہو گا۔ کہ آشائیں بنائے رکھنی پڑیں گی اور موقعے ڈھونڈنے پڑیں گے۔ ایک بچے کی طرح اندھیرے سے ڈرتا ہوا میں بجلی کے کھمبوں کے نیچے نیچے چلتا ہوا رات کو دن کی طرح چمکاتے ہوئے نور محل پکچر ہاوس پہ آ کے رُک گیا۔ خیال آ گیا کہ فلم بڑی کام کی چیز ہے۔ کہ من میں چین ہو تو پکچر دیکھنے کا مزا آتا ہے۔ اگر دُکھ ہو تو پکچر دیکھنے سے دب جاتا ہے۔ سوچنے کا وقت نہ تھا۔ پکچر شروع ہو گئی تھی کہ ہونے والی تھی۔ سوا روپے کا ٹکٹ نہیں ملا۔ ڈھائی کا لے لیا اور ہال میں چلا گیا۔ ہال میں اندھیرا تھا اور سکرین پر فلم کے ابتدائی نقوش روشن ہو چکے تھے۔

ٹارچ نے میرے نمبر کی سیٹ پر ماتو انگلی رکھ دی اور میں انگریزی میں معافیاں مانگتا ہوا پیر بچاتا گھستا گیا۔ سامنے کرسیاں بہت خالی تھیں۔ لیکن میرا نمبر بھی پچھلی لائین میں تھا۔ پہلے

مجھے یہ ڈر ہونے لگا کہ میرے ڈھائی روپے اکارت گئے، فلم اچھی نہیں ہوگی۔ لیکن دیکھا کہ نچلا درجہ ٹھسا ٹھس بھرا ہے اور ساتھ یاد آگیا کہ یہ فلم دوسری بار آگئی ہے، اچھی ہے تبھی سوا روپے والے بھر گئے بیٹھتا ہوا چین کا سانس لینے ہی لگا تھا کہ دائیں طرف ساتھ کی آخری کرسی پر نظر پڑی اور دل لمحہ بھر رُک سا گیا۔ ٹارچ بجھ گیا تھا اور سکرین سے اُٹھتی ہوئی دھندلی روشنی میں مجھے ایک ساڑھی اور ایک بیگ کا اندازہ ہوا۔ "عورت ہے تو کیا بات ہے"۔ موڈ کے بھاری پن نے دل کی عادت کو سمجھایا۔ سکرین پر کہانی شروع ہوئی اور میرا دھیان اُدھر لگ گیا۔

چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کوک کے ساتھ جھومتے ہوئے ایک باغ میں ہیروین آگئی تھی اور پھولوں کو چھوتے ہوئے ایک میٹھا گیت گانے لگی تھی۔ پیڑوں کی اوٹ میں ہیرو بھی آگیا اور مجھے جانے کیوں فکر ہونے لگی کہ دیکھوں یہ پاس بیٹھی ہوئی کیسے دیکھ رہی ہے۔ کنکھیوں سے دیکھنے لگا تو بہت کچھ نہ دکھائی دیا۔ روشنی کیا روشنی کا سایہ سا تھا اور اسمیں لکیریں تو دکھائی دیں، کوئی خاکہ نہ اُبھرا۔ یہ تو خیر ظاہر ہوا کہ لکیروں میں تناؤ ہے نہ کہیں جھول ہے نہ جھکاؤ۔ عورت نہیں لڑکی ہے۔ اُدھر گیت کٹ گیا اور ہیروین ڈر گئی۔ ہیرو سامنے آگیا، مسکرایا اور کہانی شروع ہوگئی۔ کہانی میں اتنا رس تھا کہ میں بیچ بیچ میں مسکرانے بھی لگا۔ یہ بھی خیال آیا کہ گھن چکر ہوں بے بات کو اپنا دن بگاڑ دیا۔ کوئی بات بھی ہوئی ہوتی، یونہی من کو کڑوا کیا ــــ کہانی میں ہنسی تھی، لوگ ہنسے، میں بھی ہنسا۔ پر یہ لڑکی کیوں نہ ہنسی؟ خاکے کی لکیروں میں کم سے کم آواز تو پڑتی، اپنے اندازے کو پرکھنے کا کوئی ذریعہ تو ملتا۔ "چلو ہٹاؤ، ہنسے روئے مجھے کیا۔؟" اپنے آپ کو سکرین کی طرف کس کے میں کہانی میں ہی دھیان دینے لگا۔

کہانی میں کئی موڑ آگئے، کئی مشکلیں آگئیں، پتا جی غصے میں دانت پیسنے لگے اور بدخواہ ولن نے جھوٹ بولا۔ دیکھنے والے اداس ہوگئے۔ کہیں کہیں سے دبی دبی آہ بھی نکلی۔ لیکن وہ لکیریں کچھی رہیں۔ ایک بھی نہ ہلی۔ مانو پنسل سے کھینچ کے رکھدی گئی ہوں۔ پھر کہانی نے پہلو بدلا۔ نئی آشا جگ پڑی۔ اور لوگ کرسیوں پر سیدھے ہونے لگے۔ میرا اپنا پورا من کہانی میں لگا ہوا تھا۔ اچانک لکیریں ہلنے

لگیں، ٹیڑھی ہونے لگیں۔ دوہری ہونے لگیں اور پھر سب کی سب کرسی میں ڈوب سی گئیں۔ پیچھے کو لٹکیں اور رونے کی گھٹتی ہوئی دو چھوٹی چھوٹی آوازیں نکلیں ــــ اوہو، پتھر سے دل پھوٹ نکلا ہے۔"

میں نے اپنے آپ سے کہا پر اب تو کہانی بدلنے لگی تھی، یہ درد جواب اٹھا کہاں رینگ رہا تھا! لیکن عورتوں کے دل کا میں نے بھی پورا مطالعہ کیا تھا۔ کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ عورتوں کے تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اور اکٹھا ہوتا ہوتا جب ایک بار فوارا چھوٹتا ہے۔ تب ہی مرد کو پتہ لگتا ہے۔ کہانی آگے چلتی گئی اور پھر ایک بار نئی مشکلیں ہیرو ہیروین کا راستہ روکنے لگیں۔ ایکبار پھر لڑکی ہلنے لگی اور اس کی ساڑی کا پلہ میرے دائیں ہاتھ پر آگرا۔ فلم دیکھتے دیکھتے میں اپنی توجہ میں کسی چیز کا دخل پسند نہیں کرتا اور اب میں کسی کے بکھرے ہوئے پلے سمیٹتا چلوں۔ میرے پاس اس کے لئے وقت نہیں تھا۔ "اپنے آپ کھینچ لے گی۔" میں نے سوچا۔ "ایسی بھی کیا بے ہوشی ہے جو پلے کا دھیان بھی نہیں؟"

میں نے اپنا ہاتھ وہیں رہنے دیا اور حیرت یہ کہ پلّہ وہیں پڑا رہا ــــ اب یہ پلّہ میری جان کی آفت ہو گیا۔ دل یہ بھی چاہتا تھا کہ پڑا رہے۔ اُٹھ اٹھ کے یہ سوال بھی میرے فلم کے مزے کو بگاڑ رہا تھا۔ کہ یہ اٹھاتی کیوں نہیں۔ یوں تو مجھے اس سے کچھ تکلیف نہ تھی، ریشم کا یہ ٹکڑا بڑا نرم تھا۔ کم بخت سینما کی ہوائیں ریشم سے بھی نرم ہو گیا تھا۔ بات ساری یہ تھی کہ یہ اپنے پلے کو کیوں نہیں اٹھاتی۔ ادھر فلم میں گھوڑے دوڑنے لگے، تلواریں چلنے لگیں، غُل مچ گیا اور مجھے یہ ذرا بھی پرواہ نہ رہی کہ اس لڑکی کا کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ مجھے بھی اُس وقت کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا۔ میرا اپنا دل گھوڑوں کی ٹاپ ٹاپ سے آگے جا رہا تھا۔ اتنے میں وِلن نے ہیرو پر تلوار کا ہاتھ اٹھایا اور جیسے میرے دل پر گرا یا۔ میں اچھل سا پڑا۔ کیونکہ پلّے کے ساتھ اب لڑکی کا ہاتھ بھی میرے اپنے ہاتھ پر گر سا گیا تھا۔ فلم کے گھوڑے، غل، غبارہ، تلواریں، کہانی کے کردار، خود کہانی، نہیں وہ سکرین وہ ہال بھی ایک دھوئیں میں کھو گئے اور دھوئیں میں سے وہی مدھم لکیریں پھوٹنے لگیں اور لکیروں کے بیچ رنگ بھر گئے گولائیاں آگئیں، وہی رنگ، وہی گولائیاں جنہیں میں ڈھونڈ رہا تھا اور میں آنکھیں پھاڑتا ہوا دائیں طرف دیکھنے لگا۔ ہاتھ وہیں پڑا رہا اور میں اپنے دل کو تھامنے لگا۔ مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر اپنے جسم کا سارا بوجھ ڈالنا پڑا۔

کر وہیں پڑا رہے۔ اچھوں کی طرح ہلے نہیں۔ بوٹیاں اندر اندر تو پھڑپھڑانے لگیں۔ لیکن روشنی کی کمی کام آ گئی۔ "ہو سکتا ہے کہ کوئی اور بات ہو۔" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اس خیال کے آتے ہی دھواں چھٹ سا گیا اور پھر سے میں انہی لکیروں کو گھورنے لگا۔ روشنی اتنی ہی تھی جتنی پہلے۔ لکیریں ویسی تھیں جیسے پہلے۔ تصور میں جو رنگ تھا اور گولائیاں بھر آئی تھیں۔ وہ بھی اب مٹ گئیں۔ بات نئی یہ تھی کہ لڑکی اب سیدھی نہیں بیٹھی تھی۔ کرسی پہ ایسی تھی جیسے ٹانگوں سے پکڑ کر کسی نے نیچے کھینچ دیا ہو۔ اب جو میں سیدھا اسی کے چہرے کو بدتمیزی سے دیکھنے لگا۔ معلوم ہوا کہ لڑکی اچھی خاصی ہے، چہرے پر جذبات کی اتنی چھاپ آ گئی ہے کہ روتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے اور اسکی آنکھیں بند ہیں۔

"باپ رے یہ معاملہ کیا ہے"۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ "معاملہ کیا ہے؛ وہی موقع ہے، وہی رحمت ہے جسکی تجھے تلاش تھی۔" میرا دل اچھل کر میرے ہاتھ میں آ گیا جو اس نرم ہاتھ کے نیچے پھڑپھڑانے لگا۔ ہاتھ نیچے سے اوپر آنا چاہتا تھا اور میدان مارنا چاہتا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ لڑکی موڈ میں آئی ہے۔ اسے سہارا دو۔ ایسا موقعہ زندگی بھر نہ ملے گا۔

لیکن نہ جانے دل سے دور کونسی کوٹھڑی نے ایک ٹھنڈا بوجھ اچھال دیا۔ جو سیدھا اپنی دھڑکن پہ آ جما۔ خیال منحوس تھا کہ یہ عورت بازاری ہوگی۔ یونہی ڈرامہ کر رہی ہے اور نابالغ سمجھ کر پھانس رہی ہے۔ جسم بھر اس فیصلے میں تن گیا کہ اس ایسی ویسی سے بچو۔ لیکن بچارا ہاتھ اندر پھڑپھڑا تا رہا۔ باقی جسم نے تن کر بھی ہاتھ کو اجازت نہ دی کہ وہ بھی اپنا آزاد ہو کر ساڑھی کے پلّے کو ادھر پھینک دے۔

اتنے میں یاد آیا کہ اپنے شہروں میں ایسے ویسے بازار اب کہاں۔ اب تو اپنے سماج میں ...... لیکن خیال پورا ہونے سے پہلے ہی لڑکی کا سر میرے کندھے کے ساتھ لگ گیا اور اس کے ادھ کٹے بال میری گال کے ساتھ لگ کر سرگوشی میں جیسے کہنے لگے۔ "اچھا جی۔ تم نے ہم کو ایسا کہا ـــــ"

گال کے ساتھ بال ایسے لگے رہے جیسے ان کی جانی پہچانی منزل تھی ـــــ ایسی ویسی

لڑکی ہوتی نہ انگریزی بال ہوتے نہ ان میں فرانسیسی خوشبو ہوتی۔

میں نے اپنا ہاتھ نکال ہی لیا اور اسکے ہاتھ پر رکھ دیا ــــــ رکھ دیا ــــــ کچھ نہ ہوا۔ سہم سہم کے انگلیاں ہلیں۔ کچھ نہ ہوا۔ پھر اُٹھ کے میرے ہاتھ نے ہاتھ کو مَلا، کچھ نہ ہوا۔ اوپر بازو کی گولائی پر آیا۔ دبایا۔ کچھ نہ ہوا اور ہاتھ پر شکریہ کی تھپکی دیتے ہوئے دائیں طرف اتنا جھکایا کہ بائیں طرف دو خالی کرسیوں کے بعد تیسری پر بیٹھا ہوا آدمی بھی بیچ بیچ میں ادھر کی طرف دیکھنے لگا۔ میں بھی ڈر کے مارے بیچ میں سکرین کی طرف آنکھیں لگا کر دیکھنے لگا۔ کہ اُسے سمجھا دوں کہ بھائی ادھر کچھ نہیں ہو رہا۔ کوئی خاص بات نہیں اور جب اس کو یقین نہ ہوا اور ساتھ بیٹھے آدمی کے ساتھ پھُس پھُس بھی کرنے لگا۔ میں نے اسکی پرواہ کرنی چھوڑ دی ــــــ "کیا کرے گا سالا۔ جلتا ہے"۔ میں نے سوچا اور یونہی اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کندھے اور ہاتھ میں اپنا سارا احساس ڈال کر نئے امکانات کو دیکھتا رہا اور اب سکرین پر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں ایک بات بھی نہیں آرہی تھی ــــــ!

سر کا دباؤ میرے کندھے پر بڑھتا گیا اور مجھے فکر ہونے لگی کہ یہ لڑکی بالکل لٹکنے لگی ہے۔ اور اُدھر وہ لوگ دیکھ رہے تھے۔ میں اپنے دائیں ہاتھ اور کندھے سے کتنی بھی اوٹ کرتا تب بھی یہ بات ایسی تھی کہ تھوڑا سا دیکھ کر بھی لوگ بہت کچھ سمجھ جاتے۔ پکڑ اور دباؤ کی خاموش بولی میں جو کچھ کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔ لیکن اس کا بوجھ میرے کندھے پر بڑھتا ہی گیا اور مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے دھیرے سے اُسے کہا، پھر کہا، سر سہلا کے کہا۔ لیکن اس کے ہاتھ پیر بھاری ہو گئے اور ایسا لگا کہ سارا جسم مجھ پر ڈالنا چاہتی ہے۔ اس پر میرا جی گھبراتا، کہتا کہ پھنس گیا ہوں، جانے کون ہے یہ، جانے کیوں کلنک لگائے گی، اور شاید میں اُسے ایک طرف دھکیل کر تیسری کرسی پر چلا جاتا۔ لیکن لڑکی بے ہوش سی پڑی تھی۔ آنسوؤں کی دو لکیریں دو گالوں پہ چمک رہی تھیں۔ ہاتھ پسینے میں ڈوب رہا تھا اور وقت تھا کہ سہارا دوں اُسے، پچکاروں، حوصلہ بڑھاؤں اور سمجھاؤں کہ آخر میں بھی تو انسان ہوں۔ میرا بھی تو دل ہے اور

جذبات میں ڈوب جانے کی کیا ہی ایک جگہ ہے؛ کیا ہوا جو ہماری یہ پہلی ملاقات ہے۔ کیا ہوا جو ماحول اتنا دلچسپ ہے۔

لیکن اسی وقت بجلی ٹوٹ گری۔ انٹرول کی روشنی میں بھی لڑکی ہلی نہیں۔ میری چھاتی اور کندھے پر پڑی رہی۔

پاس کے آدمی کھڑے ہو گئے۔ گھبراہٹ میں میں آپ گرنے لگا تھا۔ میں نے اُسے دھکا دیا۔ دھکا کھا کے بھی وہ مجھ ہی پہ گرنے لگی تھی، میں ہٹا اور وہ منہ کے بل دو کرسیوں پہ گر گئی ـــ ہال میں شور پڑا۔ چاروں طرف سے لوگ آ گئے، اور لڑکی کو سیدھا لٹایا گیا۔

پھر مجھے ایسا لگا کہ ہال بھر کی روشنی اسی پر مرکوز ہو گئی ہے اور بھیڑ میں اسے کوئی چھونا نہیں چاہتا۔ گری ہوئی لڑکی کو سیدھا لٹانے والے تو بہت آ گئے تھے۔ لیکن اب سیدھی پڑی لڑکی کے مُنہ پر جھاگ تھی اور جسم پر مرگی کا دَورہ واضح ہو چکا تھا ـــ!

ہال بھر کی وہ روشنی پھر جیسے اسی جھاگ پر اکھٹی ہو گئی اور ایک شُعلہ میں لپک اٹھی۔ وہیں دیکھتے دیکھتے، کھڑے کھڑے مجھے ایک نیا گھونٹ پینا پڑا :

⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂⁂

نیلی بوتل

دھنی رام کے دواخانے میں مریض آتے تو تھے۔ لیکن ایک کے چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے تک ایک لمبا اور خاموش وقفہ چھایا رہتا۔ بوتلوں کے پانی میں دوائیوں کے ذرّے ڈوبتے ڈوبتے تہ پر آ بیٹھتے اور وہ خود بھی دھیرے دھیرے اندر اندر بیٹھ سا جاتا۔ سُن سا پڑ جاتا۔ اسکے سر میں ایک بے رنگ سفید پٹی سی کھل جاتی اور پھیلتی جاتی۔ اس کے ہاتھ پیر بھی اس کی لمبائی کے ساتھ ساتھ پھیلنے لگتے اور وہ اسٹول پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتا۔ عادت کی بات تھی کہ باہر شور بھی مچتا۔ دھنی رام کی آنکھ نہ کھلتی۔ لیکن جب ایک دبی دبی "ہائی ووئی" کے ساتھ ساتھ بھاری بھاری تندرست آوازیں آنے لگتیں۔ رُکتے اور گرتے ہوئے قدموں کے ساتھ ساتھ باقاعدہ لیکن ہمدردی میں رُکتے ہوئے دوسرے پیر فرش پر چلنے لگتے۔ کرسیاں ہلنے لگتیں۔ کسی کو بٹھایا جاتا اور ایک اچھی بھلی متفکر آواز ڈاکٹر کو نمستے کرتی۔ وہ چونک پڑتا اور آنکھیں ملتے ہوئے وقت کا اندازہ لگانے لگتا اور اس وقفے کی لمبائی کا جو سپنوں میں کٹ

گیا تھا۔

لیکن جب وہ پورا جاگتا اُسے یہ افسوس ہونے لگتا کہ وہ کچھ دیر اور کیوں نہ سویا۔ کیونکہ مریض کے آنے پر بھی اُسے بہت دیر انتظار کرنا پڑتا۔ جب تک کہ ڈاکٹر نسخہ نہ لکھتا۔ ڈاکٹر اپنی میز کے سامنے ہی مریض کو اٹکائے رکھتا اور دھنی رام کھڑکی کے پیچھے، بیٹھے بیٹھے بیمار کی شکائیتوں کو سن کر نسخے کا اندازہ لگانے لگتا۔ دوائیوں کو گن لیتا۔ گن بھی چکتا۔ ڈاکٹر کا معائینہ تب بھی ختم نہ ہوا ہوتا۔

ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ ــــ چھ۔ پانچ۔ چار۔ تین۔ دو ــــ

وہ اپنی بوتلوں کو کئی ترتیبوں میں گننے لگتا۔ اُس کی نظریں گھوم پھر کر اُس سفید بوتل پر رکتیں جس میں ٹھنڈے اور شفاف پانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ جس کو دیکھ کر اُسے ایک ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ اس کی گنتی کچھ دیر وہیں رکتی اور وہاں سے ہٹ کر اس کی نظر اس ایک الماری میں دائیں بائیں دوڑنے لگتیں۔ جس میں چھوٹی بڑی شیشیاں رنگ رنگ کے فیتوں میں ملبوس سج دھج کر، بن ٹھن کر اس قرینے سے کھڑی تھیں۔ جیسے ان دوشیزاؤں کی قطاریں ہوں۔ جنہیں دھنی رام نے ایک ولائیتی فلم میں دیکھا تھا۔ اس الماری میں دوڑتی ہوئی یہ قطاریں پھر جیسے ٹھوکر کھا کر اس بڑی سی پرانی میلی نیلی بوتل پر آپڑتیں۔ جو پاس کے کونے میں گرد سے اَٹی ہوئی تھی۔ اس میں زہریلا لوشن تھا کہ خود زہر تھا۔ وہ اُسی کو گھورنے لگتا۔ اس کی نظریں گرفتار ہو جاتیں اور اس کا منہ کڑوا ہونے لگتا۔ پھر وہ اپنی نظریں واپس چھین سی لیتا اور بن بُلائے ڈاکٹر کی میز تک چلا جاتا۔

آج ڈاکٹر کے سامنے ایک مریضہ تھی۔ مریضہ کے ساتھ اسکے دو آدمی تھے اور دھنی رام اس لئے زیادہ بے چین تھا کہ ڈاکٹر مریضہ کی جسمانی شکائیتوں کے بعد زندگی کی اور باتوں کے متعلق پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ وہ تین بار ڈاکٹر کی میز تک ہو آیا۔ جیسے اسے یاد دلا رہا ہو کہ دھنی رام بھی اس دواخانے میں موجود ہے۔ اور کچھ کام کرنا چاہتا ہے پھر ڈاکٹر جیسے سمجھ گیا۔ اس نے خدا خدا کر کے آواز دے ہی دی۔ اور دھنی رام جو اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا آہستہ سے "جی" کہہ کر اپنی مونچھوں کو انگوٹھے اور انگلی سے دبانے لگا۔ پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں گالوں کو مل کر ایسے اٹھا۔ جیسے اُسے یہ بے چینی

کب تھی کہ اُسے نسخہ بنانے کو دیا جائے۔ آ کے اُس نے نسخہ اٹھایا۔ مریض کی طرف ایک بار دیکھ کر اُسے پڑھنے لگا۔ ایک بار پھر آنکھیں اٹھائیں۔ اب کے ایسے، جیسے پوچھ رہا ہو۔ "ہوں! یہ مرض آپ کو ہے؟ ایک بار پھر۔" ہوں! یہ مرض آپ کو ہے"؟ آخر وہ بھی تو دواخانے کا ایک رکن تھا۔ پھر اس نے آخری بار نسخے پر آنکھیں جھکالیں اور اپنی کھڑکی کے پیچھے آکھڑا ہوا۔

نسخے کی کرامت تھی کہ دواخانہ جی پڑا۔ دھنی رام کے دانت ایک ٹھہری ہوئی مسکراہٹ کے پیچھے دکھائی دینے لگے۔ ایسے کہ جیسے باہر آنا چاہتے ہوں۔ اس کی پگڑی کا طرہ بل کھاکے آگے لٹکنے لگا۔ اُس کے لمبے ہاتھوں کی انگلیاں بوتلوں پر رینگنے لگیں۔ اُس نے ان بوتلوں کو بھی اٹھایا جنہیں نہیں اٹھنا تھا۔ ٹن ٹھن۔ بوتلیں اُٹھتی گئیں اور بیٹھتی گئیں۔ ٹھن ٹن ...... بوتل اور گلاس ٹکرانے لگے۔ پھر ہاون دستے میں گولیاں آگئیں اور دھنی رام نے ان پر تمام ہڈیوں کا بوجھ ڈال دیا۔ بوجھ میں وہ تمام جان ملادی جو مغربی پنجاب سے آکر نکلتے نکلتے ابھی بہت تھی۔ گھی گیہوں کے کھنڈر گولیوں کو پیسنے لگے۔ اور دھنی رام نے نہ صرف گئی ہوئی خاموشیوں کا بدلہ لیا۔ بلکہ آنے والے جمود کا بھی۔ لیکن اس کے باوجود کہ اس نے لیبل بنانے، لگانے اور پڑیاں بانٹنے باندھنے میں بہت وقت لگایا۔ یہ جاندار لمحہ حسبِ معمول فوراً ہی ختم ہوگیا۔

عام طور پر دھنی رام دوائی دے کر مریض کے ساتھ باہر تک جاتا۔ دوائی کے متعلق سب کچھ بتا کر ہاتھ جھاڑتا ہوا واپس چلا آتا۔ اور اسٹول پر بیٹھتے ہی مریض مرض اور دوائی کو بھول جاتا۔ اسکی پگڑی کا طرہ پیچھے چلا جاتا۔ دانت اندر چلے جاتے۔ اسکی کہنی کھڑکی پر آتی۔ بند مٹھی سے ایک انگلی نکلتی۔ اسکے سر کو سہارا دیتی اور وہ کھو جاتا۔ جیسے اسٹول پر وہ خاموشی کا ٹھوس وقفہ اسی کے لئے انتظار کر رہا تھا اور اُسے آتے ہی ڈھانپ لیتا۔

لیکن آج وہ واپس آگیا۔ اسٹول پر بیٹھا بھی۔ اس کے دانت بھی اندر چلے گئے۔ اسکی کہنی کھڑکی پر آگئی اور اسکی انگلی بھی نکل آئی۔ اس کا سر سہارے کے لئے جھکا نہیں۔ اُسے پگڑی کے طرّے کو پیچھے کی طرف پھینکنا یاد نہ رہا۔ کیونکہ دواخانے میں آج ایک نئی بات

ہوئی تھی۔

یوں تو بات معمولی تھی۔ لیکن تھی نئی۔ دھنی رام کے ڈاکٹر نے بل میں سے آٹھ آنے کم کر دیئے تھے۔ مریضہ نے دردِ سر کی شکایت کی تھی۔ جوڑوں کے دُکھنے کی۔ قے آنے کی۔ دستوں کی، بخار کی اور اس بات کی کہ وہ "رپھوجن" ہے اور ڈاکٹر خود ایک پکا رفیوجی ہوتے ہوئے بھی ایک آن میں موم ہو گیا تھا اور وہ یہ دیکھ بے چین ہوا جا رہا تھا کہ لفظ "رفیوجی" یا "رپھوجن" میں کوئی جادو ضرور ہے۔ جو اسکے ڈاکٹر پر بھی کارگر ہو گیا۔

"رپھوجن ــــ؟" ذرا دیکھو تو سہی وہ ان بوتلوں سے ہی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پوچھنے لگا۔ نک لیس، کڑے، ٹاپس، سونے کی چوڑیاں ــــ "رپھوجن" ــــ اور آٹھ آنے ــــ لیکن بوتلیں جیسے بولنے لگیں ــــ کیا ہے یہ تھوڑا سا سونا؟ لے کے کب تک اسے چاٹیں گے اور پھر عورت ــــ یہ چیزیں اُسے جان سے بھی پیاری ہوتی ہیں۔ کھانے کو ملے نہ ملے۔ یہ تو سہاگ ہوا سہاگ........ سہاگ ایک بوتل میں سے جیسے تیزاب اُچھلا اور دھنی رام کے اندر اترنے لگا۔ اترتا گیا اور کھودتا گیا۔ وہ بھی! خود وہ بھی تو کسی کا سہاگ تھا۔!!

دھنی رام کے دانت پھر باہر جھانکنے لگے۔ لیکن ان کے گرد اُس کے ہونٹوں نے ایک ڈراؤنا سا گھیرا ڈال دیا۔ جیسے اسکی مُسکراہٹ پر بیڑی لگانا چاہتے ہوں۔ اور اس کے چہرے پر بھی نیلی پیلی بوتلوں کے سائے پڑتے گئے۔ رنگ آتے گئے اور جاتے گئے اور دھیرے دھیرے بوتلیں تحلیل ہوتی گئیں۔ دیواریں ٹوٹتی گئیں۔ اور دواخانہ وسیع ہوتا گیا۔ کھلتا گیا۔ جب تک کہ اندر اندر کھلیان کھلتے گئے۔ کھیت لہلہانے لگے۔ الغوزہ بجنے لگا۔ اور اسکے روتے ہوئے دل کو اس کی بیوی سیتا کہیں سے بلانے لگی۔

اُسے یقین تھا کہ اگر سیتا اس کے ساتھ آئی ہوتی تو وہ اسی دواخانے میں ہی اپنے گاؤں کی سب باتیں پاتا۔ اس کے کھیت وہیں لہلہاتے، الغوزے وہیں بجتے۔ واقعی بجتے اور سیتا گر بناسپتی کو بھی چھُوتی اسمیں گھی کی تاثیر ہو جاتی۔ سرسوں کا ساگ، بیسن کی روٹیاں پھُولے

ہوئے پھلکے، ہینگ کا تڑکا۔ پھلبڑیاں، اچار........ اور........ اور سہاگ

سیتا کے پاس زیور نہیں تھے کیا؟ شادی کا جوڑا تک رکھا ہوا تھا۔ لیکن سیتا آٹھ آنے کم کیوں کراتی؟ سیتا بیمار ہی کب ہوتی تھی اور وہ بیماری ہی کیا تھی۔ جب اُسے سر میں کبھی درد ہوتا تھا یا کمر میں۔ دھنی رام کو تیل ہی ملنا پڑتا تھا۔ دوائی تو نہیں دینی پڑتی تھی۔ پجاری کو اتنا کام کرنا پڑتا تھا۔ اتنا کام یہ کہو کہ اسے بال بچہ نہیں ہوا تھا۔ تھک تھکا کے بڑھیا نہ ہو جاتی؟ سیتا دھنی رام کی دوسری بیوی تھی۔ لیکن وہ کئی سال ساتھ رہے تھے۔ وہ تب بھی تھی۔ جب وہ ڈسپنسری میں لمبے لمبے ہاتھ چلاتا تھا اور بڑی بڑی بھینسوں کو سوئیاں لگاتا تھا۔ تب بھی جب بیکاری میں کپاس چننے کی مزدوری دونوں نے کی تھی۔ جب وہ بڑے ہسپتال میں آیا تھا کہ عارضی نوکری چھوٹ گئی تھی!

اور اب سیتا ہوتی تو اس کی یہ حالت ہوتی ہی کیوں۔؟ وہ شہر کے اس کونے پر ایک رفیوجی ڈاکٹر کا ملازم ہی کیوں ہوتا۔؟ اس نے پگڑی کو رنگوانا تک کیوں چھوڑ دیا ہوتا۔؟ اس کا طرّہ آج مرا مرا کیوں ہوتا؟ اس کا اب گھر تھا نہ گھاٹ۔ نہ دھوبی تھا نہ نائی۔ وہ یونہی مسکراتا تھا اور نہ جانے وہ یہ کام بھی کیوں کرتا تھا؟ اُسے رفیوجی کیمپ میں کھانا مل سکتا تھا۔ اسٹول پر کیوں؟ ایک کھٹولے پر لیٹا ہی رہتا۔ لیٹے لیٹے الوٹ سپنے دیکھ سکتا تھا اور سرکاری کھانے...... آہ اس کا چین چھن گیا، اس کی ناک کٹ چکی تھی۔ ہاں ناک بھی کٹ گئی تھی۔

کاش انہوں نے اُسے بھی مار دیا ہوتا۔ جب وہ سیتا کو لے گئے تھے۔ کیوں نہیں مار دیا تھا انہوں نے اسے بھی؟ انہیں شرم بھی نہ آئی تھی۔ حیوانوں کو، درندوں کو، لے گئے اُسے۔ رحم بھی نہ آیا۔ وہ چیختی گئی تھی۔ لیکن دھنی رام نے اُس وقت چاہا تھا کہ چیخنے کی جگہ وہ انہیں کاٹ کھائے۔ ان پر ٹوٹ پڑے۔ خود وہ بھی پھر وحشی ہو جاتا۔ کاٹتے مارتے دونوں اپنی عزت۔ بچاتے چاہے جان ہی چلی جاتی۔ لیکن سیتا نے پہل نہیں کی تھی۔ وہ تو بس اسی کے ساتھ لڑنا جانتی تھی اور بات ٹھیک بھی تھی۔ اپنوں ہی کے ساتھ لڑا کرتے ہیں۔ وہ ان درندوں کے ساتھ کیا لڑتی۔ لیکن پھر بھی، پھر بھی وہ یہ چاہتا تھا کہ سیتا جہاں بھی ہو درندہ بن گئی ہو، انسانوں کو کھا جاتی ہو۔ لیکن وہ واپس ہی کیوں نہ آ جائے۔

اسکو وہاں چھوڑا ہی کیوں گیا تھا؟ لو یہ گورنمنٹ کیا ہوئی۔ جو اپنی عورتوں کو وہیں چھوڑ دے۔ لیکن لاتو رہے تھے نکال نکال کے۔ لیکن نکال کر انہیں رکھتے کہاں تھے؟ اُس نے تو ایک بھی نہ دیکھی تھی نکالی ہوئی۔ خیر اُسے یہ تو معلوم تھا کہ واپس آنے والوں کو بہت کم گھر والے گھر میں آنے دیتے ہیں۔ پہچانتے تک نہیں انہیں۔ بھلا کیوں؟ دھنی رام کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی تھی ــــ لوگ بڑے عجیب تھے۔ یہ رفیوجی بھی ــــ رفیوجی ہی کیا ہوئے جو اپنی بیویوں، بہنوں کو دوش دیں۔ اور اپنے گھر میں نہ آنے دیں اور کہیں کہ بھگوان کے لئے کہیں دُور چلی جا۔ ہم برادری میں کیسے جیئں گے ــــ "ہونہہ ــــ برادری ــــ" لیکن اپنوں کو ایسا کون کہے گا۔؟ آدمی ایسا کر سکتے ہیں بھلا۔ ہوں گے تھوڑے سے سرپھرے ایسے بھی۔ اور بات دراصل یہ تھی۔ دھنی رام سمجھنے لگا کہ میاں بیوی کہیں ایک دوسرے سے تنگ تھے بھونچال آگیا۔ وہ الگ الگ گرے، وہ الگ الگ اٹھے۔ پھر اپنی اپنی دنیا، نئی دنیا، ہاں ہاں، اُسے یقین تھا کہ خود عورتیں بھی واپس آکر اپنوں کے پاس نہیں آنا چاہیں گی۔ کیوں آتیں۔؟ گھر میں آجاتیں تو سر پیٹا۔ دوش ــــ بھاری دوش ــــ اور گھر سے دور کہاں دوش اور کیا دوش...... ہیں؟ ...... اور خود دھنی رام کتنا اچھا تھا۔ تنگدل نہ تھا۔ نرم دل تھا۔ وہ سیتا سے کب تنگ تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ پھر ہلایا۔ وہ اس سے کب تنگ تھا؟ کاش سیتا کو کوئی وہاں سے لے آتا۔! اس کے ٹھاٹھ تھے پھر۔ پھر وہ آدمی بنتا اور...... اور آج وہ یہاں ہوتی ــــ "رگھوجن" ڈاکٹر اس کے بھی پیسے کم کرتا۔ نہیں۔ بس اور باتیں تھیں۔ وہ ساڑی پہننے لگتی۔ الٹی مانگ نکالتی۔ بنگالیوں کی طرح مانگ میں سیندور بھرتی۔ گاؤں کی کئی عورتوں کو دلی میں پہچان بھی نہ سکا تھا وہ ــــ وہ ہوتی تو کیا دھنی رام نے چھ چھ رضائیاں نہ جمع کی ہوتیں۔؟ دو دو مکان نہ الاٹ کروائے ہوتے؟ یہ جو سرکار رفیوجیوں میں بانٹ رہی تھی۔ ایک ایک آدمی کئی کئی نام لکھواتا تھا۔ وہ بھی کیوں نہ لکھواتا؟ وہ آگے بڑھتا، دھکے دیتا۔ لے کے رضائیاں ان کو بیچتا۔ جو پیچھے رہ گئے ہوں۔ جو دھکے نہ دے سکے ہوں۔ پیسے بناتا۔ سب بناتے تھے۔ آخر وہ بھی تو اجڑ کے آیا تھا۔ اب وہ مکانوں پر قبضہ کیوں کرتا۔ وہ رضائیاں کس لئے جمع کرتا۔؟ کس لئے؟

رفیوجی کا ـــــ! دھنی رام کی نظریں سفید بوتل پر تھیں۔ رفیوجی! اس نام میں نہ جانے کیوں ایک ٹھنڈک تھی ـــــ ایک سہارا تھا۔ ایک نئی جان۔ "رفیوجی" دھنی رام کا ڈاکٹر اپنے کمرے میں گنگنانے لگا اور اس کا اپنا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت ـــــ دھنی رام کے دانتوں کے گرد وہ حلقہ بھی ٹوٹ گیا اور اب ایک آزاد مسکراہٹ میں اسکے دانت باہر نکل آئے۔ ہاں جی، یہ ڈاکٹر بھی تو رفیوجی تھا کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ رفیوجی سب کچھ کر سکتا ہے، سب کچھ ـــــ دھنی رام کے سامنے یک بیک رفیوجی آنے لگے۔ کئی جو قرضہ چکانے سے بچ گئے تھے ـــــ کئی جنہوں نے امانتیں ہضم کر لی تھیں۔ ایک نئی دنیا تھی اب تو ایک نئی زندگی ـــــ خود اس کا ڈاکٹر جو عمر میں کہیں اس سے بڑا تھا۔ جوان ہوا جا رہا تھا۔ واقعی، واقعی دنیا بدل گئی تھی۔ تیجو کو دیکھا؟ دھنی رام اپنی آنکھوں سے پوچھنے لگا۔ کیا کپڑے پہننے لگی تھی رساٹن ہی ساٹن ـــــ اونچی اونچی قمیض، جالی کا دوپٹہ، ننگا سر اور بالوں میں پن۔ بوڑھا منالو ہوتا تو کھال نہ اس کی ادھیڑ دیتا؛ بھونچال تھا۔ بھونچال تیجو اکڑا کڑ کے چل رہی تھی۔ بیاہ بھی ہوگا کسی جوان کے ساتھ اور بیاہ کی ضرورت ہی کیا تھی؛ ہوگا ایسا ہی جو آٹو بیچ بیچ کر ساٹن بھیجنے لگا ہو۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔"

ڈاکٹر کا گیت اب دواخانے میں پھیل گیا تھا۔ دوائیوں کی بو تک بدل گئی تھی اور دھنی رام ایک بار کھڑا ہو کے پھر بیٹھ گیا۔ مڑے کو پیچھے پھینک دیوار کے ساتھ کمر کو ٹکا کر وہ اب اطمینان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کا دایاں پیر ڈاکٹر کی آواز کے ساتھ تال میں ہلنے لگا اور وہ گانا اس کے اندر ہی اندر اٹھ اٹھ کے پھیلنے لگا۔ اسے آتی ہوئی ایک نئی جان کی سرسراہٹ محسوس ہونے لگی۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ وہ بھی تو ایک رفیوجی تھا۔ وہ بھی تو ایک نئی دنیا میں تھا۔ گذری ہوئی زندگی۔ ہاں گذری ہوئی زندگی تو گذر چکی تھی۔ اور تھی ہی کون سی اچھی جو اس کے فراق میں گھلتا رہتا۔ ارے وہ کھیت دیت تو دیہاتی چیزیں تھیں۔ اب شہر تھا اور وہ بھی سب سے بڑا۔ دلی دیکھنے کو بھی نہ ملتی۔ اب جو رہ رہے تھے یہیں اور دھنی رام وہیں کا دہیں رہے یہ کیسے

ہو سکتا تھا۔

ڈاکٹر اب کھڑا ہو کے گانے لگا تھا۔ جیسے اُسے یقین تھا کہ اب کوئی مریض نہیں آئے گا اور دھنی رام کو اب یہ غصہ آنے لگا کہ اس نے سُستی میں وقت ضایع کیا تھا۔ یہ تیجو ہی نہ اسکی ہو جاتی۔ ساٹن واٹن کی بات ہی کیا ہے۔ وہ بھی تو کچھ کام کر لیتا پھر۔ دُور جانے کی ضرورت کیا۔ وہ خود ڈاکٹر بن سکتا تھا۔ ڈاکٹر دھنی رام، فزیشن اینڈ سرجن۔ ہاں ہاں سرجن بھی، چھوٹے چھوٹے دواخانوں پر کون سے آپریشن کروانے آتے ہیں لوگ ؟! اور یہ ٹنکچر و نکچر سرپ ورپ کی ڈاکٹری ختم ہو گئی ہے۔ اب تو نون نمک والی بات ہے۔ گولی نمبر یہ اور گولی نمبر وہ۔ خود ڈاکٹر بھی تو انہیں کو کبھی پسوا کر، کبھی پانی میں ملا کر اور کبھی ویسی کی ویسی ادیتا تھا۔ کوئی بیماری نہ تھی۔ جس کا ان گولیوں سے علاج نہ ہوا ہو۔ آخر یہ ڈاکٹر ہی کیا ڈاکٹری کرتا تھا۔

ایک آن میں دھنی رام کے سامنے کپڑوں کی نئی ترتیب آگئی۔ اُس نے پگڑی اٹھا کے ایک طرف رکھ دی اور ننگے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ڈاکٹر بننا کتنا آسان تھا۔! اُس نے واقعی وقت ضایع کیا تھا۔ لیکن وقت ابھی باقی تھا۔ ایک تیجو کیا ہزاروں اور آ رہی تھیں۔ ایک سے ایک بڑھیا۔ بھرے کیمپ اور سارے شہر میں۔ اُس نے تلاش ہی کب کی تھی؟! اس نے کیا کیا تھا۔؟

اچانک وہ کھڑا ہو گیا اور اپنے میلے اور لمبے کوٹ کو دیکھ کر سہم گیا۔ اُسے گھِن آنے لگی۔ بڑی بے پروائی کی تھی اس نے ...... لیکن اب .... اسکی بھویں تن گئیں اور اس کا ایک قدم ایسے اُٹھا جیسے اسی دم کسی کیمپ کی طرف چلا جائے گا۔ لیکن اس کے سامنے وہ پرانی نیلی بوتل جیسے کھڑی ہو گئی اور اس کا راستہ روکنے لگی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس بوتل کا سارا رنگ جیسے اسی کے منہ پر آجما۔ اس کی ٹانگیں وہیں گڑ گئیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اسکی آئی ہوئی جان تیزی سے نکل رہی ہے۔ جیسے وہی نیلی بوتل اس سے پوچھ رہی ہے کہ "اگر سیتا کو پاکستان سے نکال لائے ہوں۔ تو۔ ؟"

:::::::::::::::

چڑھاوا

وہ باریک ذرّے مینھ کی بوندوں سے ذرا ہی بڑے تھے۔ برف کے عام گالوں کی طرح
زمین پر گرتے نہیں تھے، وہ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ہوا میں چکر کاٹ کر نیچے آ رہے تھے۔
مُہم کے تین فرنگیوں نے ان ذرّوں کو خوب دیکھا، اِن کی اٹکھیلیوں کو سراہا، ان کو کنواریوں سے
تشبیہ دی۔ کیونکہ ان کی حرکتوں میں کچھ ویسی ہی جھجک تھی، جیسے زمین تک کا سفر کرنے کے بعد
زمین پر بچھ جانے کی ان کی صلاح ہی نہ تھی ـــــ تینوں فرنگیوں نے قدرت کی اس نقل کو
جی بھر کے دیکھا۔ لیکن انہوں نے اپنے چھ قلیوں کے زرد چہرے نہیں دیکھے جو ایک ساتھ زرد
سے زرد تر ہوتے جا رہے تھے۔

بڑے قلی ولی جو نے فرنگیوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ وہ ان کی بولی کے
کئی لفظ جانتا تھا۔ ان لفظوں کو اُس نے طرح طرح استعمال کیا اور ان کو یہ سمجھانا چاہا کہ یہ
پہاڑ "واوہ بال[1]" موسم کا احترام نہیں کرتا تھا، اس پہاڑ کے متعلق ہولناک کہانیاں سننے

[1] آندھیوں کا پہاڑ

میں آئی تھیں۔ یہاں بیچ گرمیوں میں برف گرتے سنی تھی، پھر جب فضا میں برف کے ذرّے اس وقت موجود تھے ایک خاصی برف باری کا احتمال کیسے نہیں تھا؟ لیکن ولی جو بولتا گیا اور فرنگی اُس کے آدمیوں سے تنبو اُکھڑواتے گئے'' اور جب سامان اکٹھا ہو گیا برف جیسے ٹھنڈے اور بہرے فرنگیوں نے سامان اُٹھانے اور آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ناچار ولی جو نے اپنے آپ کو اور قلیوں کو فرنگیوں کی رسی میں جوتا اور فرنگیوں نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

فرنگی بہت دور سے اس بلندی کو سر کرتے آئے تھے۔ سائنس کی برکتوں سے پوری طرح مسلح تھے۔ تند آندھیوں سے ٹکر لینے کے کرتب وہ جانتے تھے۔ فطرت کی نبض نبض کا ان کو علم تھا۔ کتنی ہی چوٹیوں پر انہوں نے جھنڈے گاڑے تھے، کتنے برفانی دریاؤں کو عبور کیا تھا۔ برف کے یہ ناچتے ہوئے ذرّے ان کو کیا ڈراتے اس پہاڑ پر بھی نہ کئی دن سے لگاتار چڑھتے آئے تھے اور اب اس بلندی پر پہنچ گئے تھے جہاں سے آگے چڑھنا واقعی دشوار تھا۔ وہاں سے آگے کی ڈھلانوں پر جمی ہوئی برف کے تختے شیشے کی طرح چمک رہے تھے اور ان کے پیروں کو کیا اُن کے سایوں تک کو سہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن راتوں رات برف کے اُن حسین ذرّوں نے اُن کی یہ مشکل بھی حل کی تھی۔ جمی ہوئی ڈھلانوں کی خوفناک پھسلن اِنہی ذرّوں نے چپکے چپکے مار دی تھی۔ پھسلتے شیشوں پر روئی کی مانند نرم نرم اور ہلکی تہوں کا ایک غلاف سا چڑھ گیا تھا جس پر قدم دھرنا نہ صرف آسان ہو گیا تھا بلکہ دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ وہ فطرت کی اس بھول کا فائدہ کیسے نہ اُٹھاتے۔؟

لیکن وہ باریک ذرّے رفتہ رفتہ پھولتے گئے اور حقیقتاً برف کے بڑے بڑے گالے اٹکھیلیوں بغیر جیسے ایک مقصد کو لئے عموداً گرنے لگے۔ تین فرنگیوں اور چھ قلیوں کے سروں پر اور اُن کی پیٹھوں پر برف جمع ہونے لگی۔ فرنگی اُس برف کو جھاڑتے ہوئے

آگے بڑھتے گئے اور قلی گاڑی کے پہیوں کی طرح ایک سمت فرنگیوں کی پیروی کرتے گئے۔ اپنی اپنی پیٹھ پر کے بوجھ کا اور اُس پر برف کی تہوں کا جیسے ان کو احساس نہ تھا۔ جیسے یہ سر اور پیٹھیں بھی اوروں کی ہو گئی تھیں۔ لیکن فرنگی جوش میں تھے، برف کی اچھوتی سلوں میں "کرکر ــــــ کرکر" گڑھے کھودتے گئے اور قلیوں کے پیر کاٹھ کی پھڑیوں کی طرح اُٹھتے گئے اور انہی گڑھوں میں گرتے گئے، اُن کے سانسوں کی چھ پھولی پھولی ابری لکیریں بھی فرنگیوں کی تین لکیروں کے بعد ایک سیدھ میں نکلتی چلیں اور مہم برابر آگے بڑھتی گئی۔

پھر یہ ہوا بھی مدھم پڑتی گئی اور برف بلا روک ٹوک پوری شدت سے گرنے لگی آسمان سے لے کر زمین تک، فضا کے ہر ملی میٹر پر جیسے روئی کے گالے ان گنت اور الوپ دھاگوں میں پروئے گئے، ایسے سلسلے جن کے گالے گالے میں حرکت تھی۔ پُر عزم تیزی تھی۔ جیسے آسمان بھر کو نیچے کھینچ کر بچھانا تھا ــــــ پھر اتنی گہما گہمی میں سانس تک کی آواز نہ تھی۔ اور وہ حقیر سا انسانی سلسلہ جو "ہش ہش" اور "کرکر" کی آوازیں نکالتا اس عالم گیر ہم آہنگی کے خلاف کش مکش میں مبتلا تھا کتنا سست اور بھدّا تھا! پھر یہ انسان جو بہ ظاہر ایک رسی میں بندھے ہوئے تھے، بہ ظاہر ایک سمت کو جا رہے تھے ان کے نو دلوں میں نو کیفیتیں تھیں ــــــ

ولی جو کڑھ رہا تھا کہ ان فرنگیوں نے اس کے تجربے اور دور اندیشی کو ٹھکرایا ہے ــــــ پھر اُس پہاڑ "واوہ بال" کی ہولناک کہانیاں برفانی آندھیوں کی طرح اُس کے ذہن پر چھا رہی تھیں۔ واوہ بال کا مالک انہی برفوں میں رہتا تھا، یہی برفیں گراتا تھا اور اپنی سلطنت میں ناپاک انسان کے دخل کا یہی بدلہ لیتا تھا، یہی غضب ڈھاتا تھا ــــــ کاش وہ ان فرنگیوں کے ساتھ آیا ہی نہ ہوتا۔ لیکن واوہ بال کے مالک سے اُس کے گاؤں کا "ذیلدار" کہیں زیادہ ظالم تھا، مالک کی طرح وہ الوپ تو تھا نہیں نہ اپنی بڑی

بڑی ہڈیاں اور تھلتھلاتے گوشت کو لئے گاؤں میں گھر گھر گھومتا تھا۔ ہر دن اُس کا سامنا تھا وہ اُس کے حکم کو کیسے ٹالتا؟

اور قلیوں میں سے ایک تو یہ رونا رو رہا تھا کہ اُس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی لنسوار کے لئے فرنگیوں سے ایک خوبصورت سی خالی شیشی مانگ لائے گا۔ اب جو فرنگی اُسے موت کی طرف گھسیٹے لئے جا رہے تھے۔ بڑھیا شیشی کہاں سے لیتی؟ لنسوار ہی اُسے کون دیتا! وہ اب کھاتی ہی کہاں سے ——— ؟ کچھ ولی جو کے ڈر سے وہ رونے کی آواز کو گھونٹتا رہا کچھ اُس کا وہ غصہ آنسوؤں کو جلاتا رہا جو اس کو اپنی بیوی لوری پر آ رہا تھا ——— ذرا ذرا سی بات پر لوری اُسے کوستی رہتی تھی۔ اب وہ کوسنے سچے ہو رہے تھے..... سچے ہو رہے تھے......... خبر سنتے ہی لوری غفار کو بلائے گی اور اُس کے ساتھ دوسرا بیاہ کرے گی ——— وہ رنج اور غصے کی دو کیفیتوں کو اپنے دائیں بائیں پیروں کے ساتھ ساتھ اٹھاتا اور گراتا جا رہا تھا۔

تیسرا جو فرنگیوں کے دستر خوان کو جھاڑتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ولایتی کلچوں کے چورے سے اُس نے یوں ہی جیبیں بھر رکھی تھیں۔ بچے کہاں ——— ؟ اب موت اُس کا انتظار کر رہی تھی اور جب وہ جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا اسکی آنکھوں میں جیسے وہ ساری برف گھسی جاتی تھی۔ کیونکہ اُسے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ بچے اُس کی جیبوں پر ٹوٹ پڑے ہیں اور مٹھیاں بھر بھر نکال رہے ہیں۔

ایک اور تھا جس کی بیوی ایک طویل جھگڑے کے بعد میکے سے آئی تھی۔ اُسے یہ افسوس کھائے جا رہا تھا کہ وہ کچھ اور دن بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اُس گرم گرم بدن کی یاد عالمگیر برف کے باوجود اُسے جیسے گرم سلاخوں سے چھو رہی تھی۔ کاش اُسے پہلے پتہ ہوتا کہ ایک ایسی مہم پر آنا ہوگا وہ ایک طویل جھگڑے میں وقت کیوں ضائع کرتا؟

پھر وہ بھی تھا جس کے گلے کو برانڈی کی چسکی جلا رہی تھی۔ جو ابھی ابھی فرنگی نے دی تھی۔

وہ یہ دعا مانگ رہا تھا کہ موت کے وقت اُسے کلمہ پڑھنا یاد رہے، نہیں تو یہ شراب کی چُسکیاں اسے جہنم میں پھینک دیں گی۔

اور وہ تین فرنگی بھی انسان تھے۔ یہ مہم انہوں نے ٹھیک موسم میں شروع کی تھی۔ اس موسم میں برف کے ذرّوں کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوئے تھے لیکن وہ یہ سمجھے تھے کہ یہ قدرت کی ایک چھوٹی سی بھول ہے جس نے ان کی ایک بڑی مشکل کو حل کیا ہے اور ایسی برف باری کی ان کو کہاں امید تھی؟ پہلے گالوں کو دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے سے مذاق کئے کیونکہ برف کے گالوں کو بھی وہ فطرت کی ایک بھول سمجھے۔ پھر جب برف سنجیدگی کے ساتھ گرتی رہی وہ ہمت کے ساتھ ایک نئے تجربے کو حاصل کرنے کے لئے آگے بڑھتے چلے۔ لیکن جب برف نے رُکنے کا نام نہ لیا اُن کے دل بھی دھڑکنے لگے۔ پھر ان پر یہ بھی واضح ہوتا گیا کہ سائنس نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ان کے تجربے نے ان سے دغا کی ہے اور وہ اپنی بے بسی کو اپنی اپنی جگہ چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔

ان میں جو سب سے آگے تھا وہ کچھ اور قدم اپنے ساتھیوں کی آزمائش کرنے کی قوت رکھتا تھا۔

کچھ اور قدم غصے میں اپنی ہی بوٹیاں کاٹنا چاہتا تھا۔ لیکن اب تو ہر قدم پر اُس کی رانیں تک برف میں گڑ جاتی تھیں۔ وہ ساتھی فرنگیوں کی بے مثال خود غرضی پر خشمناک اپ جھنجھے میں تھا، کسی نے ایک قدم روکا ہی ہوتا —— یہ تو وہ جانتا تھا کہ پہاڑ کی اس کیفیت میں واپس اُترنا آگے بڑھنے سے کم نہ تھا لیکن واپس اترنے کی بات پہلے وہی کیوں چھیڑتا؟ پھر بھی اُس نے مڑ کر کئی بار پیچھے چھوڑے ہوئے گڑھوں کو دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ ننھے گڑھے کیا یہ گرتی برف تو گہری وادیوں کو بھرنے لگی تھی —— اور بدن کا ہلنا چونکہ جینے کے لئے ضروری تھا وہ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

دوسرے فرنگی کے لئے آگے بڑھنا نسبتاً آسان تھا کیونکہ اُسکے پیر ٹھیک اُن گڑھوں

میں گرتے تھے جو اگلے کے پیر قدم قدم پر جان توڑ کر کھود رہے تھے لیکن یہ فرنگی اس امید میں اگلے کی پیروی کر رہا تھا کہ وہ ایک لمحہ رُک جائیگا، اور اُس کی رائے پوچھے گا ـــــ اگر اگلا رُک بھی جاتا، پوچھ بھی لیتا یہ اُسے کیا مشورہ دیتا۔ برف اتنی اونچی ہوگئی تھی کہ وہ کچھ اور سوچ نہیں سکتا تھا اُس کی آنکھوں کے سامنے یک بہ یک وہ مکالمے اور کتابیں آرہی تھیں جو اس مہم کے بعد لکھنی تھیں۔ اُس نے مشاہدے اور تخیل کو جوڑنے کے کیا کیا ارادے کئے تھے۔ لیکن آہ اب اس کی تصویر بس ایک بار چھپے گی جس کو دیکھ کر اس کی محبوبہ بس ایک بار روئے گی ـــــ پھر یہ اگلا بے وقوف آگے کہاں بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کس جنون میں سب کو گھسیٹے لئے جا رہا تھا ـــــ؟

تیسرا فرنگی فلسفی تھا۔ عمر بھر اس نے کتابیں لکھی نہیں بلکہ پڑھی تھیں۔ وہ بس اپنی یاد میں ٹٹولتا جا رہا تھا کہ اُس نے کسی کتاب میں یہ بات پڑھ لی تھی کہ آسان اور بے خبر موت صرف برف اور سردی کی شدت سے ہی میسر ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔۔" حمد کھودایا"[1] ـــــ قطار کے آخیر سے چھٹے قلی رحمان نے اونچی آواز میں خدا کا شکریہ ادا کیا۔ اُس آواز نے اچانک منتشر دلوں پر ایک ہتھوڑا مارا اور سب میں غصے کی ایک بھڑک پیدا کی۔ سب کے قدم وہیں رُک گئے جیسے اُجڈ رحمان نے پیچھے سے رسی کو ہی کھینچا تھا۔ اگلا فرنگی پھٹ پڑا، دوسرا فرنگی پھٹ پڑا اور تیسرے کے دماغ میں بھی اُس کتاب کا نام آیا ہی چاہتا تھا۔ جب وہ آواز پیچھے سے کاٹنے آئی ـــــ اگلے نے تو آگے بڑھنے سے صاف انکار کیا۔ دوسرے نے واپس اترنے کے لئے آسمان سر پر اٹھایا اور وہ قلی جو بھی اس وقت یہ بھول گیا کہ وہ رسی میں بندھا ہوا ہے کیونکہ وہ رحمان کو پیٹنے کے لئے واپس مڑنے لگا تھا، گویا واوہ بال کی سلطنت میں خدا کا نام لینا بھی جرم تھا ـــــ عجیب افراتفری مچ گئی۔ کیونکہ وہ قلی بھی رحمان کی طرف مڑ کر رونے سے لگے تھے اور رحمان اس احساس میں وہیں گڑ گیا کہ اُس نے کوئی بڑی غلطی کی ہے

[1] حمد خدایا

"حمد کھودایا" رحمان کے منھ سے یونہی نکل گیا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں پلکیں نہیں تھیں، اور ان پر بھنویں بھی نہیں تھیں۔ مقابل کی ہوا برف کے گالوں کو اس کی آنکھوں میں دھکیلتی تھی پھر جب ہوا بالکل رک گئی۔ ــــ کے گالے اس کی آنکھوں کے نیچے ابھری ہوئی ہڈیوں پر ہی رُکنے لگے۔ اس کی آنکھوں کو آرام ملا تو اس کے منھ سے خود بخود "حمد کھودلیا" کی آواز نکل آئی۔ اس ایک پریشانی کے علاوہ اُس کے دل میں کوئی تلخی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ فولاد کا بنا ہوا تھا ــــــ اس کے گھر میں بس ایک موسی تھی، کوئی اپنا نہ تھا جس کی یاد اس کی زندگی کو قیمتی بناتی اور اُسے رُلا دیتی۔ وہ موسی بھی دیسی تھی کہ روٹیاں تب ہی پکانے آئی جب خاوند نے اسے گھر سے نکال دیا ــــ پھر ایک اور بات تھی۔ اگر وہ پانچوں قلی مر بھی جاتے اور وہی اکیلا گھر پہنچ بھی جاتا اسے تب بھی یہ اُمید نہ تھی کہ ان کی پانچ رانڈوں میں سے ایک بھی اُس کے ساتھ نکاح کرے گی۔ اسکی صورت اس حد تک بدنام ہو چکی تھی۔

مُہم والوں نے اپنے غصے کو ایک مشترکہ فیصلے سے بجھایا کہ انکی قطار وہیں پر واپس مڑ لے، سب سے آگے بدشگون رحمان برف کو بیلچے سے پیٹتا چلے اور راستہ بناتا اترتا جائے۔ ابھی یہ تو امید تھی کہ اپنی جگہ واپس آئیں گے جہاں سے اسی صبح چل پڑے تھے اُس اپنی جگہ پر پہاڑ کی ایک گودی کھل رہی تھی جہاں پر اسی نئی برف کو دبا کر تنبو کھڑا کیا جا سکتا تھا۔

اجڈ رحمان بیلچے مارتا گیا اور اُترتا گیا اور دلی جو جو فرنگیوں کے قریب رسی میں جُتا ہوا تھا فرنگیوں کو پھر سے "داوہ بال کے مالک کی دہشتناک کہانیاں سناتا گیا اور جب کافی اُترنے پر بھی ان کو وہ پھیلی ہوئی گود نہ ملی تو لی جو فرنگیوں کو سمجھانے لگا کہ مالک اُن گودوں میں بھی نئے گھٹنے ڈال سکتا ہے۔ دیکھے بھالے راستوں کو مٹا سکتا ہے، انتقام کے جذبے میں سب کچھ کر سکتا ہے ــــ فرنگیوں کو یہ راز کی باتیں بتاتے ہوئے اُسکی آنکھیں گھوم رہی تھیں، مالک اور اُس کے غضب ناک اشاروں کو کھوج رہی تھیں، اس کی یہ گھومتی ہوئی نظر رحمان پر ہی آکے رُکتی تھی۔ اُسی کو اُس نے غور سے دیکھا اور اُسے یقین ہو گیا کہ رحمان بہت تھک گیا

ہے۔ اُس کی باتوں کا سلسلہ ابھی ٹوٹا تو تھا نہیں، وہ اب اس بات پر زور دینے لگا کہ مالک قربانی لے کر معاف بھی کرتا ہے۔ پارٹی میں سے اگر کسی ایک کو مالک کے نام چڑھایا جائے تو مالک چڑھاوے کو قبول کرتا ہے۔ باقیوں کو معاف کرتا ہے۔

اُترتے اُترتے جب دن کی بیشتر گھڑیاں بیت گئیں۔ اُن کی ٹانگوں میں خون کے راستے بند ہونے لگے اور باقی پانچ قلیوں نے بھی جیسے انہی اندر کے راستوں کو صاف کرنے کے لئے اپنے بیلچے نکالے، رسی سے الگ ہو کر تھپا تھپ برف کو پیٹتے چلے، اور اپنی زندگی کا راستہ اپنی اپنی قوت کے مطابق بناتے گئے اور اُترتے گئے ——— اور رحمان جو بہت تھک گیا تھا۔ فرنگیوں کے ساتھ اب اوروں کے راستوں پر ہی اُترنے لگا۔ مُہم میں اس تھپا تھپ کے ساتھ ایک زندگی سی بھڑک اٹھی، ایک اُمید سی اچھلی، لیکن جو کچھ اُچھلا اُن کی اپنی ہی رگوں سے اچھلا۔ جن میں ان مجنون بیلچوں نے ایک بار پھر خون کو اچھالا تھا۔ ورنہ فضا میں وہی گمراہی تھی، وہی خوف ناک عزم تھا، وہی خشمناک جلدی تھی۔

دن کا ایک اور حصہ جب ڈھل چکا تو فلسفی فرنگی نے رُک کر دوسرے فرنگیوں سے کہا کہ اُسے نیند آرہی ہے۔ اس لفظ نیند کو اُس نے انگریزی میں کہا تھا اور بہت دھیمی آواز میں جیسے نیند میں ہی کہا تھا۔ لیکن قلیوں نے بھی اس بات کو اتنا ہی سمجھا، جتنا فرنگیوں نے۔ وہ سب وحشیوں کی طرح نیچے دوڑنا چاہتے تھے۔ بدن کی بوٹی بوٹی کو ہلا کر وہ نیند کے تصور تک کو اپنے سروں سے جھاڑنا چاہتے تھے۔ دو فرنگیوں نے فلسفی فرنگی کو کچھ پلایا۔ اس کی آنکھوں میں انہوں نے مرچوں سی کوئی دوا جھونک دی۔ اس کے دونوں ہاتھ دو آدمیوں نے پکڑ لئے اور اُسے نیچے کھینچتے گئے۔

برف کا ایک ایک گالا پھولتا گیا اور گالے پہ گالا برف کے نئے پہاڑ چڑھاتا گیا ——— محض اس لئے کہ چند انسانی جانیں خطرے میں تھیں۔ یہ برف کیوں تھم جاتی ———؟ گرتے پھسلتے یہ انسان پہاڑ کی ٹیڑھی لکیروں کو کھوجتے رہے۔ لیکن انہیں کوئی ایسی ڈھلان کوئی

ایسا ٹیلا دکھائی نہ دیا جس کو دیکھ کر وہ ایک اور بار اُچھل پڑتے اور اُمید کرتے کہ وہ اپنی جگہ پر پہنچیں گے اور جب وہ پہاڑ کسی طرف سے بھی ختم ہوتا دکھائی نہ دیا، ان کو اپنی زندگی کی سرحدیں صاف دکھائی دیں، جن کے قریب وہ لڑکھڑاتے ہوئے بھی جا رہے تھے اب تو ان کے بیلچے اٹھتے اور گرتے ہوئے ہوا میں دائرے بنا رہے تھے۔ پھر ایک کے بیلچوں کی آواز میں خوفناک وقفے سن کر دوسرے کا بیلچہ الٹا گرتا اور برف میں دھنس جاتا، پھر اپنی بے حسی پر اُس کا اپنا کلیجہ منہ کو آتا، اُس کے اوسان خطا ہونے لگتے۔ وہ موت کی گرفت سے جوں توں نکل جاتا، اس کے کھوکھلے کونوں سے رہی سہی زندگی ایک بھبوکے میں اچھل پڑتی اور وہ بھی بیلچے کو کھینچ لیتا اور ہوا میں اٹھاتا۔

یکے بعد دیگرے بیلچے خاموش ہو گئے اور مہم کے پانچ قلی برف پر بیٹھ، ٹانگیں پھیلا، دائیں بائیں ہاتھ برف میں گاڑ کر غیر واضح اترائیوں پر دھیرے دھیرے کھسکنے لگے، اب ان کی رگوں میں جیسے دیواریں چڑھ چکی تھیں جن کے پیچھے رُکا ہوا خون چلّا رہا تھا۔ کانوں میں ٹھنڈی موت کی ایک بے سُری صدا آنے لگی تھی۔ جس سے شاید ان کے دماغ بھی سُن ہونے لگے تھے۔ کیونکہ اب وہ جس طور برف پر کھسکنے لگے تھے اُس سے ظاہر تھا کہ یہ حرکت صحیح دماغ کی تدبیر نہیں تھی بلکہ وارفتہ بوٹیوں کی اپنی پھڑپھڑاہٹ تھی ——— چھٹا قلی رحمان جو واقعی فولاد کا تھا۔ ان سب کے پیچھے اب تو فلسفی فرنگی کو اپنی پیٹھ پہ لیے قدم بہ قدم اُتر رہا تھا۔ فلسفی اس کی پیٹھ پر اپنی میٹھی اور جمی ہوئی نیند سو رہا تھا اور دو فرنگی رحمان کی دونوں طرف کھڑے اُتر رہے تھے۔ فلسفی کے نرم نرم بوجھ سے رحمان کے دل میں گرمی کا تصور آگیا تھا بلکہ حقیقتاً اُس کے سانس کی ابری لکیر اب تو سب میں گھنی تھی۔

آخر مہم رک گئی ——— وہاں سے پہاڑ کا ایک مونڈھا سا ایک لمبے تابوت کی شکل میں افق تک پھیلا ہوا تھا۔ اُس کے موڑ میں نیچے پہنچانے کا ذرا بھی وعدہ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ لمبائی بہت دُور سے مڑ کے پھر یہیں آتی ہے جہاں سے وہ دیکھ رہے تھے اور چونکہ وہ کمر توڑ لمبائی وہیں سے سالم نظر آ رہی تھی کھسکتے جسموں کو جیسے سکتہ ہوا۔ بوٹیوں کی

پھڑپھڑاہٹ بند ہونے لگی۔ لیکن اس جگہ پہاڑ کی ایک ٹھوڑی سی نکلی ہوئی تھی جس کا نکیلا سرا نیچے خلا کی طرف گرا ہوا تھا۔ ٹھوڑی سے نیچے کی دنیا کا پتہ پتھرائی ہوئی آنکھوں کو کیسے لگتا؟ مگر اس سرے کے بعد کی دنیا یقیناً نچلی دنیا تھی، ہم کا ایک ایک آدمی اس نقطے سے اچھلنا چاہتا تھا ایک پھاند میں نیچے جانا چاہتا تھا۔ پر اس وارفتگی کی حالت میں بھی وہ انسان تھے۔ پہلے اس بات کا یقین چاہتے تھے کہ نیچے کوئی دنیا تھی اور وہی اپنی دنیا تھی جہاں وہ پہنچنا چاہتے تھے۔ پھر چونکہ کودنا ضروری تھا۔ وہ اس دنیا کو کہیں نزدیک بھی چاہتے تھے ——— ان سب باتوں کا کون پتہ لگاتا؟ کسی ایک کو تو کودنے میں پہل کرنی تھی۔

اس بڑے موقع پر ولی جو نے بڑی ہمت کی، اپنے آپ کو ہلایا، جھنجھوڑا اور سوچا۔ اسے داوہ بال کا مالک سامنے دکھائی دیا۔ چڑھاوے کا اب بھی موقع ہے اس نے سوچا۔ بلکہ موقع اور مقام وہی تھا۔ سوتے اور جاگتے ہوئے فرنگیوں سے رحمان کو الگ ہونے کا حکم دیا، الگ ہوا تو سرے سے کودنے کا دوسرا حکم دیا۔ لیکن اجڈ رحمان ہلا بھی نہیں جیسے اب اس کو بھی جان پیاری ہو گئی تھی۔ اس کو بھی جیسے یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس اکیلے میں اس وقت ان سب کا مقابلہ کرنے کی طاقت ہے۔ ولی جو کا طنطنہ یونہی گیا۔ اس کی پھیلی پھیلی سستی سے نکلتی ہوئی گالیاں بھی یوں ہی گئیں۔ تو فرنگیوں نے مناسب دخل دیا۔ انہوں نے رحمان کو بہت بہت سلام کہا، کہ وہ سب میں قابل تھا کہ وہ سب کو بچا سکتا تھا اور خود بھی بچ سکتا تھا کہ وہی ایک تھا جو اس سرے کے نیچے سے پتہ لا سکتا تھا۔ اسے انہوں نے بہادری کے صلے گن دیئے۔ عمر بھر کی پنشن کے وعدے کئے اور باتوں باتوں میں اس کی کمر کو ایک رسی سے باندھ دیا۔ اور رحمان کا خون بھی خوف سے جمنے لگا اور جب رسی بندھ بھی گئی، اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بھی اپنی مری ہوئی ماں کو پکارنے لگا اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔

اس کی چیخیں اتنی اونچی نکلیں کہ ایک بار اس منجمد فضا میں جان سی پڑ گئی، سننے والوں کے کانوں میں موت کی صدائیں دب سی گئیں۔ ان کے گھٹے ہوئے سانس اس کی چیخوں کے

سُر میں نکلنے لگے جیسے اب اُس کی آواز سب کی آواز تھی۔ جیسے وہ اپنے اور اُن کے آنسو بہا رہا
تھا۔ جیسے اُسی میں وہ سب ابھی گرم تھے، زندہ تھے ــــــ لیکن خود اسے یہ یقین ہو گیا
تھا کہ اس کی اپنی زندگی انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ اُس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور وہی آنسو
بہاتے اپنے گاؤں کے پانچ آدمیوں سے درخواستیں کیں کہ وہ سب رسی پر بیٹھ جائیں اُسے
دبائے رکھیں اور جب وہ رسی کو ہلائے یا آواز دے اُسے فوراً واپس کھینچ لیں، اپنی تمام قوت
کا استعمال کریں اور فرنگیوں کو بھی ساتھ لگائیں ــــــ پھر اس نے خدا کا نام کیا ایک
جھُرجھری لی اور سرے سے نیچے سرک گیا۔ ولی جو نے رسی کو ڈھیلا چھوڑا اور رحمان ہوا
میں لٹک گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پہلے ہی جھٹکے میں تمام رسی ہاتھوں سے نکل گئی۔ شاید اس لئے
کہ ہاتھ سن ہو چکے تھے، شاید اس لئے کہ وادہ بال کے مالک نے چڑھاوے کو قبول کیا
تھا اور وہ خود رحمان کو نیچے کھینچ رہا تھا ــــــ اور رحمان؟ ــــــ رحمان پر تو پہلے
ہی جھٹکے نے بجلی گرا دی، اس کی تمام جان رسی کے بے کار نوک سے لپٹ گئی۔ موت کی
آندھی میں اُس کی بوٹی بوٹی نے رسی کے بھاگتے ہوئے سرے کا تعاقب کیا اور آنکھیں بند
کر کے چُور چُور ہونے والی اُمید میں اُس نے اپنے دانتوں کو بھی ایک دوسرے پر دبایا اور
جب ٹھوس زمین کو اُس کے جسم نے چھوا اُس کی ساری زندگی ایک وحشیانہ چیخ میں نکلی اور
وہ گر پڑا ــــــ

دوسری دنیا میں رحمان دل میں پہلے حیرت آگئی کہ وہ گرتا ہوا بہت لمحے ہوا میں رہا تھا،
پھر یہ کہ گر کر اُس کے ٹکڑے نہیں ہو گئے تھے۔۔۔۔ اس خیال کے بعد اس کے دل کی دھڑکن
تیز ہوتی گئی۔ اسی دھڑکن نے جیسے اُس کے بند دروازے کھٹکھٹائے، وہ جگ سا گیا اور اُس
نے اپنی پُرانی بوٹیوں کو پہچانا جو سالم اور جڑی ہوئی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ وہ وہی رحمان،
برف کی ایک آرام کرسی میں پھنسا پڑا ہے۔ اُس کے دل کی دھڑکن جب اور تیز ہو گئی تو
اُس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ کرسی اُس کے اپنے بدن نے گرتے ہوئے کھودی ہے ــــــ

لیکن یہاں کی دنیا نئی ضرور تھی، یہاں کی برف گھٹنوں سے ذرا ہی اونچی تھی اور ہوا میں برف کے باریک ذرّے چکر کاٹ کاٹ کر نیچے آرہے تھے۔ یہاں کے بادل بھی اتنے اونچے تھے کہ رحمان باریک ذرّوں کے بیچ میں سے چاروں طرف دیکھ سکتا تھا اور جب وہ اس دھڑکتے ہوئے دل کو لے کر آرام کرسی سے باہر آیا اور اُس نے باز کی جیسی آنکھیں نیچے کی طرف جمادیں۔ اُسے پہاڑ کی ایک میٹھی میٹھی ڈھلان دکھائی دی۔ ڈھلان کے نیچے اُس نے کالے کالے بلوں کا ایک جھرمٹ دیکھا۔ اُس نے آنکھیں پھاڑ کے دیکھا تو وا وہ بال کے قدم پہچان لئے اور ان کالے کالے بلوں میں جھونپڑیاں دیکھیں ——— !!

——— اور اسی وقت اُس میٹھی میٹھی ڈھلان کے کہیں اوپر وا وہ بال کا مالک برف کی ایک تیز آندھی چلا رہا تھا۔

کاغذ کا واسدیو

جب دھوئیں کی لپیٹ میں مرگھٹ کے دیو دار بھی آگئے واسدیو سے کہا گیا کہ چتا کو نمسکار کرے اور گھر کی طرف چلے۔ اس وقت واسدیو کے ہاتھ پاؤں اوروں کے اشاروں پر ہی چلتے تھے۔ خود تو وہ کہیں اور تھا، ہاتھ پاؤں سے دور، ایک ایسی دنیا میں جہاں بنیادیں ہل رہی تھیں، جہاں گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں۔ جہاں کروڑوں واسدیو گم ہو جائیں تو اُن کا پتہ بھی نہ چلے۔ ایک دیو کی کے اُٹھ جانے سے ارد گرد کے پہاڑ بھی گویا کھوکھلے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن واسدیو ابھی گم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کی آواز ارتھی کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی سن لی تھی۔ ان کو جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے آتے دیکھا تھا اور پھر جب ارتھی نالے تک آگئی اس نے دل میں فیصلہ بھی کیا تھا کہ بچے مرگھٹ تک نہیں جائیں گے، یہ وہ نہیں دیکھیں گے کہ ماں ان شعلوں میں گم ہو گئی، اور باپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور جب ارتھی نالے کے پار آگئی تھی اس نے نالے پر سے تختہ بھی اٹھا دیا

تھا کہ اگر وہ دونوں نالے تک آبھی گئے پھر بھی اُسی پار رہیں گے۔ واسدیوان گھاٹیوں کو دیکھ رہا تھا دھیرے دھیرے اور بیچ بیچ کر ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس نے نمسکار کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈھال پہ اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے، شاید اس لئے کہ اس کے سینے میں پہاڑ گھسنے لگے تھے۔ یا اس لئے کہ وہاں سے دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے جن کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالہ گرتا، لپکتا اور بل کھاتا اسی کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس پار اُس کے بچے بھی شاید اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جو اب دیو داروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا ——— کتنی پاس تھیں وہ گھاٹیاں کتنی گہری، یہ دھواں بھی اُسی کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم سنبھالے، آنکھیں کھولیں اور نالے کی اترائیوں کو دیکھ کر ان اونچائیوں کی طرف بھی نظریں اٹھائیں۔ جہاں سے یہ پانی مچلتا ہوا اچھلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کان بھی کھولے۔ پانی پتھر پہ گر کے ٹوٹ رہا تھا، لیکن ٹکراؤ میں اُس نے ہنسیاں سنیں۔ ٹوٹے ہوئے پانی کو لہروں میں جاتے دیکھا، آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اُس کے پاؤں میں قوت سی آگئی اور وہ بچوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا گیا۔

نالے پر تلسی اور موہن اُس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے گھاٹیاں کیا وہاں خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑوں کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا۔ لیکن اُس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالہ جو سامنے تھا اسی کے قہقہے اٹھا لیے اور اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے، اتنے قہقہے جیسے وہ ہنستا ہوا نالہ اسی کے سینے سے نکلنے لگا ———

پھر بات بات پر واسدیو کے قہقہے گونجنے لگے۔ بات بات ہنسی کی لہروں میں سموئی ہوئی نکلی۔ اُس کے قہقہوں سے وادی بھر گئی۔ گھاٹیاں بھر گئیں، پہاڑوں سے بھی قہقہوں کے جواب آنے لگے۔ کائنات ہنسنے لگی۔ بچے بھی ہنسنے لگے، اتنا کہ ان کو مردوں تو کیا۔ زندوں تک کے نام لینے کی فرصت نہ ملی۔ دن بھر ہنستے ہنستے انہیں رات کو ہنسی کے سپنے آنے لگے۔ واسدیو اور وہ دو کاغذ، کمانی اور ڈور کی طرح ایک رنگیلے پتنگ میں جڑ گئے اور قہقہوں میں لہرانے لگے۔

وہ تینوں ہر وقت جڑے رہتے تھے۔ رات کو خاندانی لحاف میں، دن کو رسوئی میں، آنگن میں، کوٹھار میں یا دھان کے کھیتوں میں۔ لیکن جہاں بھی ہوتے کھیلتے۔ واسدیو سیدھی بات کرتے ہوئے ناک کو کچھ ایسے سکیڑتا۔ ہونٹوں کو کچھ ایسے ہلاتا، منہ پر ایسے زاویے بناتا کہ تلسی اور موہن لہروں میں ہی رہتے۔ ہنستے ہی رہتے ——— نت نئی بات ہوتی، نئی بات پر نئے ہنستے قہقہے نکلتے اور واسدیو تماشے پر تماشہ کرتا جاتا۔ کچھ اور نہیں تو بیٹھے بیٹھے پگڑی سر سے اتارتا، اسی کو طرح طرح سے باندھنے لگتا۔ پھیلی ہوئی، چڑھتی ہوئی، بڑی ٹوکری سی جیسے نمبردار باندھتا تھا۔ گھٹی گھٹی، گول گول، شنکھ سی، جیسے پنڈت جی باندھتے تھے۔ بٹی ہوئی رسی جیسے نہوں والی، پھنکارتی ہوئی جیسے چوکیدار باندھتا تھا۔ وہ سبھا کی نقل کرتا جو ساہوکار کے سامنے تتلاتا تھا۔ اسی طرح کی پگڑی ماتھے تک لاتا، ہاتھ میں ساہوکار کی طرح نسوار دانی کو لیتا، پھر ساہوکار کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اُسے گالیاں دیتا۔ دوطرفہ کھیل میں واسدیو کی ایک آنکھ سبھا کی سی پھٹی پھٹی ہو جاتی اور دوسری ساہوکار کی طرح تیز تیز چلتی۔ کبھی تو وہ بھٹے کی ڈاڑھی منہ پہ لگاتا، ٹوٹی ہوئی عینک ناک کی نوک پر رکھتا اور سر نیچے اور آنکھیں اوپر حسن حکیم کی طرح نبض دیکھنے لگتا۔ ہر مرض کی وہ ایک پڑیا باندھتا، اور جیسے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں سے منقیٰ، سپستاں، بادیان، منقیٰ، سپستاں بادیان" کی رٹ لگاتا۔ تلسی کہتی "حکیم چاپ میلی آنکھ میں دلدل ہے" وہ پڑیا اُٹھاتا اور کہتا "منقیٰ، سپستاں بادیان" موہن کہتا "تیتم تاب موے پیل میں دلدل ہے۔" وہ وہی پڑیا اٹھاتا۔ "منقیٰ، سپستاں، بادیان" احمد چپراسی سے لے کر پنڈت جی تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی اُس نے نقل نہ اتاری ہو تلسی موہن کو ہنسانے کے لئے، پتنگ کو ہوا میں رکھنے کے لئے۔

واسدیو کو بھی زندگی بسر کرنی تھی، صبح شام کی جدوجہد اسے بھی کرنی تھی، وہ بھی پسینے بہاتا رہا۔ جینے کی محنتیں بچوں سے بھی کرواتا، لیکن ایسے جیسے وہ تینوں ہر دم کھیل کے میدان میں تھے۔ کھیت سے گزرتے وہ گیدڑوں کی آوازیں نکالتے پہاڑ پر چڑھتے تو رام، لکشمن، ہنومان کا کھیل کھیلتے۔ وہ دو واسدیو کے کندھوں پر سوار، واسدیو ہنومان کا منھ بنائے، ہنستے، کھیلتے کٹھن منزلوں کو طے کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے پانیوں میں نہاتے، بطخوں کی طرح ڈبکیاں مارتے، پانی کی چٹکیوں پر بھی نہ روتے، بطخوں ہی کی طرح

"کوُ ئے کوُئے" کرتے، تالیاں بجاتے، غل مچاتے اور تلمیذوں کو پاس بھی نہ آنے دیتے۔

ہنسنے ہنسانے کے علاوہ واسدیو اُن کے لئے کھلونے بھی بناتا تھا۔ شہر اس گاؤں سے بہت دور تھا، جس کے راستے میں بہت سی پہاڑیاں تھیں۔ اتنی دور واسدیو کھلونے لینے کیسے جاتا؟ جاتا بھی تو شہری کھلونوں کے دام کہاں سے لاتا؟ وہ اپنے کھلونے آپ بناتا۔ نئے کھلونے جن میں جان ہوتی تھی، جن کا بچوں سے زیادہ رشتہ ہو جاتا بہ نسبت ان شہری کھلونوں کے جن کے دام بھی زیادہ ہوتے تھے۔ وہ چشمے پر لٹکتے ہوئے سیبوں پر چونا پوتتا اور دن میں ہی چاند تاروں کو چشمے میں تھرتھراتے دکھاتا۔ اخروٹ کے خول میں چاول کے چار دانے ڈالتا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکاتا، گھوڑے کے ایک بال کے ساتھ ذرا سی تیلی باندھ کر بال کو کاغذ میں پھنسا دیتا۔ بال کے دوسرے سرے کو ایک دانتن کے ساتھ باندھتا اور دانتن کو گھماتا۔ اخروٹ بولنے لگتا اور بچے گری کھا کر اخروٹ کا گانا بھی سن لیتے۔ وہ سیبوں، ناشپاتیوں کو کھوکھلا کر کے، بید کی سینکوں کو ٹیڑھا کر کے، گول گول کنکروں کو ترتیب میں بٹھا کے بید مشک کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر من بھائے باغ لگا کے کھلونوں کی ایک انوکھی دنیا میں رہتے تھے۔

اس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اُسے اُن بچوں میں خوشی ہی کا نہیں بلکہ خوش قسمتی کا بھی احساس پیدا کرنا ہے اور جب کبھی وہ کسی دوسرے کو ان کے مقابلے پر اترتے دیکھتا اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، وہ زمین کھودتا، پہاڑ پر چڑھتا، تلسی موہن کی وہ چیز پیدا کرتا کہ ان کا سر نمبردار کے لڑکے سے بھی اونچا رہے۔

نمبردار کا بھائی شہر میں کسی افسر کے ہاں نوکر تھا۔ بھتیجے کے لئے وہ ایک ولایتی گڑیا لے آیا۔ اُسی دم نمبردار کا بیٹا گڑیا نچاتا، اودھم مچاتا مغرور تلسی کو دکھانے آیا۔ تلسی اور موہن اس لمحے واسدیو کے پاس تھے۔ وہ وہیں آنگن میں کھڑا تھا۔ آنگن کی برف کو بیلچوں سے کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار سے باہر پھینکتا جا رہا تھا۔ اس نے بھی وہیں سے گڑیا دیکھی اور اس سے پہلے کہ وہ تلسی کے چہرے پر ایک سایہ دیکھتا اس نے ایک نعرہ بلند کیا جیسے وہ اس وقت کیا کرتا تھا جب کام کرتے کرتے اُسے کوئی نیا کھیل

سوجھتا۔ تلسی اور موہن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گڑیا والے کو وہیں چھوڑ کر برف پر لڑھکتے پھسلتے باپ کی طرف دوڑے چلے گئے۔ واسدیو نے دونوں کو اٹھاکر پیار کیا۔ ان کو مکان کے برآمدے میں بٹھا کر ایک کمبل سے لپیٹا۔ تلسی نے گڑیا والے کو بھی کمبل میں جگہ دی اور آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ دیکھ میرا باپ کیا تماشا کرتا ہے اور جب واسدیو بھالو کی طرح چلنے لگا، جن پریوں کی طرح اچھلنے لگا۔ بیلچہ جادوگر کی طرح چلانے لگا اور برف کو کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار کے اندر ہی ایک ڈھیر میں چڑھاتا گیا۔ گڑیا والے کی گڑیا بھی کمبل میں گھس گئی اور دھیرے دھیرے اس کے نیچے دب گئی ذرا سی دیر میں آنگن بھی صاف تھا اور پکے برف کے ایک چھ فٹ لمبے تمام گڈوں کے باپ سے باتیں کر رہے تھے جس کی بھنویں اور جس کے بال گھوڑے کی دم کے تھے منہ تھا اور مونچھیں تھیں۔

گاؤں کے بہت سے بوڑھوں نے بھی شہر کو نہیں دیکھا تھا، بچے کیا دیکھتے۔ لیکن نمبردار کا بھائی اپنے بھتیجے کو شہر لے گیا اور واسدیو کو ایک بھاری خطرے کا اندیشہ ہوا کہ نمبردار کا بیٹا آکے شہر کی باتیں کرے گا، تلسی موہن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور یہ موقع وہ تھا کہ گہرے سوچ کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں کی حد پر اسی پہاڑی نالے پر سوچنے بیٹھا اور جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ اسی نالے کو گہری نظر سے دیکھنے لگا جو تلسی موہن واسدیو کی طرح اچھلتا، کھیلتا اور دوڑتا تھا۔ تلسی نے اسکے قہقہے بھی سنے تھے۔ اس نے واسدیو سے کئی بار پوچھا تھا، کہ نالے کو کون ہنساتا ہے۔ واسدیو نے ہر بار اس سے کہا تھا کہ نالے کا بھی ایک باپ ہے، بہت دور، پہاڑوں کے اوپر، آسمان کے پاس۔ یہ نالہ اسی کی گود میں سے نکل کر چلا آتا ہے۔ باپ اسے اتنا ہنسا کے بھیجتا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے اور جب تلسی نے یہ بھی پوچھا تھا کہ جاتا کہاں ہے۔ اسے سمندر کا بھی خیال آیا تھا لیکن سمندر کے تصور سے واسدیو کانپ اٹھا تھا؛ اس کے جمود اور خاموشی میں ہنسی نہیں تھی، نالہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ نالہ ہنستا ہی جاتا ہے۔ کہیں بھی نہیں رکتا۔ رکے ہوئے پانی کا نام نالہ نہیں ہوتا۔

وہ نیلا چشمہ جس کی باتیں چرواہے کرتے تھے جہاں سے وہ نالہ نکلتا تھا۔ ڈیڑھ دن کی کٹھن چڑھائی کے اوپر تھا۔ جانے والے کو رات کھلے پہاڑ پر بسر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن واسدیو نے عزم اور انتظام کر لیا۔

دو دن کی روٹیاں باندھیں اور دو لوئیاں اٹھائیں اور تلسی موہن اس سے پہلے کہ نمبردار کا بیٹا شہر سے آتا رام، لکھشمن ہنومان کا کھیل کھیلتے، ہری ہری ان دیکھی وادیوں میں سے گزرتے، پہاڑ کی دھوپ ہواؤں میں، پہاڑوں سے اوپر، آسمان کے پاس، وہاں، جہاں نہ نمبردار کا بیٹا پہنچ سکتا تھا، نہ تحصیلدار کا، خود نالے کے باپ تک آ گئے۔

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیاں بجھ گئیں جب اس نے تلسی سے یہ سنا کہ اس نے اور موہن نے بھی نالے کے باپ کو تین پہاڑ اوپر ایک رنگے ہوئے چشمے میں دیکھا تھا۔ چشمے میں برف کے بڑے بڑے لٹھے تیرتے ہوئے دیکھے تھے جو حقیقت میں نیلے میاں کے بازو تھے۔ یہ کہ ابا نیلا تھا لیکن بیٹا نکلتے ہی بے رنگ، پانی جیسا دکھائی دیتا تھا۔ مگر باپ کی گودی سے نکلتے ہی ہنسنے لگا تھا۔ انہوں نے وہ گدگدی بھی دیکھی تھی جو باپ اسے کرتا تھا اور یہ کہ گاؤں سے لیکر چشمے تک انہوں نے نالے کے ان گنت کھیل دیکھے تھے۔ کہیں سانپ کی طرح رینگتا تھا، کہیں شیر کی طرح جھپٹتا تھا کہیں چکی چلاتا تھا کہیں فوارہ۔ اس کے کنارے پتھر پہ انہوں نے مخمل بھی دیکھی تھی، ہری بھی اور لال بھی۔ یہ کہ راستے میں پریوں کے باغ تھے، جن میں وہ پھول تھے کہ کوئی زمین پر کیا اگا سکے۔ تلسی نے گھر کی گیتا کو کھولا اور نمبردار کے بیٹے نے ہر ورق میں ایک دبا ہوا، سوکھا ہوا نیا پھول دیکھا۔ یہ پھول نہ گاؤں میں تھے نہ شہر میں، افسر کے باغ میں بھی نہ تھے۔ تلسی نے اس سے یہ بھی کہا کہ اس نے راستے میں دھوپ اور ہوا کا بیاہ دیکھا۔ جب وہ دن بھر دھوپ اور ہوا میں رہے تھے اور انہیں نہ دھوپ لگی تھی نہ ہوا، دھوپ اور ہوا وہاں اتنی گھلی ملی تھی۔ تلسی اور موہن بادلوں سے بھی اوپر گئے تھے۔ ایک بار جب نیلے میاں کے اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ تھی، کہیں بہت نیچے بادل آ گئے تھے اور دھان کے ننھے ننھے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ اس وقت کسی پری نے ان کی خاطر بادلوں میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تھا، ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی۔ جس میں سے انہیں پھر سونے کے کھیت دکھائی دیئے تھے۔ وہ ایک جادو تھا، جب اوپر دھوپ تھی، نیچے دھوپ تھی اور بیچ میں بادل تھے۔ نمبردار کے بیٹے نے جا کر اپنے باپ سے کہا کہ تلسی، موہن اور واسدیو تینوں پریوں کے رشتہ دار ہیں اور باپ

کی ایک بھی نہ سنی جب اس نے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اس کے ماتحت انسان ہیں۔

اور واسدیو کھلونے بناتا گیا، تماشے کرتا گیا اور بچوں کو ہنساتا گیا۔ کبھی کبھی وہ تھک بھی جاتے اور اس کی طرف بیٹھ کر کے اپنے کھلونوں میں محو ہو جاتے گو ایسے لمحے بہت کم ہوتے جب واسدیو انہیں کھلونوں میں ہی محو ہونے دیتا۔ جب گھاٹیاں کھلنے لگتیں۔ اندر اندر نالہ بھی ڈوبنے لگتا، پتنگ کی ڈور کہانی ڈھیلی پڑتی، اور کاغذ کا واسدیو گر پڑتا۔ ایسے لمحوں کو وہ آنے ہی نہ دیتا۔

ہنستے ہنساتے گاؤں میں دوسری سردیاں بھی آگئیں اور وہ بڑا دن بھی آگیا۔ جب رات کو پہلی برف دبے پاؤں آگئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپہ چپہ سفید ہو گیا اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتوں کو خبر تک نہ ہوئی، ان کو برف کے سپنے تک نہ آئے، گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی جیتتا تھا۔ گاؤں والے اس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اس کی جیت زندہ رہتی، جب تک زمین کروٹ نہ بدلتی۔ ایک نئی برف کو لے آتی اور اتفاق کہیے یا قسمت کسی دوسرے کا ساتھ نہ دیتی۔ لیکن واسدیو نہ تو قسمت کو دیکھتا تھا نہ اتفاق کو۔ ایسے موقع پر وہ ہوا کو دیکھتا تھا۔ بادلوں کے رنگ کو دیکھتا تھا۔ کئی دن سے انتظار میں تھا۔ دن چڑھے تک کیسے سوتا، اس نے کھڑکی کھولی اور دیکھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو دیکھتے ہی چلا اٹھتا لیکن واسدیو اکیلا کیسے چلاتا۔ اس نے تلسی اور موہن کو لحاف میں سے نکالا، ان کی آنکھوں پر برف رکھ دی۔ ان کو جگایا اور برف کا تماشا دکھایا۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کیے (دو چی پی اور ایک پھٹا ہوا بانس سا)۔ ایک دم جیسے سمٹے ہوئے گاؤں کے ٹکڑے ہو گئے جیسے خاموش برف میں گرج آگئی۔ گاؤں بھر گھبرا اٹھا اور ایک ایک فرد بند مکانوں، لحافوں اور اندر کی گرمیوں کو کوستا اٹھا۔ انہوں نے کھڑکیاں کھولیں اور دیکھا۔ لیکن ان کی آوازیں کیسے نکلتیں؟ انہیں یقین تھا کہ واسدیو کی آوازیں جو پہاڑ سے پہاڑ تک چھا گئی ہے اُن کی اپنی آوازیں ایسے کھو جائیں گی جیسے برف کی ان جالیوں میں بارش کا ایک قطرہ کھو جاتا ہے۔ یوں تو ہر دل واسدیو کے ساتھ بول رہا تھا۔

"شینہ پیتو پیتو ماما یتو یتو"

(برف کے گالے آتا جا کتوں کے ماموں تو بھی آ)[1]

یہ تو تھا اس دن کا آغاز۔ یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں میں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہو گئے۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لئے بھوت سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بلی بھاندی پھنس گئی کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی ہلی برف کی چادر گری اور کسی کے سر پر آ گئی کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا جس نے دیکھا اُسی کے قہقہے نہ رکے۔

واسدیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا، وہ بھی برف کے بیلچے چلا رہا تھا۔ لیکن واسدیو کا بیلچہ عام ناویوں میں کیسے اٹھتا؟ وہ بیلچہ برف کو کاٹ بھی رہا تھا اور برف کے ساتھ مذاق بھی کر رہا تھا۔ وہ کاٹنا بھی کیا تھا۔ اس میں گدگدی سی کرتا اور آگے دھکیلتا۔ برف اس کے بیلچے سے کبھی گیند کی طرح اچھلتی تھی کبھی فوارے کی طرح ابلتی تھی۔ ہر بیلچے کے ساتھ واسدیو ایک نئے جانور کی بولی بولتا تھا۔ ایک ایسے موقعہ پر تلسی اور موہن واسدیو سے دور کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے بچوں کی طرح نچلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟ واسدیو پھر چھت ہی کو کیوں صاف کرتا؟ اُس کے دونوں بچے اُس کے قریب ہی چھت کی آڑی کھڑکی میں کھڑے چلا رہے تھے، ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔

لیکن اُس دن واسدیو کی طاقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا بیلچہ کانپنے لگا اور اُس کے پاؤں دُکھنے لگے —— اور جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بیلچے چلائے۔ برف میں بڑے بڑے گھاؤ کئے اور بڑے بڑے مستطیلوں کو نیچے دھکیلا۔ "کررر کررر دھپ۔ کررر کررر دھپ" جیسے برف ترنگ کی ایک تیز تال بجائی جا رہی تھی اور جب اس کا درد

---

[1] کشمیر میں تازہ برف پر کتے دوڑنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے ماموں برف میں ہی مر گئے تھے۔ دوڑتے اس لیے ہیں کہ ماموں اب لوٹ کے رہیں گے +

بڑھتا ہی گیا۔ اس کا بیلچہ جلدی کے جنون میں چاروں طرف چلنے لگا اور برف ہر طرف اچھلنے لگی۔ جیسے تلسی اور موہن کی خاطر واسدیو اب برف کی ایک آندھی چلانے لگا تھا۔ وہ ان کو یہ کیسے سمجھاتا کہ اسے شدید بخار آگیا ہے اور اس کی ٹانگیں برف میں جواب دے رہی ہیں وہ اُن کا ایسا بڑا دن کیسے بگاڑتا؟ کانپتا، ہلتا، تماشے کرتا، بچوں کو لے کر وہ آنگن میں اُتر آیا جہاں چھت اور آنگن کی برف کا ایک بے ہنگم اور بدنما ٹیلا مکان کی دوسری منزل تک چڑھا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ برف کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ برف جس کی ہموار اور شفاف تہوں کو قدرت نے گالے پر گالا چن کے چڑھایا تھا۔ برف کا یہ حال دیکھ کر اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی ہڈیاں بھی اپنی جگہ سے اکھڑ کر اُس کے گوشت میں ایک جگہ ڈھیر ہو گئی ہیں۔ لیکن برف کے اس میلے ڈھیر میں بھی کھیل تھے۔ اُسے تلسی اور موہن کی خاطر اس ڈھیر پر کئی اور بیلچے چلائے اور انہیں ایک سیڑھی کی شکل میں ڈھال دیا اور جب بچے برف پر چڑھنے، اترنے باہر باہر سے دوسری منزل کی کھڑکی میں کودنے، اُچھلنے پھسلنے میں مصروف ہو گئے، واسدیو موقع پا کر گرم زندگی کی جستجو میں چولھے کی طرف دوڑا۔ اس نے دو کانگڑیاں بھر دیں۔ جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی۔ اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اس نے چیخوں کو ایک بھنبھناہٹ میں دبایا جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھنورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ پھر اس نے بھنبھناہٹ کو اور تیز کیا اپنے دانتوں کو رہا کر کے خوب بجایا اور تلسی، موہن کو اور ہنسایا۔ لیکن کئی آہنی ہاتھ اس کی ہڈیوں کو ڈھونڈھ رہے تھے، اس کی رگ رگ میں چیخ پکار تھی، اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھینچی ہوئی چیخوں کے درمیان اُس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ دور کمانی کو کاغذ لئے لہراتے دیکھا، پہلی بار اُس نے چاہا کہ وہ اکیلا رہے، چیخے روئے اور وہ ہنستے ہوئے دونوں آنگن میں چلے جائیں۔ جہاں پڑوس کے اور بچے جمع ہو گئے تھے، تلسی اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آرہے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اس سے بڑے بڑے

تھے، وہ خود برف تیز تیز اٹھا سکتے تھے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ درد دوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور تلسی کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے تہہ خانوں سے ایک ابال اٹھا، جس نے اس کی ہڈی ہڈی کو لپیٹ لیا اور وہ اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں اپنے آپ کو کانگڑی سے الگ کیا۔ لوئی اتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔ تلسی دھڑا دھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ٹوٹنے لگی۔ گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ، واسدیو گولے بناتا گیا اور چلاتا گیا:۔ "وہ مارا یہ مارا، مارا، مارا" واسدیو جی بھر کے چلایا اور تلسی نے جی بھر کے گولے برسائے۔

پھر اس برفوں کے گرم دن پر بھی رات چھا گئی۔ تلسی، موہن اور واسدیو خاندانی لحاف میں گھس گئے۔ واسدیو نے ان دونوں کو گرمی کی تلاش میں بھینچ لیا۔ اس کی سنگین ہمت جواب دے رہی تھی۔ درد سے زیادہ شدت کا اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل آئے اور تلسی موہن گھبرا نہ جائیں ــــ "کاکا کہانی" تلسی نے اس کے سینے پر اپنا سر رکھا اور فرمائش کی۔ لیکن اس رات کی کہانی گم ہو چکی تھی۔ واسدیو کی زبان بس "ہائے" کر سکتی تھی اور چونکہ اس کی زبان اور اس کے ہونٹ مدت سے ٹیڑھے ہلتے رہے تھے۔ اس وقت بھی اس کی ہائے عجیب عجیب سروں میں نکلتی چلی وہ ہائے کرتا اور اس کا منہ کبھی سُر ہائے بنتا، کبھی پی پی۔ ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں اس کی صورت اس کی آواز سے بھی عجیب دکھائی دیتی تھی۔ تلسی اور موہن سر اٹھا اٹھا کر ہنستے گئے۔ وہ ہائے پر ہائے کرتا گیا اور بچے ہنستے گئے۔ اس کا عضو عضو ٹوٹتا گیا حتیٰ کہ اس کے ہنسانے کے ارادے بھی ٹوٹ گئے۔ پھر اس کی سر ہائے اور پی پی بھی ٹوٹ گئی۔ اس نے ہڈیوں پر موت کو رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کراہنے لگا۔ رونے لگا اور تلسی موہن دونوں ہنستے ہی گئے۔ اس رات کی طرح وہ کبھی ہنسے نہ تھے۔ واسدیو کا ناٹک بھی تو اس دن اتنا اچھا تھا۔ وہ ہنستے گئے۔ ہنستے گئے اور جب واسدیو کی آنکھیں دیئے کو بھی نہ دیکھ سکیں اور اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سنجیدہ سروں میں انہیں بتا دے کہ یہ سب کچھ سچ ہے اس کی زبان نے اس کا پورا ساتھ نہ دیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور ان کی ہنسی تیز ہوتی گئی۔

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شاید وہ اسی دیئے کو کھوج رہا تھا۔

شاید اُس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا...... اس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی اور موہن اس وقت دیکھ لیتے شاید وہ بھی ڈر جاتے لیکن بی نیند آ گئی اور انہیں اس بھیانک ماحول سے اُٹھا لے گئی۔

دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ کاکا لحاف میں نہیں تھا۔ اُس نے سوچا کہ چشمے پر سما مار دھونے گیا ہوگا۔ پھر موہن بھی جاگ اٹھا اور دونوں لحاف میں چور کو توال کھیلتے ہوئے لحاف سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے ــــــ چشمے پر کاکا کہاں گیا تھا۔ وہ تو وہیں پڑا ہوا تھا۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے۔ اُس کے سینے پر چڑھے، انہوں نے اس کے منھ کو ہلایا، اس کا نیا رنگ، منھ کے نئے گراؤ ایک نئے جانور کے جیسے تھے، ہنسیوں کی نئی اُکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے، جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل ہوئی اور تلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویئے درست نہیں کئے۔ باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی روٹھ گئی۔ وہ بھی رونے لگی ــــــ "کاکا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کانگڑی کی آگ بجھ گئی ہے" لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں بھی حیرت پیدا ہو گئی۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں اور وہ ڈرنے لگی۔

"نہیں نہیں کاکا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔ تم اماں مت بنو کاکا۔ اماں مت بنو۔ اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کاکا۔ اماں مت بنو کاکا......"

کھڑکی

اس کھڑکی میں ایک نہیں دس باتیں تھیں جو کانتا جی کو کھینچ لیتی تھیں۔ پہلی بات تو خیر یہی تھی کہ یہاں دو منٹ ٹک جانے کو جگہ تھی ذرا دم لینے کو۔ اماں جی آواز دیتیں نہ کھڑا ہونا برا لگتا نہ دیر لگتی۔ فرش پر کہیں گھٹنے جوڑ کر بیٹھنے سے یہی اچھا تھا کہ اپنی ٹانگیں لٹکی رہیں اور کمر بھی ٹکی رہے۔ پھر چاہے اوپر آسمان کی طرف دیکھو چاہے نیچے زمین کی طرف، یا یونہی پڑے کانوں کو کھوجتے رہو۔ اپنے من میں جس بات کا خیال آجائے اس کو بلا جھجک آنے دو ــــ اس جگہ کوئی ایسا تھا ہی نہیں اوپر آسمان میں نہ نیچے زمین پر، جو سامنے بیٹھا بیٹھا پپوٹوں یا ہونٹوں کی چھوٹی سی حرکت کو دیکھے اور من کی چوری کو پکڑ لے۔ یہاں تو اپنے منھ سے کوئی لفظ بھی نکلے۔ تار پر بیٹھی چڑیا ہوگی، چی چی کر کے بھاگ اڑے گی۔ نہ اپنا مطلب اس کی سمجھ میں، نہ اس کی بولی اپنے پلے میں، اندر اندر سینے میں جو اٹک گیا ہے اُسے کھڑکی

پر آکر نکال دو۔ اتنی سی چڑیا ہی بھرے بوجھ کو لے جائے گی۔

کانتا جی کی کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی سڑک تھی۔ مری مری بیمار سی سڑک، جس کے روڑے کہیں کہیں ایسے اُکھڑے ہوئے تھے جیسے یہ بھی کسی کے سینے کی ہڈیاں ہوں۔ اسی وجہ سے کانتا جی اپنی نظر کو کھڑکی سے یوں اچھالتی کہ سڑک کو چھوتی بھی نہیں اور ایک آن میں سڑک کے ساتھ لگی ہوئی کھلی زمین پر آجاتی اور پھر زمین کے اُس ٹکڑے کی لمبائی چوڑائی کو ناپنے لگتی۔ ویسے تو وہاں بہت کچھ تھا جسے گھنٹوں دیکھا جاسکتا تھا لیکن کانتا جی کے پاس گھنٹے کہاں کچھ لمحے ہی ہوتے تھے۔

کسی لمحے اس کے دماغ میں یہ خیال آتا کہ کھونٹے سے بندھی ہوئی بھینسیں سوکھتی نہیں ہیں، صبح و شام دونوں وقت دودھ کی بھری بالٹیاں دیتی ہیں۔ کسی لمحے پھر اُسے یہ خیال آتا کہ بھینسوں کو یونہی بغیر کام کاج کے کھانا ملتا ہے، بغیر کسی محنت کے خدمت ملتی ہے۔ دودھ یونہی نہیں دیتیں۔ زمین کا وہ ٹکڑا ایک بڑا آنگن سا تھا جہاں کئی بھینسیں تھیں، بھینسوں کے کالے کالے بچے تھے۔ لکڑی کی لمبی لمبی ناندیں تھیں، کھونٹے تھے اور ایک طرف کچھ چھپر تھے جن کے نیچے کئی گھوسیوں کی الٹوائی کھٹوائی بکھری رہتی۔

کسی لمحے جب وہ رسوئی چھوڑ کر کوئلے کی دھک اور پھیلتے دھوئیں سے بھاگ آتی اور کھڑکی پر سانس لیتی تو ہوا میں وہ ایک ایسی ملاوٹ پاتی جو سینکڑوں میل کیا من کے ناپوں میں اسے کروڑوں میل دور لے جاتی۔ نہ معلوم چھپر کے نیچے سے جلتے تمباکو کی بُو اس کی کھڑکی تک کیسے پہونچی ہوئی ہوتی، جو اس کے آتے ہی اس کی ناک میں گھس جاتی اور ایک بار پھر مہورانی کانتا جی کو نیچے گوبر پر بٹھا دیتی اور چھپی دبی کانتا کو جگا دیتی، نری کانتا کو، جو دلی بھر کی تمام اینٹوں کو ایک چھلانگ میں پیچھے چھوڑتی سوکھے میدانوں کے سینکڑوں میل طے کرتی اپنے پیارے پہاڑوں کو چوم کر گہرے نیلے آسمان سے اترتی، اپنے من کے پرانے ٹھکانے پر بہتی وِتستا کے کنارے اپنی ماں سے روٹھنے، اپنے بھائی سے جھگڑنے اور اپنے ابا کے

حقّے میں پانی بھرنے ــــــ!

پھر اندر سے ڑہی ساس کی آواز سنائی دیتی اور نہ جانے کھڑکی کی سلاخوں پر اس سیدھی سی آواز کو کیا ہو جاتا، کہ ایک آواز میں لاکھوں سنپولیے گھس جاتیں اور نیلا آسمان مٹیالا نظر آتا اور زمین کانپ اٹھتی۔ اور کانتا پرکھ جاتی پھر وتستا دکھائی دیتی نہ بیچ کے پہاڑ، ایک ہی لمحے میں، بیچاری کانتا موٹے موٹے گوبر کے لوندوں میں لت پت ہو جاتی اور کیچڑ کے گہرے گڑھوں میں جا گرتی اور کانتا جی سر پر پلہ سنبھالتی ہوئی کھڑکی سے اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔

اندر کے وہی پتھر کے کوئلے کا دھواں ہوتا جس نے کشمیر سے آئی ہوئی دلہن کانتا جی کا دہلی میں پہلا استقبال کیا تھا۔ نئی زندگی کے اس سنئے دھوئیں کو وہ تب کیا سمجھتی؟ دھوئیں سے پہلے وہ ایک ایک لکڑی کو خوشبو سے پہچان لیتی۔ بُدلو، "بید" "کائرو" "ہتب" "دیودار" ایک ایک لکڑی جنگل کی مستی سے اپنی اپنی لہر لے کے آتی تھی۔ پھر وہ دھواں سنہری لپٹوں کے اوپر پیچدار لکیریں بناتا، نہ جانے کن پریوں کی سیڑھی بناتا اوپر ہی اوپر چلا جاتا، اور یہ جلے بھنے پتھر کا دھواں اپنی کڑواہٹ اور دھک کولے کر سینے سے نیچے بھی چلا جاتا اور اندر اندر ہی پھیل جاتا۔ دہلی میں پتھر کا بھی ایسا کالا کوئلہ ہو جاتا ہے، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اور اس دھوئیں سے بھاگ کر جب کانتا جی اسی کھڑکی پر چار سال پیچھے کا سفر کرتی تو ایک بار اس کے سینے کی کھوکھلاہٹ بھر جاتی ــــ "دہلی سے دولہا آیا رے" چڑیل سہیلیاں شور مچاتیں اور وہ بھی پھولی نہ سماتی۔ بڑی بات تھی کہ لڑکا بھی دہلی میں کام کرتا ہو اور لڑکے کا باپ بھی۔ لڑکا کمائے تو اپنے لئے اور باپ کمائے تو لڑکے کے لیے۔ تیسرا کوئی تھا نہیں۔ کانتا جی تو راج کرنے آئی تھی راج۔

پھر جب راجدھانی سے کانتا لوٹی تھی اس کے اپنے ماں باپ نے بھی اس کا رونا نہیں سمجھا تھا۔ وہی جو اس کے خوابوں کے معمار تھے اس کے خوف کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے اس کے لئے نئے زیور بنائے۔ اس کے دولہے کے لیے کپڑے بنائے اور اس کی ساس کے لیے

قیمتی تحفے سجائے اور اس کو واپس وہیں بھیج دیا۔

کھڑکی پر بیٹھے بیٹھے کانتا کے سر میں لاتعداد پہیے سے گھومنے لگتے اور میکے سے سسرال تک کا ایک بھیانک سفر شروع ہو جاتا۔ اسی وقت نیچے بھینس پر ہزاروں مکھیاں چمٹ جاتیں اور کانتا کو لگتا کہ یہی مکھیاں روپ بدل گئیں، انسان بن گئیں اور پہیوں کو ڈھکیلنے لگیں۔ انہیں خوفناک مکھیوں کے بیچ میں کانتا اپنے ماں باپ کو بھی پھنسا ہوا دیکھتی اور ڈھکیلتے ہوئے ہاتھوں میں ان کے ہاتھ بھی دیکھتی ــــ گھوسی بھینس پر لاٹھی مارتا، مکھیاں بھنبھنا کر اڑنے لگتیں اور اندر ساس کی آواز گونجتی اور کانتا کا سفر پورا ہو جاتا۔

ساس ــ! کانتا کے گھر والے کی ماں۔ کانتا کے ماں باپ کی سمدھن۔ اس کے اپنے سانس سانس کی مالکن ــ! ساس، جس کے قبضے میں گھر کے دونوں مرد تھے۔ ایک جو کانتا کا سسر تھا اور ایک جو اس کا اپنا گھر والا تھا۔ ساس ــــ سماج کی عدالت میں جس کا ایک رتبہ تھا۔ جس کا منہ کھل جائے تو کانتا کو اسی کھڑکی سے نیچے پھینکا جائے اور اس قابل بھی نہ رکھا جائے کہ اس کے ماں باپ آکر اسے اٹھا کے لے جائیں۔ اس ساس کا جھوٹ کیا ہے؟ اس ساس کا سچ کیا ہے؟ کانتا کے لئے سوچنا بھی منع تھا۔ لیکن وہی ایک چوکھٹ تھی اسی کھڑکی کی، جہاں سب قانون ٹوٹ جاتے جہاں کانتا کے خیال جیسے چاہتے ویسے بنتے، ویسے بگڑتے۔

کھڑکی کے باہر بھینس بھی اچھی تھی۔ لیکن کھڑکی کے اندر جو ساس تھی ــــ خیر اڑوس پڑوس سے پوچھو برادری کے لوگوں سے پوچھو تو یہی کہیں گے کہ ایسی اچھی کھڑکی والا مکان بنا ہی نہ ہوتا اگر وہی اندر بیٹھی اماں جی نہ ہوتیں۔

دہلی کی گھٹن میں کانتا کا سینہ دکھنے تو لگا تھا لیکن اماں جی کے دماغ میں مکان کا خیال نہ آیا تو کانتا کو رہنے کے لئے یہ کھلا مکان کہاں ملتا! وہی تھیں کہ انہوں نے علاج طے کر لیا اور شہر کے تنگ مکان سے اور کرایے کے ڈیڑھ کمرے سے صرف کانتا جی کے لیے بھاگنے کی ٹھانی اور ایک اپنے مکان کا انتظام کیا۔ مکان ویسے بھی کس لیے بنا تھا؟ کانتا نہیں تو اور

کس کے لیے ؟ اس کا نہ کوئی جیٹھ تھا نہ دیور۔ اور جب ساس کو اُسی ایک کی فکر تھی۔ کانتا کا باپ اپنی بچی کے پیار اور اپنے بڑے نام کو کیسے بنائے رکھتا اگر وہ کم سے کم مکان کے خرچے کی آدھی رقم بھی نہ دیتا۔

خیر بیٹی کو کون نہیں دیتا ؟ یہ کہو کہ لڑکا مزاج سے خاموش تھا۔ رنگیلا نہیں تھا، شوقین نہیں تھا، ہوتا تو بدیس جانے کی سوچتا اور سسر کو بڑی ٹریننگ کا خرچہ اٹھانا پڑتا۔ اپنی برادری کا دستور یہی تھا کہ داماد کو ٹریننگ کا خرچہ دیا جائے۔ مکان کی رقم ایسے خرچے کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی اور کھڑکی پر سوچتی ہوئی کانتا کو اپنے باپ کی بچت پر نا معلوم خوشی کیوں نہ ہوتی۔ الٹا افسوس ہوتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں۔ جنہیں بدیس کی ٹریننگ کا شوق ہی نہیں۔

لیکن اسی مکان کی دیواروں میں اینٹوں کی ترتیب کیسی تھی کہ کانتا جی کو سب کی سب اینٹ اپنی ٹڈیوں پر ہی گرتی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک وہی کھڑکی سیدھی تھی اور اندر دیواروں پر سجی ہوئی تصویروں سے اچھی وہی باہر کی کیچڑ۔ کانتا چڑیا کو کہتی کہ مکان کے اندر دس خانے ہیں جن میں ان کے پنکھ بھی نہیں چل سکتے۔ جن میں دس طرح کے دباؤ ہیں۔ وہ کہتی کہ اندر اندر ہو کے دس نام ہیں جو دبی دبی آواز میں غصے اور نفرت کو دہراتے ہیں کہ باہر باہر میٹھی آواز میں "کانتا جی" کا پورا نام دھلا دھلایا سفید چہرہ، ٹیڑھی مانگ اور اُلٹا پلّہ، ایک سیدھی اور میٹھی زندگی کا اشتہار ہے۔ وہ کہتی کہ مکان کی دیواریں گونگی ہیں۔ جن میں دو سر چنے ہوئے سے لگتے ہیں۔ لیکن دیواروں کی یہی اینٹیں سانپوں کی زبانیں نکالتی ہیں۔ جس وقت وہ ایک عورت بولنے لگتی ہے۔ اس عورت کے لئے مکان کے اندر ایک کام بھی نہیں ہے۔ لیکن کانتا کے سینکڑوں کاموں پر نگاہ رکھنا ہے۔ اس کے سامنے کانتا ایک بھی ایسی سانس نہیں لے سکتی جس کو وہ نہ سنے اور سن کر اسے بربادی کا سبب نہ بتائے۔

مکان ـــــ ؟ کانتا کے لیے اس مکان میں دن کے پنجے رات کے اندھیرے سے زیادہ خوفناک تھے جب کانتا کا جسم پسینوں میں پگھلتا رہتا اور اندر اندر دل کا ایک بوندا

بن جاتا ــــ رات کی لپیٹ میں اُسے مکان کا ہوش رہتا نہ مکان والوں کا۔ اور موئی زندگی میں اُسے نہ سپنے یاد رہتے نہ ٹوٹی ہوئی نیند کے ٹکڑے۔ نیند نیند میں کبھی اُسے بھرے ہوئے بھینے کا احساس ہوتا تو ساتھ اسے گھوسی کی لاٹھی بھی سنائی دیتی اور وہ اٹھ کر یونہی کھڑکی پر چلی آتی۔ نیچے کچھ نہ دیکھ کر پرے مکانوں کی طرف نظر اٹھاتی۔ تاروں کی چھاؤں میں اسے کسی کمرے کی بتی مسکراتی دکھائی دیتی۔ ایک سایہ دوسرے کے ساتھ کھیلتا ہوا سا دکھائی دیتا۔ پر آنکھ جھپکتے ہی وہ بتی بجھ جاتی اور وہ پھر اپنے بستر پر گر جاتی۔

کھڑکی پر کھڑے کھڑے کانتا دنیا بھر کی باتیں دیکھتی۔ چاروں طرف ایک نئی زندگی کو محسوس کرتی۔ صبح دیکھتی کہ ایک نئی بہو آئی ہے۔ شام کو دیکھتی کہ وہی اپنا گھر بسانے نکلی ہے۔ اپنی تمنائیں پوری کرنے کو چھپائی ہوئی تصویروں میں رنگ بھرنے کو اور من بہائے جھولے میں پینگیں لینے کو ــــ اور یہاں؟ یہاں تو بڑے شہر کے بیچ میں وہ بھی تھی جو سینکڑوں میل دور کے رسم ورواج پرانے وقتوں کے بندھن، سسرال والوں کے حقوق، میکے والوں کے فرائض، ساس کیلئے تہواروں کے تحفے، مالک کی ملکیت اور اپنی غلامی میں گھل رہی تھی۔ کاش ماں باپ نے اس سے کبھی لاڈ کیا ہی نہ ہوتا، کاش ماں باپ نے اُسے احساس کی مصیبت سے بچائے رکھا ہوتا، کاش اس نے پڑھا لکھا نہ ہوتا ــــ پڑھائی ــــ؟ اس کی پڑھائی بھی ادھوری تھی۔ نہیں تو وہ رسیاں نہ توڑتی، میکے سسرال کے چکر سے پھاند نہ نکلتی۔ سماج کی ان گنت مکھیوں کو ایک جھٹکے سے ہٹا نہ دیتی۔

لیکن یہ سب چکر کھڑکی کی ہوا کا تھا۔ نہیں تو جان پہچان کے لوگ یہی جانتے تھے کہ کانتا کی ساس نے کانتا کی ہر ضرورت کو سمجھنا اپنا فرض مان لیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ کانتا کی ساس اور اس کے ماں باپ میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ جس ضرورت کی سمجھ ساس کے دماغ میں آجاتی اس بات کو کانتا کے ماں باپ فوراً بھانپ لیتے اور کانتا کی وہ ضرورت پوری کرتے۔ انہیں بھلا کوئی کیسے روکتا؟ کانتا الجھ کر اپنی جاتی نہیں تھی کیا؟

اماں جی نے بہو کا دل بہلانے کے لیے ایک گراموفون کی ضرورت سمجھی۔ ریکارڈوں سمیت پیش کیا گیا۔ لیکن کانتا کے اپنے توے پر اس وقت روٹیاں جلنے لگتیں۔ ڈھلتے کپڑے کی جگہ سوٹے کی چوٹ اس کے اپنے ہاتھ پر پڑتی' برتن کی راکھ اپنے ناخن پر چبھتی' یا یونہی چیز اٹھاتے نس کھچ جاتی' جب اماں جی اسی کے کام کاج کو دلچسپ بنانے کے لیے' اسی کا دل بہلانے کے لئے'' اسی کے گراموفون پر ریکارڈ چلاتیں۔

کھائی ہوئی چوٹ کو سہلانے بھی وہ وہیں آتی' اسی اپنی کھڑکی پر اور اماں جی کو بتاتی بھی نہیں' جب تک کہ اس کی ایک آدھ ہچکی اونچی نہ نکلتی اور اس کی چوری پکڑی نہ جاتی'

باپ کے بھیجے ہوئے جیب خرچ سے ہی سہی' اماں جی کیا اپنی بہو کو پکچر دکھانے نہیں لے جاتی تھیں! لیکن اندھیرا ہوتے ہی جب پردہ سیمیں پر ایک کہانی گھومنے لگتی۔ نہ جانے کانتا جی کو کیا ہو جاتا۔ آنسوؤں کی جھڑی لگاتی اور جب ہیرو ہیروین کا بیاہ بھی ہو جاتا کانتا پھر بھی آنسوؤں کو نہ روکتی۔

سب جانتے تھے کہ اگر اماں جی کا دل بڑا نہ ہوتا انہیں بہو سے پیار نہ ہوتا' وہ ان سب باتوں کو کیسے برداشت کرتیں۔ اور کوئی ہوتی تو وہ یہ نہ چاہتی کہ سوکھی سسکتی کانتا جلدی جلدی مر جائے کہ راستہ صاف ہو جائے کہ ایک بار پھر بندن وار لگ جائیں' مہندی والی ایک نئی رات چمک جائے۔ ضیافت سے برادری میں نیا نام ہو جائے اور نئی دلہن کے جہیز سے گھر بھر جائے۔

یہاں تو ساس کو الٹی فکر لگی ہوئی تھی کہ بہو کے ہاتھ پاؤں گرم رہنے لگے ہیں کہ روز شام کو اسے حرارت ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے کہ کہیں یہ معمولی حرارت بخار نہ بن جائے وہ کانتا کو لیٹنے نہیں دیتی تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ موئے بخار کو حرارت کے نرم نام سے پکارنا ہی اچھا ہے۔ نہیں تو یہ روگ لیٹنے والے کو تپ تپا کر گرا دے گا اور پھر لٹا کر ہی لے جائے گا۔ کانتا کی بات کو وہ مانتیں تو کانتا ایک شام کو لیٹ کر پھر کبھی نہ اٹھتی

حیران اڑوس پڑوس کے لوگوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ آج تمہاری بات کل دوسرے کی۔ پھر لوگ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا ہی دیتے ہیں۔ کسی نے اماں جی کا پیار نہیں دیکھا، دلار نہیں دیکھا اور دس باتیں یونہی اڑا دیں اور کانتا جی کے ابا کو دہلی آنا پڑا۔ ان کے آنے سے پہلے ان کا خط آیا تھا۔ کانتا کو خط کی بات تو معلوم نہیں تھی۔ لیکن دو دنوں سے اس کا دل پہلے سے زیادہ دھڑکنے لگا تھا۔ دو دنوں سے اماں جی کئی کام خود کرنے لگی تھیں، دو دنوں سے وہ کانتا کے کپڑوں کی طرف زیادہ دھیان دینے لگی تھیں، دو دنوں سے وہ کہیں کاجل سے کہیں سرمے سے اس کی نوک پلک خود سنوارنے لگی تھیں

پھر اس صبح کو جب گھر کے سامنے ایک ٹیکسی رکی اور کانتا کو اپنی کھڑکی سے اسی مری مری سڑک پر بھی اپنی آنکھوں کو جمانا پڑا، اس کے اکھڑے ہوئے روڑوں پر اسے اپنے پتا جی کھڑے دکھائی دیئے۔ دیکھتے ہی اس کے اپنے سینے کی ہڈیوں میں ایک نئی جان سی لپکی۔ اور وہ سیڑھیوں پر سے دوڑتی چکراتی نیچے آگئی۔

جب بادام کی پوٹلی، سیب کی پیٹیاں اور سب بوری، ڈبے اوپر پہنچائے گئے تو کانتا کے ابا نے کانتا کی سجی سجائی مورتی کو دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے اس کی سانس رک گئی۔ کانتا کے چمکدار پلے کے نیچے اس کی مانگ چوڑی ہو چکی تھی اور اس کی گالوں کی نئی لکیروں میں اس کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ منہ کی پیلاہٹ گہرے پوڈر کے نیچے سے بھی جھانک رہی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے بیٹی کا ہاتھ پکڑا۔ ہتھیلی میں گوشت تھا نہ گرمی۔ انگلیاں ٹھنڈی تھیں اور پتھرائی ہوئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ان آنکھوں میں ایک گیلا گیلا جما ہوا تحیّر تھا۔

کانتا کی ساس کانتا جی کی طبیعت کا حال سنا رہی تھی، ایک میٹھی کہانی سی جس میں پیار تھا، پریت بنی تھی، دیکھ بھال تھی، دعائیں تھیں ــــــ اور جب یہ بتانے لگی کہ کانتا جی کے لئے اب بادام گھسیں گے، سیب کہیں گے۔ کانتا کو نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اپنے ابا کو وہیں چھوڑ کر

اس اپنی کھڑکی پر آ کھڑی ہوئی۔

کھڑکی کی ہوا کا اثر تھا کہ اس کے جمے ہوئے آنسو پگھل گئے اور اس کی رکی ہوئی سسکی پھوٹ نکلی۔ اس کا باپ وہیں اس کے پاس آگیا اور اس سے پہلے کہ ساس پیچھے سے آواز دیتی اور کانتا عادت سے مجبور ہو کر اندر کھچ جاتی، کانتا نے ہچکیاں لے لے کر، اپنے چمکتے ہوئے اور ریشمی پلے کو منہ میں ٹھونس ٹھونس کر اپنی ایک انگلی اٹھائی اور ایک ایسے منظر کی طرف اشارا کیا جو اس کے باپ کے لیے نیا تھا۔ نیچے ایک گھوسی بھینس کے تھنوں کو ہاتھ میں لئے بالٹی بھر رہا تھا۔ دوسرا اسی بھینس کے سامنے اس کے بچے کی بھوس بھری کھال کو ایسے کھڑا کر رہا تھا کہ جیسے بھینس سے کہہ رہا ہو کہ لے یہ رہا تیرا بچہ، جو مرا نہیں ہے۔ بیچاری بھینس اپنے بچے کی اکڑی ہوئی کھال ہی کو چاٹ رہی تھی اور گھوسی اپنی بالٹی بھرتا جا رہا تھا۔

بانکڑی کا ایک ٹکڑا

رکمنی کے چولھے پر آج ایک پتیلے میں یونہی پانی ابل رہا تھا۔ بے مطلب بھاپ اٹھ رہی تھی اور رکمنی سوچ رہی تھی کہ آج یہ پانی بھی ہسپتال نہیں جائیگا۔ بھاپ کی پھولی پھولی دھاریوں میں اسے ایل کاشی ناتھ گرے گرے ہاتھ پیر دکھائی دے رہے تھے اور بیٹھے بیٹھے اسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ خود اس کی اپنی زبان کھو سی گئی ہے، تالو سوکھنے لگا ہے۔ گلے میں گانٹھ سی پڑ گئی ہے اور پیٹ کا بوجھ یونہی بڑھ گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر ٹھنڈے پانی کا ایک۔ گلاس پی لیا اور چولھے کے سامنے پھر آکر بیٹھ گئی۔

رکمنی کسی سے کچھ پوچھتی نہیں تھی۔ اسکے سوالوں کا جواب کون دیتا؟ سوال گلے تک اٹھتا بھی ایک سوکھے گھونٹ میں واپس اتر تا۔ لیکن جس دن ہسپتال سے ایل کاشی ناتھ کے لئے کھچڑی منگائی گئی تھی اسکا سوال منہ تک آگیا تھا اور اسے اپنی روٹی کے ساتھ اسے بھی چبانا پڑا تھا۔ السائے ہوئے دانتوں میں اپنی روٹی سخت سی معلوم ہوئی تھی اس لئے اس نے اٹھکر کھچڑی کو کچھ زیادہ نرم بنا دیا تھا۔

اگر واقعی ایل کاشی ناتھ کی حالت اس حد تک خراب ہو چکی ہے، رکمنی کے دل میں خیال آیا، تو

بات نہ معلوم کس حد تک بگڑ جائیگی اور نہ معلوم کون سی نئی مصیبتیں پیدا ہو جائیں گی جن کو وہ سمجھ بھی نہ سکے'
اپنی کمر میں باندھ نہ سکے۔

لیکن اس وقت رکمنی کے گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ گھر کا نوکر تک ہسپتال چلا گیا تھا۔ باہر کا کواڑ بند کر کے وہ اپنی رسوئی میں' اپنے چولھے کے ساتھ جو جی چاہے بات کر سکتی تھی۔ دہکتے انگاروں پر جس تصویر کو جی چاہے رکھ کر دیکھ سکتی تھی۔ آج سالن کے جل جانے کا ڈر تھا نہ دودھ میں ابال کا۔ چولھے پر ایک پتیلے میں پانی تھا اور ایک دیگچی میں دال۔ دال لگ بھی جاتی غم نہیں تھا' بلکہ لگ جاتی تو ٹھیک تھا۔ کیونکہ ابل کاشی ناتھ کی بگڑی حالت میں وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ جلنے کی بو کس کس کو آجائے۔ ویسے تو کس مرے کی ناک تیز نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ بہانے بنا کر وہ آتے ہی اور چیزوں کا بھی انتظام کرینگے کہ کوئی کہے گا: غم سے کلیجہ جل رہا ہے' دہی منگا دو" ــــ کوئی کہے گا: "جگر کٹ رہا ہے مربہ دلا دو۔" ــــ کوئی کہے گا: "ہائے رے حلق سے روٹی نہیں اترتی' آچار ہی دے دو۔" روٹی کے ساتھ پانچ پانچ چیزوں کا چسکا تھا' لگی ہوئی دال کے ساتھ کیا کھاتے؟ یہ رکمنی ہی تھی جس کیلئے دال کا پورا کٹورا بھی نہیں بچتا تھا۔

سبزی بھاجی کے علاوہ چٹنی کا چمچ' آدھ پون کٹورا دہی نوکر کے لیے بھی بچانا پڑتا تھا۔ نہیں تو جس دن وہ بھاگ جاتا' نوکری چھوڑ کر چلا جاتا' اس دن سب کے سب اسی بات کو یاد کرنے بیٹھتے کہ کس شام کو وہ روٹھ گیا تھا۔ جب اسے روکھا ملا تھا' اور کس شام کو وہ جواب دے کر چلا گیا تھا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے کسی کی ناک اوپر کو اٹھتی' کوئی بھویں سکیڑتا' کوئی دکھا دکھا کر کھسر پسر کرتا' اور جب کوئی اونچا اونچا سنا بھی دیتا' رکمنی کی دونوں کنپٹوں میں آنچ سی سلگ اٹھتی اور وہیں دودھ کی دو پتلیاں سی ابلنے لگتیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ گرم گرم دھار آنکھوں میں اتر آتی' رکمنی کی ناک سے دھواں سا اٹھتا اور وہ دھوئیں دھوئیں میں ایک چھوٹا سا خواب دیکھنے لگتی کہ ابل' کاشی ناتھ نے نوکر کی خاطر ہی اسے اپنی پیشی میں بلایا ہے اور اسے جی بھر کر گالیاں دے رہے ہیں ــــ اسکا نام لے کر۔

لیکن نوکروں کے بھاگ جانے کی بات کے علاوہ سال بھر میں سو اور باتیں ہو جاتیں' ابل کاشی ناتھ

ایک بات بھی ایسی نہ کرتا جس میں رکمنی کا نام آجاتا۔ نوکر و کر کی بات تو فوراً ہی ختم ہو جاتی۔ کیونکہ ایل، کاشی ناتھ کے دس انتظام تھے، منشی تھے مستری تھے، کلرک اور چوکیدار تھے۔ ایک ٹیلیفون ادھر ہو جاتا ایک ادھر، دس نوکر پھاٹک پر کھڑے ہو جاتے اور کم بخت سالن بھی جل جاتا، دودھ بھی گر جاتا، آنکھ جھپکتے ہی بنی بنائی چیز حاضر ہو جاتی، دن کی کڑکتی ہوئی دھوپ ہو یا رات کا گھپ اندھیرا بس جیب میں سے ہلکے سے ایک نوٹ کے نکلنے کی دیر تھی اور ایل کاشی ناتھ کے انتظام میں ایسی دیر کبھی نہیں ہوتی تھی۔ رکمنی کے دل میں اسی بات کا گہرا روگ تھا کہ اس نے برسوں انتظار کیا لیکن گھر میں کوئی بات اتنی بگڑی نہیں، جس سے ایک بھونچال سا آجاتا، ایک آگ سی لگ جاتی، دیوان خانہ، مہمان خانہ، دہلیز رسوئی ایک ہو جاتے۔ بیچ کی زمین پھٹ جاتی اور وہ ایل کاشی ناتھ کے روبرو کھڑی ہو جاتی، چاہے ساری دنیا اسی ایک کو بھونچال کا دوش دیتی۔

مگر ایل، کاشی ناتھ ایل کاشی ناتھ تھا ان کے نام میں وزن اتنا کہ خود بھونچال بھی رک جاتا۔ دیوار پر لٹکا ہوا کیلنڈر تھا، رکمنی اس پر بھی اسی نام کے ہجے نکالنے بیٹھتی۔ فرش پر بکھرے ہوئے پرچوں کو اٹھاتی، ان پر بھی وہی ہجے پاتی۔ رسوئی میں چائے اٹھاتی تو اس پر بھی وہی نام کھدا ہوا پاتی۔ ساری دنیا میں اسی نام کا چھاپ تھا اور یہ نام رکمنی کے دماغ میں اتنا بھاری بیٹھ گیا تھا کہ اسکے اندر یہ ننھی سی یاد ابھرنے نہ پاتی کہ خود رکمنی ایل کاشی ناتھ کی بیوی تھی۔

نہ معلوم یہی یاد آج ان انگاروں پر کیوں چمک اٹھی۔ اور یہیں آگ پر آتے ہی ایل کاشی ناتھ کی صورت بدل گئی ۔۔۔ کوڑا کاشی ۔۔۔ بھوکا پیاسا لڑکا، چھیتا چھپٹتا، کچے پکے پر ہاتھ مارتا ۔۔۔ جب دیکھو منہ بھرا ہوا ہے، جب دیکھو دانت چل رہے ہیں ۔۔۔ نہ حیا نہ شرم ۔۔۔ ہنستا ہے تو تھالیاں سی گرنے لگتی ہیں۔ اچھلتا ہے تو کچھ نہ کچھ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے ۔۔۔ کچھ اور نہ ملے یونہی دیوار کو مکے مارتا جا رہا ہے ۔۔۔ پردہ کرتی ہوئی رکمنی کے ہاتھ سے بھی چھین کر کھا لیتا تھا تو رکمنی کی ساس اسے کوسنے دیتی تھی۔ رکمنی بھی تو ان دنوں چھوٹی تھی۔ چھوٹی دلہن کے ناک نقش کو اتنا کون دیکھتا ہے؟ اور ویسے تو رکمنی میں کس بات کی کمی تھی؟ رام بچائے، اندھی نہیں تھی،

کانی نہیں تھی، قد کی چھوٹی یا بدن کی موٹی نہیں تھی۔ پھر اپنا رنگ بھی صاف تھا اور تب تو تمیز کی بات یہی تھی کہ ڈھکی دبی رہو اور غیروں کی بات کیا اپنوں سے بھی پردہ کرو ـــــ ان دنوں رکمنی کو کسی نے بدتمیز نہیں پکارا تھا، نہ بدصورت نہ بدشگون۔

ـــــ پھر جب شیلا ہوئی تھی، بڑے لالہ نے کتنا بڑا دن منایا تھا۔ لڑکی ہوئی تھی تو کیا ہوا۔ کہتے تھے کہ لکشمی آ گئی اور لے کے آ بھی گئی تھی لکشمی۔ شیلا کے ہوتے ہی اتنی بڑی حویلی چڑھی تھی۔ ـــــ لیکن یہ کم بخت حویلی ہی منحوس تھی۔ یہی حویلی لے گئی ـــــ اسکی اونچی دیواروں کو، دس ہیر پھیر تھے۔ اسمیں، دس اندر خانے تھے۔ ادا اسی میں وہ رسوئی بھی تھی، رسوئی کے ساتھ والا بڑا کمرہ تھا، جہاں اہل۔ کاشی ناتھ کی سگی نہیں، چچیرے بھائی بھتیجے اور بھتیجیاں کھانے کے لئے سب جمع ہو جاتے اور اسی کمرے کے کونے پر ایک اور چھوٹا کمرہ تھا۔ جس میں رکمنی کی کھاٹ تھی اور اسکے دو صندوق تھے۔ ادھر کا صحن چھوٹا تھا اور اس میں لکڑی اور کوئلہ پڑا رہتا تھا۔ اور پھر دیواریں اتنی اونچی تھیں کہ اگر رکمنی گلی کی بات کو بھی دیکھنا چاہتی اسے اپنے دھوئیں کے ساتھ اوپر جانا پڑتا اور چمنی سے سر نکالنا پڑتا ـــــ!

اب تو خیر اسکی عمر وہ تھی کہ جب بھی اسکا جی کرتا تھا گلی کے شوالے تک چلی جاتی تھی۔ وہ چاہتی تو شہر کی ہر کھلی سڑک سے گھوم آتی اور اسے یہ بھی غم نہ رہتا کہ رسوئی میں جا کے کام کرنا ہے۔ اس سے کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ لیکن اسی بات کا اسے ڈر تھا کہ اگر وہ ایک ناغہ بھی کر گئی تو اس کی رسوئی میں بھی کچھ نہ کچھ ہو جائیگا اور اسی راستے میں جو اسکے چھوٹے کمرے سے لیکر بڑے کمرے کے بیچوں بیچ، رسوئی کے چولہے تک اس کے لئے کھلا تھا، نہ معلوم اسی راستے میں کیا کیا نئی دیواریں چڑھ آئیں گی۔ اسی لئے وہ رسوئی میں تب بھی کم از کم آکر بیٹھ جاتی، جب اسے زور کا بخار ہو جاتا یا سارے بدن میں درد ہوتا۔

------رکمنی کے چولہے پر حویلی کی دیواریں بھی آ گئیں، لیکن انگاروں پر چمکی نہیں۔ نہ جانے اس وقت چولہے کا دھواں کیوں بڑھ گیا تھا اور دھوئیں میں دیواریں کیا کالے بھوت سے کھڑے

ہو گئے تھے۔ ایل۔ کاشی ناتھ کو گھر سے نکلتے وقت دیکھنے کے لئے رکمنی کو انہیں دیواروں سے باہر گلی میں جانا پڑتا تھا اور جب جب اس نے ایسی ہمت کی تھی نہ جانے اندر اندر کیسے پیر چلنے لگتے تھے اور اندر اندر کیسے ایل۔ کاشی ناتھ ہی غائب ہو گئے تھے۔ پھر رکمنی ایسے ویسے وقت گلی میں جاتی بھی نہیں تھی —— وہ کیوں کسی کا راستہ کاٹتی؟ کیوں کسی پر اپنا سایہ ڈالتی —— ؟

چولہے پر سب کوئلے دہک رہے تھے۔ لیکن ایک نرم نرم ادھ جلا کوئلہ اور انگاروں کے پیچھے ٹپ ٹپ کرتا چینگاریاں چھوڑتا جا رہا تھا۔ رکمنی نے سوچا، یہ کوئلہ بھی کیا کوئلہ ہے پورا چھوٹی بہو ہے —— کم بخت ابھی تک چھوٹی کے نام سے جلتی تھی۔ آتے ہی حویلی کا ستیاناس کیا اس نے۔ نہ گھر رہا پھر نہ گھر والا۔ رکمنی کی مٹی ہو گئی۔ کاش وہ دن آیا ہی نہ ہوتا جس دن چڑیل کی ڈولی اتری تھی گھر میں، جس دن خود رکمنی نے اسکا گھونگھٹ اٹھایا تھا، جس دن اس نے اسے دیورانی نہیں بہو پکارا تھا۔

نرم اور تیز کوئلے میں سے موٹی چینگاری چھوٹ گئی اور سیدھی رکمنی کی مانگ پر آ گری۔

"ہائے! اینلائے تونے مجھے جلا دیا۔"

رکمنی نے کوئلے کے دہکتے ذرے کو اپنی انگلی سے نوچ اٹھایا اور اسے موری میں پھینک کر اس پر تھوکا ——

"جا تیرا ناس ہو جائے —— !"

مانگ کی جلن میں رکمنی کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ چھوٹا کوئلہ اسکے خیالوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے لے کے چمٹا اٹھایا اور اس ادھ جلے کو لال انگاروں کے بیچ میں دبایا۔ عورت تھی کہ ڈائن، آتے ہی رکمنی کے گھر والے کو اپنی انٹی میں باندھ لیا اور باندھ کر اس پر منتر پھونکے۔

باپ کے مرتے ہی کانشی لالہ کاشی ناتھ ہو گیا تھا۔ چمک چاندنی آ گئی تو وہ ایل۔ کاشی ناتھ ہو گیا۔ دماغ تو لے ہی گئی تھی اسکا، سر پر سے اس کی پگڑی بھی اتار دی اسنے۔ پھر کیا کیا رنگ دکھلائے

ایل کاشی ناتھ نے۔ کہ سر کے بال موڑ کر یوں رکھے، وہ کہے یوں نہیں یوں رکھو، گھنٹوں کنگھا لیکر
بالوں کو موڑتا رہا ہے عطر ہے تو یہ لگاؤ، کپڑے ہیں تو یہ پہنو، درزی ہے تو وہ بلاؤ۔ بس اور سب تو عقل
کے اندھے ہو گئے۔ ایک وہی شیانا سن بات بات کے نکتے نکالتی رہی، بات بات کا ناس پیٹتی رہی۔
پھر وہی تھی جس نے دیوان خانہ الگ کر وا دیا، بیٹھک کا کمرہ نیا بنوایا، اِدھر اُدھر دیواریں چڑھوائیں
اُدھر اُدھر دروازے کٹوائے، اور جب رکمنی کی آنکھیں کھلیں، اور پر والا بھگوان بھی اندھا ہو چکا تھا، دیواروں
کے پیچھے دیکھ نہ سکا تھا۔ پھر انہیں دیواروں کے پیچھے کیا کیا کارنامے ہوئے تھے۔ اور ایل۔ کاشی ناتھ
کی مستی کا وہ دن بھی آگیا جب رکمنی کو اس نے پرانی ہنڈیا کی طرح گلی میں پھینک دیا۔

اس دن رکمنی مر گئی تھی۔ پانچ ورش یونہی لاش سی پڑی رہی، دور اپنے ما ئیکے میں۔ اور جب
پانچ برس بعد لوٹی، انہیں دیواروں کے بوجھ سہنے، اسی دھوئیں کے گھونٹ پینے، رسوئی کی چتا میں
اپنے آپ کو جھونکنے، تو صرف ایک شیلا کے مارے صرف ایک بیٹی کے مارے ——

اور آج جب یگ بیت چکے تھے، جب رکمنی کی بیٹی شیلا بھی اسکول بس رکمنی سمجھتی تھی،
جب خود رکمنی کو بھی رکمنی بھول چکی تھی، چولھے کے انگاروں کو نہ جانے کیا ہو گیا۔ پچھلے جنم کی باتوں
کو راکھ ہوئی تصویروں کو پھر سے چمکانے لگے۔

"ماں —— ! دروازے پر دستک کے ساتھ شیلا کی آواز سنائی دی —— "ماں —— !"
رکمنی کے کان یہ کیا سن رہے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں انگاروں سے پوچھا ——
لیکن دروازے پر شیلا کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی —— چولہے کے جادو میں رکمنی
ہل نہ سکی —— سامنے انگاروں پر بھی شیلا دکھائی دی —— "ماں —— !" دروازے کے
باہر شیلا چلائی۔ لیکن انگاروں پر جو شیلا تھی وہ اسکی طرف آنکھ بھی نہیں اٹھا رہی تھی ——
لیکن دروازے کو وہی شیلا پیٹتی جا رہی تھی ——

"ماں —— ماں —— ماں" رکمنی کی سوکھی گھاس کو دیوے کی لو سی چھونے لگی۔ ایک
جھرجھری کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو چولھے کی آگ سے کاٹا اور اٹھکر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی شیلا اپنی ماں سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رکمنی کچھ نہ سمجھتی، یونہی کھڑے کھڑے کھو جاتی۔ لیکن چولھے کے انگاروں نے نہ جانے اسے کیا کر رکھا تھا کہ حویلی کی انہیں دیواروں میں وہ بھی پھوٹ پڑی اور بیٹی کا ساتھ دیکر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ لیکن شیلا نے اپنے آپ کو چھڑا کر نہ جانے کیوں اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دیکھ ماں۔ یہ رونے کا وقت نہیں، ماں جلدی چل! تیار ہو جا۔ چل پتا جی کی حالت بہت خراب ہے ——"

کھوئی کھوئی، رکی ہوئی رکمنی نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا، اور اندر ہی اٹھانا چاہا۔ لیکن اب اندر اندر نہ جانے اسے کیا ہونے لگا۔ جیسے اندر اندر پانی کی پتیلیوں میں راکھ بھرنے لگی ہو، جیسے ہڈیوں کے اوپر بوجھل بھی پتھرانے لگی ہوں۔

"کیا دیکھ رہی ہو ماں۔ ؟ چلو اٹھو۔"

"کہاں ؟"

"ہسپتال"

"میں"

"ہاں ماں تمہاری سخت ضرورت ہے۔"

"حالت خاصی خراب ہے۔" رکمنی نے سوچا۔

"جو کہو سو کروں گی بیٹی، کہو تو سب چولہوں میں آگ بھڑکا دوں، جتنے کہو اتنے گنگال پانی کے گرم کروں۔ تم کہو تو ——" شیلا نے پھر رکمنی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور حویلی کی منحوس دیواروں میں شیلا کی آواز بھولنے لگی۔ یہ کیسا ڈراونا خواب تھا کہ ایل۔ کاشی ناتھ کا حال اس کی کالی حویلی میں، اکیلی رکمنی کو سنا رہی تھی۔ رکمنی کے دماغ میں حویلی کا ایک کنواں بن گیا۔ گہرا گہرا اور اس گہرائی میں سے شیلا کی آواز اٹھی ——

"بس ایک آپریشن کی امید ہے ماں! اور ڈاکٹر تب تک آپریشن نہیں کرے گا۔ جب تک تم دستخط نہیں کرو گی۔"

"کون"؟ رکمنی کیا رکمنی کی کائنات نے پوچھا۔

"جلدی کرو ماں! ڈاکٹر کہتا ہے مریض کی بیوی کو فوراً لاؤ۔ مریض کی بیوی کہاں ہے"؟

یہ کیسی آواز تھی۔ جو کنوئیں میں سے نکل کر حویلی میں گونجنے لگی۔ ایک دیوار نے اسی آواز کو اٹھایا، دوسری سے اسی کی گونج آئی۔

"بیوی"۔ ایل کاشی ناتھ کی بیوی صرف وہی ایک تھی اور کوئی نہیں تھی اینٹ اینٹ کی آواز میں رکمنی کو ایک بھونچال کا احساس ہوا۔ اینٹ اینٹ کے دھماکے میں نہ جانے کون کون رکمنی کے قدموں میں گرتا دکھائی دیا۔ ہلتی زمین اور گرجتی آوازوں میں اس نے دونوں صندوقوں کے ڈھکن اٹھائے ایک آندھی میں کپڑے تھے اتھل پتھل ہو گئے۔ مری مری موتیاں اچھلتی ہوئی باہر آئیں، رکھی پڑی مسی ہوئی ساڑھیاں نکلیں۔ لیکن کسی کے اصلی ریشم پر میل کی تہیں چڑھی تھیں، کسی کے پھوسڑے نکل رہے تھے اور اس آندھی میں وہ سب کی سب ایک طرف گرتی گئیں۔ مگر آج رکمنی کو باہر جانا تھا۔ ایل کاشی ناتھ کی بیوی کو ساڑھی وہ چاہیئے تھی جو ایل کاشی ناتھ کے شایانِ شان ہو۔ اُس نے پھر اسی ڈھیر میں ہاتھ چلائے، ایک ایک ساڑھی کی تہیں کھول دیں، اٹھا کے ایک ایک کو جھاڑا ایک ایک کو دیکھا کم بخت ایک بھی ایسی نہیں تھی کہ اسوقت کام آجائے۔ اور بس تھی تو وہی ایک جسمیں کچھ آب باقی تھی۔ بائیس برس پرانی رکمنی نے بس ایک بار پہنا تھا، جب اس کا لگن تھا، جب اس کے پھیرے ہوئے تھے۔ لیکن بائیس سال کی بھی کیا بات تھی۔ اُس آندھی میں رکمنی سو سال کو بھی ایک جھٹکے سے گرا دیتی۔ نہیں تو لگن کی ساڑھی کو یوں کون پہنتا پھرے۔ لال لال اور لال پر سنہری بانکڑی ——— بانکڑی کو تو خیر اس نے پہلے ہی ادھیڑ پھینکا تھا۔ ذرا سا ایک ٹکڑا ابھی لگا ہوا تھا، رکمنی نے سوچا کسی تہہ میں چھپ جائیگا۔ اُسے ادھیڑنے کا وقت کہاں تھا؟

اور جب رکمنی نے چولھے پر رکھے ہوئے تمام گرم پانی سے اپنے ہاتھ اور اپنے پیر ایسے دھوئے جیسے حویلی کی ایک ایک دیوار کو دھونا تھا اور جب وہ جلدی کے مارے بانکڑی کے اس ٹکڑے کو ساڑھی کی کسی تہہ میں چھپا نہ سکی اور ... میں ... لال رنگ بھی کچھ زیادہ

لال ہوگیا، شیلا کی آنکھوں میں ایک نئی ہمیبی نمودار ہوئی۔

"تو یہ بات ہے۔"

رکمنی نے ہسپتال کے میدان میں مردوں عورتوں کی بھیڑ کو دیکھ کر اپنے آپ سے کہا۔ یہ سب تھے ایل کا نشی ناتھ کے لوگ جو رکمنی اور اس کی لال ساڑھی کو دیکھ کر ٹولیوں میں بٹ گئے۔ عورتیں ایک دوسرے کی بغلوں میں گھس کر باتیں کرنے لگیں۔ مرد ایک دوسرے کو کہنیاں مارنے لگے۔ لیکن رکمنی کی اپنی جائی اس کے آگے آگے جا رہی تھی۔ وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے چل کر آگے بڑھتی گئی۔ اس ساری بھیڑ میں وہی ایل کا نشی ناتھ کی بیوی تھی اور ڈاکٹر اسی ایک کا انتظار کر رہا تھا۔

بھیڑ کے بیچ میں سے شیلا کا چاچا ایک تیر کی مانند باہر نکل آیا اور شیلا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

"اسے گھر واپس لے جاؤ، ڈاکٹر نے آپریشن کر لیا ہے۔"

"کس کے دستخط سے؟"

لگن کی لال ساڑھی میں رکمنی آگے بڑھی اور پوری کھلی آنکھوں سے اپنے جاندار سوال کا جواب طلب کیا۔ شیلا کے چاچا نے رکمنی کے نئے تیور دیکھے، کچھ لمحے حیرانی میں چپ رہا۔ لیکن فوراً ہی اس کی بھووں سے ایسا کالا دھواں اٹھا کہ رکمنی کو آسمان تک آگ لگتی دکھائی دی، اور ایسا ڈر محسوس ہوا کہ ہسپتال کی وہ بڑی عمارت جسکے ایک کونے میں ساری حویلی آجاتی، وہ تمام کے تمام مکان رکمنی کے سر پہ گرنے والے ہیں ـــــ بھیڑ بھر کے سامنے رکمنی کا تماشہ بننے لگا تھا، جب سب کے سب یہ دیکھ رہے تھے کہ وہ اسی اطلاع پر بیہوش ہونے لگی ہے کہ آپریشن اس کے آنے سے پہلے ہی ہوگیا ہے۔

لیکن اسی وقت ایک اور بات ہوگئی۔ کہ ایک نرس نے آواز دی۔

"مریض کی بیوی آگئی۔"

یہ آواز دور بادلوں میں گھوم کر لوٹ آئی اور رکمنی کے دماغ میں بیٹھ گئی۔

"مریض کی بیوی آگئی۔"

بھیڑ کی ٹولیاں لوٹ گئیں۔ کسی نے ہونٹ تک نہیں ہلایا۔ لیکن شیلا نے ماں کا بازو کھینچا۔

نرس نے رکمنی کو پہچان لیا۔ وہ آگے لپکی۔

"بی بی ہمت کا کام کرو۔ چلو اپنے آدمی کے پاس چلو۔"

شیلا کا چاچا آگے لپکا۔ اُس کی بیوی آگے آگئی۔ بھانجے بھتیجیوں کی بھیڑ آگئی۔ لیکن نرس نے اُن سب کو وہیں روکا۔ ماں کے ساتھ شیلا بھی نہ جا سکی۔ اور ہسپتال کے ستھرے برآمدے میں، دوائیوں کی نئی خوشبوئیں، دھسک اور دھوئیں کی ماری ہوئی رکمنی زندہ سی ہونے لگی۔

ہسپتال کے اس کمرے میں رکمنی نے تین بڑے پلنگ دیکھے، تینوں پر لال کمبل تھے اور کمبلوں کے نیچے آدمی سے۔ آدمی تو تھے لیکن رکمنی کا کونسا تھا۔ اسی سوچ میں اس کے قدم دروازے پر رک گئے۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی اور تینوں مریض سو رہے تھے۔ ان کے چہرے بھی تقریباً ڈھکے ہوئے تھے۔ سر کے بال ہی دکھائی دیتے تو رکمنی پہچان لیتی۔ ہاں! کونے پر جو پلنگ تھا۔ اس پر بہت زیادہ سلعا تھا۔ دوائیوں کی کچھ نلیاں سر کے پاس بستر کے اندر چلی گئی تھیں۔ زیادہ سامان والا پلنگ یہی ہوگا ایل' کاشی ناتھ کا۔ اور وہ نرس بھی وہیں رُکی تھی۔ اور سامنے کھڑے ڈاکٹر کے ساتھ کانا پھوسی کرنے لگی تھی۔ پھر ڈاکٹر بھی رکی ہوئی رکمنی کی طرف دیکھنے لگا۔ یونہی کچھ لمحے دیکھتا رہا۔ اور نرس کو کچھ کہکر دوسرے دروازے سے باہر چلا گیا۔ نرس نے رکمنی کو اشارہ کیا اور وہ اسی پلنگ کی دوسری طرف سٹول پر بیٹھ گئی — "یہ کہاں آکر بیٹھ گئی؟" رکمنی کے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ ایل۔ کاشی ناتھ —! جو یہاں سے لیکر وہاں تک تھا، ایسا کیسے ہوگیا؟ کہ پلنگ پر کاٹھ نہیں دکھائی دے رہی تھی اور اتنا بیمار کہ دین دنیا کی خبر نہیں تھی اسے خیال تھا کہ کم سے کم پیچھے کوئی ٹیک لگاکر بیٹھا ہوگا اور اسی کے سامنے ڈاکٹر نے رکمنی کو بلوایا ہوگا اسکے خیال میں اب تک ٹھکانے لگ گئی ہوگی، کہ اب اپنے پرائے کی سمجھ نہیں ہوگی کہ اندر آتی بیوی کو دیکھ لے گا اور پچھتاوے میں آکر لیگا — لیکن اسے خیال آیا کہ آپریشن ابھی ابھی ہوا ہے، ابھی ہوش میں نہیں ہوگا۔ پھر یہ خوفناک سوال دل میں لوٹا کہ یہ جو پڑا ہوا ہے خود ایل۔ کاشی ناتھ ہے کہ اور کوئی —

اسی خاموشی میں دو اور ڈاکٹر آگئے۔ ایک نے جھک کر کمبل کے نیچے سے مریض کا ہاتھ نکالا۔ ایل۔ کاشی ناتھ کا ہاتھ۔ ہاں بھیا۔ بانہہ پر کھدے ہوئے کرشن جی۔ خود کرشن جی کا رنگ تو گہرا ہو گیا تھا لیکن یہ بانہہ کو کیا ہو گیا تھا۔ جو موسلی سی تھی، چمٹا سی رہ گئی۔ رکمنی کا دل دھڑکنے لگا۔ دل کی دھڑکن میں وہ کمرے کی خاموشی سے ڈری نہیں۔ اس طرف کے سٹول کو چھوڑ کر پلنگ کی دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔

ڈاکٹر نے مریض کا ہاتھ دھیرے دھیرے چھوڑ دیا۔ نرس بھی پیچھے ہٹ گئی۔ ایک اور جو پاس کھڑا تھا اس نے دوائی کی نلی کو بستر سے نکالا۔ تینوں چاروں رکمنی کی طرف دیکھنے لگے۔ رکمنی نے اپنی ساڑھی کو سر پر سنبھالا، آگے بڑھی، اور اس نے اپنے آدمی کے منہ پر سے چادر ہٹائی۔۔۔۔

ہسپتال کے ایک کونے سے دوسرے تک ایک چیخ گونجی۔ اندر اندر ہسپتال کے ملازم دوڑے، باہر باہر ایل۔ کاشی ناتھ کے لوگ۔ لیکن رکمنی وہیں پلنگ کے ساتھ چمٹ گئی اور اس نے اپنی ساڑھی کا وہ حصہ اپنے آدمی کے منہ پر ڈال دیا۔ جس پر بانکڑی کا ٹکڑا لگا ہوا تھا۔

ٹرڈی بس

اپنی آگ پر تپلے بادلوں کا ایک ہلکا چھینٹا دلا کر پٹھانکوٹ کی دھوپ کشمیر جانے والے سیاحوں کو تنگ کر رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں سفر کی تھکاوٹ تو تھی، لیکن ان نظروں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ امیدوں میں جو ٹھنڈے رنگوں کی تصویریں ساتھ لے آئے ہیں انہیں ریت پسینے کی کیچڑ لگا رہی ہے اور حقیقت کی اس مار میں صرف بسواس موشائی اپنے یقین کا اظہار کر رہا تھا کہ بس کے چلتے ہی پرے موڑ سے، اودھے اودھے پہاڑوں کی مسیحائی میں بھرے جنگلوں کی مست ہریالی پر، برف کے حاشیوں سے جنت کی اجلی اجلی ٹھنڈک اٹھنے لگے گی۔

اس کے سر پر بھی دھوپ کا ابال تھا، لیکن افق پر پہاڑ تھے۔ موشا ئی اپنے یقین سے کیوں ٹلتے؟ وہ پہاڑوں کی نظروں میں دھوپ کی شدت کو نہیں سمجھے۔ انہوں نے اسے ناگہانی پکارا اور بار بار اپنے نقشے کو کھول کر کشمیر اور کشمیر کی روشنائی کے ساتھ ساتھ پٹھانکوٹ کو دکھاتے رہے۔

"وہ رہا پہاڑ، بوڑا بوڑا پہاڑ اور ادھر دیکھو، چاندی چاندی پہنا، لمبا لمبا کالا کالا بالوں کے جال والا بیٹھ پر میلا میلا، چاند سا لوڑ کا لئے پربت کالوڑی آرہا ہے"

موشائی کی باتوں پر کم لوگ دھیان دے رہے تھے۔ عورتیں تو بس کے اندر بیٹھی ہوئی تھیں۔ جس کے پاس اخبار تھا وہ اس سے پنکھا جھل رہی تھی جس کے پاس نہ تھا وہ یونہی دل کی تسلی کو دھوتی کا پلہ ہلا رہی تھی۔ مرد سڑک کے ٹکڑے سے برف کا ڈھلا پانی کے گلاس میں گھلاتے ہوئے لاتے تھے اور اپنی اپنی عورتوں کو دیتے تھے یا یونہی بس کی ایک طرف سے دوسری طرف کو چلے جاتے تھے۔ بس کی دوسری طرف سائے کا ایک مستطیل ٹکڑا صرف بس کی لمبائی کا ساتھ دے رہا تھا۔ آدمی بس کے ساتھ چمٹ جاتا تب ہی سورج کی نظر سے بچ جاتا لیکن بس کے لوہے کو باہر سے چھونا بھی مشکل تھا اور مرد سیاح کھڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورتوں کے ساتھ لگ کر کیا اچھے لگتے؟ وہ تو یونہی ایک طرف سے دوسری طرف کو چلے جاتے تھے۔ سب کو یہ ایک امید چلائے جا رہی تھی کہ ٹھاکر سنگھ ڈرائیور آئے گا تو ایک ہل چل مچے گی، ہارن بجے گا، انجن چلے گا، سواریاں دوڑیں گی اور "چلو چلو" کی آوازیں چاروں طرف سنائی دیں گی۔

لبسواس موشائی کی باتوں پر اگر کوئی دھیان دیتا تو وہ ٹھنڈک نہ سہی ٹھنڈک کے تصور کو پاتا۔ لیکن اس کی باتوں کو کوئی دھوپ اور پسینہ کا ایک پس منظر سمجھتا تھا کوئی ریت اور مٹی کا قدرتی نتیجہ۔

"پربت کالوڑی آرہا ہے" ـــــ آرہا ہے۔ لوگ سمجھے ٹھاکر سنگھ آرہا ہے۔ لیکن ٹھاکر سنگھ آرہا تھا نہ اس کا کنڈکٹر جگجیت سنگھ۔ سامان کب کا تُل چکا تھا، چھت پر لد چکا تھا، ٹکٹ بٹ چکے تھے اور جگجیت سنگھ کنڈکٹر بھی آجاتا تو ٹھاکر سنگھ ڈرائیور کے آنے کی امید ہو جاتی۔ میں نے کنڈکٹر کو دیکھا تھا نہ ڈرائیور کو۔ یکایک سڑک کے اس پار سیٹی بجی اور مری مری بس کی چاروں طرف زندگی اچھلی۔ عورتوں نے "پنکھے" پھینک دیئے اپنے تھیلوں، ڈبوں، بچوں، منہ چڑاتی ہوئی گرم بنیانوں کو سنبھالنے لگیں اور باہر والے اگلے پچھلے دونوں دروازوں سے بس کے اندر گھسنے لگے اور میں نے بھی دونوں سرداروں کو بس کی طرف آتے دیکھا۔

ایک تھا جوان لڑکا سا دوسرا ادھیڑ۔ چھوٹے کی داڑھی میں اتنی ترتیب نہ تھی جتنی کہ بڑے کی
میں پتلونیں دونوں کی خاکی تھیں لیکن چھوٹے کی قمیض اندر دبی ہوئی تھی اور بڑے کی بش شرٹ میں
رعب تھا۔ اس کی پتلون میں اس طرح کے خم بھی نہیں تھے نہ کہیں جھریاں تھیں۔ جگجیت سنگھ کی
پگڑی میں بھی کنڈکٹر کی اچھل کود ظاہر تھی لیکن سب باتیں واضح ہونے کے باوجود میری امیدوں
نے ٹھاکر سنگھ کی صورت کو قبول نہیں کیا۔

پٹھانکوٹ سے کئی اور بسیں ہم سے پہلے روانہ ہو چکی تھیں۔ لیکن بس والے بابو نے کہا تھا
کہ ان میں سے ایک بھی شام تک سرینگر نہیں پہنچے گی۔" لیکن صاحب آپ کی قسمت اچھی ہے
آپ پہنچ جاؤ گے۔ آپ کی بس نہیں رکے گی آپ کا ڈرائیور ٹھاکر سنگھ ہے۔ ٹھاکر سنگھ بس نہیں آندھی
چلاتا ہے۔ ٹھاکر سنگھ رکتا نہیں، اڑتا ہے، آپ پہنچ جاؤ گے، ضرور پہنچ جاؤ گے۔"

اور یہ تھا وہ ٹھاکر سنگھ، جواب ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ بھی گیا اور جگجیت سنگھ کی طرف حاکمانہ
انداز سے دیکھنے بھی لگا اور مجھے خیال ہوا کہ بابو نے حقیقت کو الٹا کر کے پیش کیا ہوگا۔ نہ جانے کتنوں دنوں
میں کشمیر پہنچا دے گا اس کی شکل ہی اور تھی۔

ٹھاکر سنگھ اتنا پتلا دبلا تو نہیں تھا لیکن اس کے چہرے کو دیکھ کر خواہ مخواہ خیال ہوتا تھا کہ اگر
اس کی داڑھی نہیں ہوتی تو یہ شخص بالکل چھچھوندر لگتا۔ سٹیرنگ (STEERING) پر اپنے دونوں ہاتھ
رکھ کر اس نے پیچھے مڑ کر سواریوں کی طرف دیکھا۔ میں نے نمبر ایک سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اسے پاس سے
دیکھا۔ اس نے اپنی چھوٹی آنکھوں کو اور چھوٹا کیا، اس کی آنکھوں کی گرد موٹی موٹی سی تتلیاں سی لگ گئیں
آنکھیں نہیں مجھے وہ میلی، پرانی، چھوٹی چھوٹی، بہت چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں سی لگیں جن میں بس ایک توت
کی جگہ ہو، توت جو آدھا کالا ہے، آدھا سفید۔ نہ جانے ٹھاکر سنگھ تعداد کا جائزہ لے رہا تھا کہ یوں ہی ایک
رنگا رنگی کے احساس کو پی رہا تھا۔ کیوں کہ سواریوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے اپنے منہ کا ایک کیپ
سا بنایا اور آنکھوں کو اور چھوٹا کر دیا۔ پھر اس نے آواز بھی دی "جگجیت سنگھ" اور میرے تخیل کا چوہا
ٹھاکر سنگھ کے منہ پر مکمل ہو گیا۔ کتنی پتلی آواز تھی جو مونچھ کے ایک ایک بال سے نکلتی دکھائی دی۔

لیکن بس کا سیلف کھنچتے ہی ایک جاندار لہر سکی، ٹھاکر سنگھ کی بانہوں میں رگیں ابھر آئیں اور بس ایک ہی بھراٹے میں ایک پولن دائرہ گھومی اور بازار بھر میں زلزلہ لاتی ہوئی شہر کی سکڑتی ہوئی دم سے باہر آ گئی۔

جگجیت سنگھ بھی میرے آگے کنڈکٹر کی سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا —— "کیوں بھئی سائیلنسر (SILENCER) ٹوٹ گیا ہے کیا؟" اس نے مڑ کر ٹھاکر سنگھ کی طرف بڑے تعظیم کے ساتھ اشارہ کر کے کہا۔ "استاد جی کی گاڑی میں سائیلنسر نہیں ہوتا ہے۔ یہ گاڑی طوفان میل ہے صاحب۔ جٹ بلین جٹ بلین۔"

میرے دل میں ایک یہ نیا احساس کہ ٹھاکر سنگھ "اُستاد جی" ہے اور دوسرا یہ لوٹتا ہوا یقین کہ شام ہی کو سرینگر پہنچنا ہے۔ لیکن اتنے ہی میں میرے کانوں میں اس حد کا طوفان آ چکا تھا کہ اب کسی اور آواز کو قبول کرنے سے قاصر تھے۔ نظر کھڑکی سے باہر جاتے ہی چکرا اٹھتی تھی کیوں کہ مقابل سے خود سڑک ہی ہماری طرف بھاگتی دکھائی دے رہی تھی اور پہیوں کے نیچے ایک پاگل پہاڑی نالے کی طرح گھستی چلتی آ رہی تھی۔ جمود اور بے حسی کا ایک قدرتی تصور اضطراب کی ایک غیر قدرتی تصویر کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور ماحول کی نئی چال کو اپنانے کی کوشش کرنے لگا۔

لیکن بسواس موشائی میری سیٹ کے پیچھے ہی بیٹھا انجن کی آواز کے اُوپر اوپر بول رہا تھا اس نے کئی موڑ مڑ کر بھی، درجنوں میل آگے جا کر بھی اپنے خواب کی تشکیل نہ پائی لیکن وہ بولتا ہی جا رہا تھا اور ٹھاکر سنگھ کبھی کبھی اس کی طرف مڑتا تھا، جیسے دیکھ رہا ہو۔ کہ یہ متواتر آواز گاڑی کے کس پرزے سے آ رہی ہے۔ موشائی کھڑکی سے گردن نکال نکال کر کئی بار "بچ گیا بچ گیا" کی آوازیں لگاتا تھا اور ٹھاکر سنگھ کی مونچھیں کچھ اس انداز سے پھیل جاتیں جیسے اسے موشائی کی بات پر ہنسی آ رہی ہو۔

"کون بچ گیا؟" جگجیت سنگھ نے ایک بار مجھ سے ہی پوچھا۔ "کتا؟ ارے استاد جی سے کبھی مینڈک نہیں مرا۔"

ٹھاکر سنگھ نے جگجیت سنگھ کی طرف دیکھا اور دونوں نتھنوں سے ہوا پی لی۔ ظاہر تھا کہ سچ

بولنے پر ٹھاکر سنگھ اسی طرح کنڈکٹر کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

بس لگ بھگ ڈیڑھ ہی گھنٹے میں ستر میل کا فاصلہ طے کر کے جموں پہنچ گئی۔ موشائی کے پہاڑ تو آگئے۔ لیکن دھوپ کے ابال میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سب لوگ ڈاک بنگلے میں ناشتے کی تلاش میں بیٹھ گئے۔ لیکن موشائی برآمدے پر یونہی پسینے پونچھتا رہا اور اس سے پہلے کہ کوئی اس کو بھی اندر بلاتا ٹھاکر سنگھ کاپیں پیں سب کو باہر کھینچ لائی اور جب سب بس میں اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے ہمارے پیروں کے نیچے بس کا فرش کانپ اٹھا، اور ہم پھر ٹھاکر سنگھ کی رگوں کے سپرد ہو گئے۔

گرمی کا عالم تو وہی تھا لیکن ماحول میں کئی تبدیلیاں آچکی تھیں اب ہماری بس تیتر کی مانند اڑتی ہتیں تھی پہاڑی ہیر پھیر میں سر مارتی جا رہی تھی۔ بائیں طرف ایسے ایسے چٹان لٹک رہے تھے کہ جیسے بس کی انتظار میں جست لگانے کو تیار ہیں، کہ اپنے ایک کونے کو بس کی چٹنی سے تر کریں گے اور بھراٹے بھرتی ہوئی بس کے ساتھ سڑک کا نشان تک مٹا دیں گے۔ لیکن ٹھاکر سنگھ کی بس تھی کہ دہاڑتی ہوئی اور للکارتی ہوئی چٹانوں کی بھوؤں کو چھو کے نکلتی تھی اور جیسے آگے گھس کر اس کے کانوں کو بھی پھاڑ دیتی تھی۔ دائیں طرف کھائی تھی اتنی گہری اور اتنی ڈراؤنی کہ بس کی چکی سے باہر دیکھو تو بے نشان دبے پایاں موت کی جھرجھری لو۔ لیکن ٹھاکر سنگھ کی بس تھی کہ ایک نہ پچھلا پہیہ زمین پر آدھا ہی رہتا اور آدھا گہرے موت کے منہ پر دُم گھما کے چلا آتا اور اس کے پیٹ میں تھوڑی سی مٹی پھینک دیتا۔ کبھی چٹان دائیں طرف کبھی گہرائی بائیں طرف اور ٹھاکر سنگھ کبھی چٹان کو جھاڑتا کبھی گہرائی میں تھوکتا۔ اس کی آنکھوں کے توت ہلتے بھی نہیں تھے۔ وہ تھا۔ اس کے ہاتھوں کی نسیں تھیں اور اس کا آگے نکلا ہوا تکونی منہ۔ سواریوں کی آنکھوں میں شاید اور کچھ نہ تھا۔ ایک ایک کا منہ پیلا پڑ گیا تھا۔ صرف وہی بنگالی تھا جو جوش میں چلائے جا رہا تھا۔ شاید تمام سواریوں نے اس کو بھی طوفانی انجن کے ایک پرزے کی حیثیت سے قبول کر رکھا تھا اور جب جب میرا اپنا دھیان اور باتوں میں لگ جاتا موشائی میرے دماغ کے کسی پچھلے پردے پر ایسے آجاتا جیسے اس بس کی مخصوص بناوٹ میں مجھ سے پچھلی سیٹ پر انجن کا منہ کھل رہا ہو۔

لیکن جب ادھم پور کے بعد فضا بدلی اور دوپہر کی دھوپ پر ایسی فضا چھاگئی جو برف کے

ساتھ کھیل کر آئی تھی اور گھنے چیڑ کی ڈھلانوں سے چھن چھن کر اترتی تھی۔ کسی کو اس بڑی تبدیلی کا دھیان تک نہ تھا اور حیرانی یہ کہ موشائی بھی اپنی سیٹ پر اونگ رہا تھا۔ کدکی ٹھنڈک میں پہنچے تو ٹھاکر سنگھ نے بس روک لی اور جگجیت سنگھ نے سواریوں کو جگایا اور ٹھاکر سنگھ کا حکم سنایا کہ پانچ منٹ کد کا ٹھنڈا پانی پیا جائے اور اس کے بعد فوراً بس میں بیٹھا جائے۔ میں نے مڑکر موشائی کو جگتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر خواب سے حقیقت تک کی کئی منزلیں ظاہر ہوئیں حقیقت یا آنکھیں کھول کر وہ دیوانہ ہونے لگا۔ وہ کھڑکی سے کود نکلنا چاہتا تھا اور باہر آکر وہ آسمان کی گہری نیلاہٹ سے جیسے چلو بھرنے لگا۔ ایک ایک چیڑ کو جڑ سے لیکر چوٹی تک آنکھوں سے ناپنے لگا۔ نیچے اتر کر کبھی سڑک کی چڑھائی پر دوڑ لگاتا اور وہیں سے اپنی نظر کو دور دور تک اس طرح اٹھاتا جیسے اپنی نظر پر آپ ہی سوار ہو گیا ہو اور ایک اڑان میں دور پہنچ گیا ہو۔ پھر اترائی پر تیز تیز واپس چلا آتا، کسی اور سواری کی بانہہ پکڑ لیتا اور ڈھلان ڈھلان کے رنگ میں فرق بتاتا، پانی کی آواز کو گیت پکارتا اور جنگل کی ہوا کو ساز۔ "موشائی آپ کیا کام کرتے ہو؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔ "ام ہمرا کام لوڑ کا لوگ کو پوڑھانا"۔ پھر وہ لیکایک ایسی انگریزی بولنے لگا کہ میرے دل میں ذرا بھی شک نہ رہا کہ وہ کسی بڑے کالج کا پروفیسر ہے۔ وہ پروفیسر بھی تھا اور شاعر بھی لیکن پروفیسر ایسا جو دنیا سے کٹ کر کتابوں میں کھو نہ گیا ہو اور شاعر ایسا جو ایک انجن کا ساتھی بھی بن سکتا ہو۔ وہ اس سفر کے تمام تجربات میں ہم سفروں کو شریک رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کے بس کے کرایہ دار اس کے تجربوں کے طلبگار نہ تھے، وہ اسے نہ جانے کیا سمجھتے تھے اور مجھے اب یہ افسوس ہو رہا تھا کہ میں بھی الگ الگ کٹا ہوا خاموش مشاہدہ کر رہا تھا۔

موشائی کا خیال تھا کہ ٹھاکر سنگھ حرکت اور توازن کا سب سے بڑا ماہر ہے کہ پہاڑ اپنے ہیر پھیر میں دنیا کی کسی اور بس کی ایسی شرارت برداشت نہیں کرے گا، کہ ٹھاکر سنگھ پہاڑوں کا پیارا ہے جو کٹھن سے کٹھن موڑ پر اسی کے پہیوں کی ادا کو دیکھنے کے لئے کھڑے ہیں۔ ایسے آدمی کے ساتھ بات کئے بنا موشائی بے چین تھا۔ اس لئے میں اسے ٹھاکر سنگھ کے پاس لے گیا اور بات بھی میں نے ہی کی۔

"سردار جی آپ بہت اچھے ڈرائیور ہیں۔"

"ہم ٹُر دی لبس کے ڈرائیور ہیں"

"ٹُر دی لبس ؟"

" ٹُورِسٹ نہیں۔ ٹُر دی لبس"

" ٹُر دی لبس یعنی چلتی گاڑی ؟"

" ٹُر دی لبس جو ٹُر دی روے ٹُر دی روے ٹُر دی روے، کدھر رُکے نہیں۔"

"بس کو تو آپ روک سکتے ہیں"

"میں نہیں روک سکتا۔ ٹُر دی لبس میں آپ ہاں"

" ٹھیرو، ٹھیرو ـــــ "موشائی نے مجھے روکا اور بڑے پیار کے ساتھ ٹھاکر سنگھ سے بولا۔

"آپ بہت اچھا سردار جی ہے۔ آپ نے کیا کہا کہ آپ ہی آپنا باس ہے"

"ٹُر دی لبس۔ بنگالی بابو، ٹُر دی لبس، یہ لبس بھی ٹُر دی لبس، میں خود بھی ٹُر دی لبس" ایشا ـــ ؟

سوردار جی ؟"

ٹھاکر سنگھ نے پیالے میں بچی کھچی چائے ایک گھونٹ میں پی ڈالی اور ایک دم کھڑا ہو گیا اور "چلو چلو۔ ٹُر دی لبس رکتا نہیں۔ چلو چلو جگجیت سنگھ ہارن بجاؤ۔"

" شُنیئے تو۔ شُنیئے تو" موشائی کہتا گیا۔ لیکن ٹھاکر سنگھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سیلف کھنچ گیا، سواریاں دھڑا دھڑ اندر آ گئیں، اور لبس چل پڑی۔

کشمیر کے اس سفر کا ایک نیا دور تھا وہ جب ہم لبس لیکر آسمان پر چڑھتے دکھائی دیئے۔ جب میلوں سڑک، اپنی اونچائی سے نیچے تک، حالی سے دھندلے ماضی تک بل کھاتی، چکراتی دکھائی دے رہی تھی، جب اپنی چال اور پہاڑ کی بے بسی میں انسان کی طاقت کا احساس ہونا لازمی تھا، جب قدرت کبھی، ہمیں اپنے چلمن میں لے کر لوری سی دینے لگتی تھی اور کبھی نیلے آسمان اور سبز پھیلاؤ میں لے آتی تھی۔ لبس کی سواریوں میں سے کسی کو اب ٹھاکر سنگھ کا دھیان، رہا نہ ٹھاکر سنگھ کی خطرناک تیزی کا۔ راستے کی کشش اس حد کی تھی کہ بس میں بیٹھے ہوئے وہ سیاح بھی محو ہو گئے جو مشکل صرف

کشمیر کی جھیلوں کی بھوک لیکے آئے تھے یا وہ جو چیڑ کے نہیں اخروٹ کی لکڑی کے خریدار تھے۔

ایک موٹا سا ئی تھا جو بیچ بیچ میں اپنے آپ کو باہر کی فضا سے کاٹ کر ٹھاکر سنگھ کو کنکھیوں سے دیکھنے لگتا۔ ٹھاکر سنگھ نہ دائیں دیکھتا نہ بائیں۔ سامنے سے ٹرا آتی، بس آتی، ڈرائیور دور ہی سے "ٹڑدی بس" کو پہچانتا، اپنی گاڑی کو ایک طرف دباتا، ٹھاکر سنگھ کو سلام کرتا اور ٹھاکر سنگھ موچھوں کے نیچے ہونٹ پھیلا کر سلام کا جواب دیتا اور ایک نئے دھکے سے بس کو آگے مارتا۔ ٹھاکر سنگھ کو راہ چلتے ہوئے گجر سلام کرتے، پڑاو کے دوکاندار ہاتھ جوڑتے اور پاس بیٹھے ہوؤں کو انگلی اٹھاکر دکھاتے، تعریف بھری نگاہوں سے دیکھتے اور راہ چلتے ہوئے مسافر گاڑی روکنے کے لئے ہاتھ کھڑا کرتے، لیکن بس کو پہچانتے ہی ان کے ہاتھ گر جاتے، کیوں کہ "ٹڑدی بس" کبھی راستے میں رکی نہیں تھی، کبھی پانی بھرنے دم بھر بھی ٹھیری نہ تھی۔

"کریچ!" ٹڑدی بس کو بریک لگ گئی سواریاں اچھل پڑیں اور سب نے کھڑکی سے باہر گردنیں لمبی کر کے وجہ تلاش کی ایک دبلا سا لڑکا نیلی قمیض اور خاکی نکر پہنے گلے میں بستہ لٹکائے بس کے دروازے کی طرف دوڑا آرہا تھا۔

"استادجی بس کو صرف اسکول کے لڑکوں کے لئے روکتے ہیں" جگجیت سنگھ نے وضاحت کی۔ لڑکا بس میں بیٹھ گیا اور بس پھر چل پڑی۔

"تمہارے استادجی بہت اچھے ہیں" میں نے جگجیت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کوئی غریب مسافر لولا، لنگڑا ہوگا وہ بس کو تب بھی روکتے ہوں گے؟"

"نہیں" جگجیت سنگھ نے فوراً جواب دیا۔

"استادجی کہتے ہیں کہ جس کے پاس ٹکٹ نہیں وہ ٹڑدی بس میں نہیں آسکتا۔ پیسے نہیں ہیں تو ٹڑدی بس میں جگہ نہیں"۔

"سکول کے بچوں کی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ راز تو استادجی جانیں۔ ہم کو یہ معلوم نہیں"

"اِتنر کا بھید ہوگا"۔ موشائی پیچھے سے بول اٹھے۔ لیکن "ٹردی لبس" سے کون پوچھتا!

"کرینچ" گاڑی پھر رکی اور چار پانچ لڑکے نیلی قمیضیں پہنے ہوئے۔ ٹھاکر سنگھ کو سلام کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ بچے گھس آئے اور بس چل پڑی۔

"یہ باچہ لوگ سوردارجی کو جانتا ہے"

"استادجی کو ساری دنیا جانتی ہے"

"ایدر گاؤں کہاں ہے؟ یہ باچہ لوگ کہاں سے پوڑھنے آتا ہے"

"یہ تین چار میل سے پڑھنے آتے ہیں"۔

"اینکے گاؤں میں سکول نہیں ہے؟"

ٹھاکر سنگھ نے گردن موڑی اور موشائی کو خود ہی جواب دیا۔

"بنگالی بابو۔ اب تو ہر گاؤں میں اسکول ہے۔ یہ بچہ لوگ گاؤں سے نہیں آتا۔ وہ دیکھو نیچے پہاڑ کے دامن میں ایک گھر ہے، ایک گھر، دو گھر اس طرح میلوں کی دوری پہ ہوتا ہے۔ یہ سینکے اناں ہی گھراں سے آتے ہیں ۔۔۔"

"یہ لوگ بھی باچہ لوگ کو پوڑھاتے ہیں؟"

"بنگالی بابو۔ زمانے میں انقلاب آیا ہے۔ انقلاب! اب سب بچے پڑھ رہے ہیں۔ سب بچے!"

پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ بس کی رفتار قدرے سست پڑ گئی ہے۔ لیکن ٹھاکر سنگھ کا تکونی منہ آگے سڑک کی طرف ہو گیا! اس کے توت چھوٹے ہو گئے اور بس پھر پھراٹے بھرنے لگی۔ پانچ بجے کی سہانی دھوپ میں ہم باہنال گاؤں کی میٹھی ٹھنڈک میں پہنچے اور ٹھاکر سنگھ کے حکم کے مطابق چائے پینے کے لئے بس سے نکل آئے، فضا کی ٹھنڈک پر دل کی اس تسلی کا نکھار تھا کہ دو تین گھنٹے میں منزلِ مقصود آئے گا اور ہم دونوں موشائی اور میں، ایک مبہم اتفاق کے ماتحت ٹھاکر سنگھ کے ساتھ ہی چائے پینے لگے۔

"سورداجی۔ آپ کہاں رہتے ہو؟"

"ٹڑدی بس میں"

"نہیں۔ آپنے گاؤں کہاں ہے؟"

"تھا اب نہیں ہے۔ بنگالی بابو۔ بہتا دن ہو گیا۔ گاؤں ہمارے واسطے نہیں رہا۔"

"کیوں آپ کے گاؤں میں کیا ہو گیا؟" اب مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

"بابو صاحب ــــ" ٹھاکر سنگھ نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنا تکونی چہرہ زمین کی طرف موڑا۔ بابو صاحب! اس کے دو نوں بہت چھوٹے ہو گئے اور پپوٹوں کی پتلیاں جڑ گئیں۔

"بابو صاحب! کچھ نہیں ہوا"

"کیسے نہیں ہوا۔ بہت کچھ ہوا۔ بتانا ہو گا سوردارجی"۔ موشائی دو قدم آگے آگیا اور ٹھاکر سنگھ کھڑا ہو گیا۔ لیکن بس کی طرف نہیں چلا۔ دکان سے باہر آکر وہ دھیرے دھیرے نیچے پہاڑی نالے کے کنارے تک آگیا ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے۔

"کیوں بابو صاحب۔ سننا ہی چاہتے ہو؟"

"ہم آپ کے ساتھ اسی واسطے آیا" موشائی بولا۔

"اس گاؤں سے ہماری بیوی بھاگی۔"

"یہی تو ــــ!" موشائی پتھر پر ایسے بیٹھ گیا جیسے اس کی ٹانگوں میں سے جان نکل گئی ہو۔

"چلو چلو ــــ!" ٹھاکر سنگھ لپکا ایک بس کی طرف چلنے لگا۔

"ٹڑدی بس نہیں رُکے گی، نہیں رُکے گی۔ چلو بنگالی بابو چلو۔"

لیکن موشائی نے ٹھاکر سنگھ کو ایک ایسے اشارے سے روکا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں بے ہوش ہونے لگا ہوں۔ پانی پلاؤ۔

ٹھاکر سنگھ اس کی طرف لوٹا۔ موشائی نے گلا تر کر کے پوچھا۔

"آپ کا، آپ کا بی بی کیوں بھاگا؟"

"کیوں؟" ٹھاکر سنگھ بولا۔ "بھاگا۔ ہمارا بیوی کسی اور کے ساتھ بھاگا۔ گھر چھوڑ کر بھاگا۔ تم پوچھوگے۔ کیوں بھاگا۔ بابو۔ ہم کلینر تھا گاڑی کا۔ گاڑی والا مالک، بیوی کو لے گیا۔ بنگالی بابو ہمارے پاس ٹکٹ نہیں تھا۔" وادی کی خاموشی نے نالے کی آواز کو بھی نگل لیا۔ ٹھاکر سنگھ نے ٹوکریاں کھولیں اب ان میں ایک تیلی نہ تھی۔ بولا۔ "بابو۔ بیوی کو ہم پسند نہیں تھا۔" پھر منہ کا کیپ بناتے ہوئے۔ "کہلا بھیجا کہ ٹھاکر سنگھ ٹھیک آدمی تو ہے لیکن اناں ہے۔ پڑھیا نہیں، لکھیا نہیں" ——

موشائی کو نہ معلوم کیا ہو رہا تھا لیکن میں نے دھیان نہیں دیا۔ میں نے سردار جی سے پوچھا۔

"کیوں آپ کے گاؤں میں بہت پڑھے لکھے تھے؟"

"نہیں۔ میری بیوی کے باپ نے چار جماعتیں پاس کی تھیں۔"

"اور جس کے ساتھ وہ —— میرا مطلب ہے۔ چلی گئیں؟" "وہ بھی کچھ پڑھیا ہی ہوگا۔"

"آپ نے، میرا مطلب ہے۔ ان کو واپس لانے کی کوئی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں۔ گھر سے جو گئی سو گئی۔ پھر بابو صاحب۔ میرے پاس پڑھیائی تھی نہ فرسٹ کلاس ٹکٹ۔"

"لیکن گاؤں میں پڑھے لکھے کی بات کیا تھی ——؟"

"بابو صاحب —— ان دنوں کون پڑھاندا وڑھاندا تھا۔ آج کل سب پڑھدے ہیں، سب پڑھدے ہیں۔" ٹھاکر سنگھ نے مونچھ کے نیچے پتلا پتلا زہرخند کیا اور بولا۔ "ہماری تو ٹرڈی لس ہے۔ بابو صاحب ٹرڈی لس۔ چلو چلو دیر ہو رہی ہے۔" لیکن موشائی اپنے پتھر سے ہلا بھی نہیں۔ اس کے چہرے کا رنگ کالا تو تھا ہی لیکن اب کالے میں نیلا سا گھلنے لگا۔ مجھے نہ معلوم کیوں خیال آیا کہ اسے کسی پرانی بیماری کا دورہ پڑنے والا ہے جس کو وہ اندر اندر دبانے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ لیکن وہ اچھل کر کھڑا ہوا، جیسے پتھر کی گرفت سے آزاد ہو گیا ہو۔ اس نے لپک کر ہاتھ سے ٹھاکر سنگھ کو پکڑا اور دوسرے سے اپنے کرتے کے بٹن ایک ہی جھٹکے میں کھول دیئے اور پھر ٹھاکر سنگھ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا۔ "سوردار جی۔ سوردار جی ہمرا بی بی بھی بھاگ گیا ہے اور وہ اِش واشٹلے بھاگ گیا ہے

کہ ہم بہت پوڑھا ایکھا آدمی کیوں ہے۔ بہت بہت کتاب کی بات کیوں کرتا ہے۔" اور "سوردا رجی سوردا جی" کرتے کرتے وہ پھر سردار کے سہارے بھی کھڑا نہ رہ سکا اور اسی پتھر پر بیٹھ گیا ــــــ

ٹھاکر سنگھ نے اپنا تکونی منھ بیٹھے ہوئے موشائی کی طرف بہت جھکا دیا اور دھیرے دھیرے اپنے بدن کو خم دیکر اسی کی طرف دیکھنے لگا۔ اب اس کے پپوٹوں کی تپلیاں اتنی کس گئیں کہ توت دکھائی بھی نہ دیئے وہ موشائی کو گھورتا گیا، گھورتا گیا اور ادھر جگجیت نے ہارن بجا کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کیونکہ رات پڑنے سے پہلے بانہال پہاڑ کے پار جانا تھا، لیکن ٹھاکر سنگھ ہلا بھی نہیں اور جب جگجیت سنگھ اپنی آنکھیں پھاڑ کر پاس آگیا۔ ٹھاکر سنگھ نے دھیرے سے آخری حکم سنایا کہ بس آگے نہیں جائے گی، اور رات وہیں بانہال گاؤں میں کٹے گی۔ میاں نے "ٹردی بس" کی طرف نگاہ اٹھائی اور محسوس کیا کہ سڑک پر ایک طرف کو سرک گئی ہے اور پہاڑ کی مجسم شام ٹھنڈک کی گھنی گھنی تہوں کو لے کر اسی بس پر اترتی آرہی ہے ﴿

پانی کے پاس

مجھے حکم ملا تھا کہ میں موت اگلتی ہوئی توپوں کے کھلے منہ تک جاؤں اور ممبوں، زلزلوں اور ہلتی ہوئی کائنات کی تصویریں لے کر زندہ لوٹ آؤں۔ دل کو ایک ہی سہارا تھا کہ مجھے ایک محفوظ موڑ پر روکا جائے گا اور مجبوری کے عالم میں طوفان کے پچھواڑنے سے ہی جو ملے گا اسی کو اور اپنی پیاری زندگی کو لے کر لوٹ آؤں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ کوئی ایسا موڑ آیا ہی نہیں، جہاں رُکنے کا حکم ملتا اور جوں جوں جیپ آگے بڑھتی گئی، میرا دل اس انتظار میں دھڑکنے لگا کہ ابھی ایک توپ سامنے دکھائی دے گی اور ابھی زمین آسمان پر لپک اٹھے گی اور ایک مشتِ خاک نہ معلوم مجھے کہاں لے جائے گی!

لیکن بھگوان کیا، بھگوان سے بڑے انسان کی مایا دیکھئے۔ آسمان کے ٹکڑے کرنے والے دھماکوں کی جگہ میرے کانوں کی اندرونی کپکپاہٹ کو ایک ڈھولک کی دُھن سہلا سہلا

کر یقین دلانے لگی کہ میں ہی ہوں!

یہ تھی منزلِ مقصود جہاں جیپ رک گئی اور ہم زمین پر کھڑے ہو گئے۔ اس جگہ کی مٹی میں رُعب تھا۔ اپنی مرضی سے ایک بھی قدم اُٹھ نہ سکتا تھا۔ دُور دُور تک سیاہ فام لوہا طاق میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور دور دور تک اس مٹی نے اپنے پہلوؤں میں شعلے اٹھا کر کھیت فصل کی تصویروں کو مسخ کر دیا تھا اور اسی عالم میں میرے کانوں میں ڈھولک کی آواز آرہی تھی۔ اسی آواز نے میری آنکھوں کو مٹی سے کاٹ اٹھایا اور پھر مجھے انسانوں کا ایک پھولا پھولا دائرہ دکھائی دیا۔ ڈھولک کی اس اجنبی "دُھن دُھن" کے گھیرے میں ایک گرم اور گھریلو گیت ماحول کا منہ چڑا رہا تھا۔

موت کے سناٹے اور ہولناک خاموشی کی گہری گود میں یہ ڈھولک کا گیت ــــ!

لیکن ساتھی سپاہی نے فوراً اطلاع دی کہ جنگ بندی کا ابھی ابھی اعلان ہو چکا ہے اور میں نے اس خبر کو اپنے ذہن میں ایسے بٹھایا جیسے کہ مجھے اس بات کا پہلے ہی پتہ تھا۔ اب میرے قدم خود بخود اٹھنے لگے اور میں نے اپنے کندھے کو ایک جھٹکا دیا۔ کیمرہ سیدھا کیا اور آگے بڑھا۔

مٹی اور دھوپ میں پکے ہوئے سپاہیوں نے پیٹ بھرے فولاد کو ایک طرف لٹا کر رکھا تھا۔ نالیوں دو نالیوں کی گانٹھ گانٹھ میں غصہ تھا لیکن گیت گاتے ہوئے چہروں پر نہ معلوم کس مٹی کی نرمی تھی اور پھر دائرے کے دائرے پر اترتی دھوپ کی ٹیک تھی۔ ان ہی کے بیچ میں مجھے ایک چھوٹا سا، مسکین سا لڑکا، عجب تقدیر کے ساتھ سمجھوتہ کئے ہوئے بیٹھا دکھائی دیا۔ فرض شناسی کے جذبے میں، میں اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے لگا۔

ایک مشکل سا گھونٹ نگل کر میں نے ساتھی گارڈ کے سپاہی سے پوچھا ــــ

"جمعدار صاحب! یہ لڑکا کون ہے؟"

"پلٹن کا بیٹا۔" سپاہی نے کندھے پر سے رائفل اتار کر کہا

"پلٹن کا بیٹا! کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ پلٹن نے اسے گود لیا ہے۔"

"کہاں سے؟ کس سے؟"

"یہیں سے!"

ایسا لگا کہ سپاہی سے اور کچھ پوچھنا منع ہے۔ اس لئے میں خود آگے بڑھا اور موت کی سرحد سے لوٹے ہوئے انسان کی اس دھڑکن کے پاس آگیا جو آواز بن کر ڈھولک کی تال کے ساتھ مل گئی تھی۔ گیت جنگ کا تھا نہ جنگ بندی کا، گیت رلاتا تھا نہ ہنساتا تھا۔ گیت ایسا کہ جس کے صاف صاف بول ہیں۔ لیکن بول ایسے کہ محض آواز ــــ آواز، جس کی کہانی، جس کا درد، جس کا پیام مُنہ کھلی توپ پی جاتی تھی اور فضا ویسی کی ویسی رہ جاتی، گھونگی کی گھونگی، افتادہ، خاک میں ملی ہوئی، بے مطلب، بے معنی!

لیکن جب میرے کیمرے نے چشمکیں شروع کیں۔ نہ معلوم یہ گیت عام گیتوں کی طرح کیوں کھلتا ہوا دکھائی دیا اور لوہے کو سونپی ہوئی بوٹیاں کیسے ڈھیلی ہوتی دکھائی دیں۔ اور کیوں آدمی آدمی کی آواز، نظروں کا ایک ایک اشارہ، چہرے کی ایک ایک جنبش میرے کیمرے میں گھس کر میرے ساتھ جانا چاہتی تھی اور پھر جوں ہی چند تصویریں لے کر میں نے اپنا کیمرہ بند کیا۔ ڈھولک کا یہ غیر حقیقی گیت حقیقی ماحول سے ٹھیک اسی طرح مٹ گیا جیسے آنکھ کھلتے ہی خواب میں بولتی ہوئی چڑیلیں غائب ہو جائیں۔ جوان کھڑے ہو گئے اور دائرہ ٹوٹ گیا۔ ایک ایک نے مجھ سے بات کرنا چاہی، مجھے چھو چھو کر کچھ کہنا چاہا اور دائرے کے بیچ کا لڑکا بھیڑ سے الگ ہو کر نہ جانے کیوں رونے لگا۔ میرے گرد سپاہی کہاں! اب تو گھر بار، امن چین اور بال بچوں سے الگ کٹے ہوئے انسان تھے۔ میں نے بلا جھجک اُن ہی سے پوچھا ـــــ

"بھئی یہ لڑکا کون ہے؟ یہاں کیسے آیا ہے؟"

اس ایک لمحے کے لئے وہ لڑکا ہر ایک کے دل سے نکل چکا تھا۔ میرے سوال پر

سب نے بیک وقت اُس کی طرف دیکھا۔

" ارے ۔ للوا کیوں رو رہا ہے ؟ " کسی نے آواز دی اور پانچ چھ جوان ایک ساتھ اُس کی طرف لپکے اور ایک نے اُسے گود میں اٹھا کر ناچنا شروع کیا۔ للوا چپ ہو گیا اور آنسو پونچھتا ہوا مسکرایا بھی۔

" اس کا نام للوآ ہے ؟ "

" نہیں جی ! یہ نام ہم نے اس کو دیا ہے ۔ گاؤں میں اس کا نام کچھ اور ہو گا۔ "

" کون سے گاؤں میں ؟ "

میرے اس سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ لیکن تقریباً سب کی نظریں ایک ساتھ ڈوبتے سورج کی طرف مڑیں جہاں مغرب سے پھوٹی ہوئی شوخ کرنیں افق کے ایک میلے ٹکڑے کو نمایاں کر رہی تھیں ۔

" یہ لڑکا ہماری پلٹن کا پیارا بیٹا ہے ۔" ایک سپاہی جو درجے میں اُن سب میں بڑا دکھائی دے رہا تھا، یہ ظاہر کرتے ہوئے آگے بڑھا کہ راز کی باتیں کہنے نہ کہنے کا حق صرف اُسی ایک کو ہے !

" یہ لڑکا ـــ چھوٹا سا ـــ مُنا سا ـــ للوا ـــ یہ پلٹن کا بیٹا ہے ۔ صاحب جی ـــ یہ دیش کا بیٹا ہے ۔ اس چھوٹے نے بہت بڑا کام کیا۔ "

" یہ تو بتایئے کہ اس نے کیا کیا ؟ "

اس نے تو جی بہت بڑا کام کیا۔ مُنے کو راجدھانی لے جائیں گے ۔ اسے میڈل دلوائیں گے ـــــ کیوں جی ؟ "

" اس کو تو بہت بہت انعام ملنا چاہیئے ؟ " سپاہی نے موچھوں پر اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ جیسے یہ بھی سوچ رہا ہو کہ فوٹو گرافر سے اس سے زیادہ کہنے کا حکم نہیں ہو گا۔

" لیکن یہ بھی بتایئے نا کہ کیا کیا۔ ہم اخبار میں لکھیں گے ۔ "

گارڈ کا سپاہی پیچھے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ابھر آ گیا۔

"چلیئے صاحب لے لی تصویریں؟ چلیئے ٹائم ہو گیا ــــ"

"اچھا؟"

"جی ہاں۔ چلیئے!" سپاہی کی آنکھوں میں حکم تھا۔ کیمرے کو کندھے پر ڈال کر میں نے بچے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھر بھر آئی تھیں۔

میرے راستے میں ایک کھائی تھی اور کھائی کے پرلی طرف ہی میرے لئے گاڑی کے انتظام کی امید تھی۔ ڈھلتی شام کے سوکھے سایوں نے گرم ہوا کو بھی پی لیا اور پسینوں سے میرے کپڑے تک بھیگنے لگے۔ گارڈ کے سپاہی کو اپنے رائفل کے بوجھ سے زیادہ بھاری میرے کندھے پر لٹکتا ہوا کیمرہ ہی لگا۔ بولا ــــــ

"آج کل فوٹو کا کام بھی بھاری ہو گیا ہے۔"

"جی ہاں ــــ" میں نے بے رخی سے جواب دے کر اپنا پسینہ پونچھا۔

"ٹھہریئے ــــ میں آپ کے لئے ــــــ" اس ادھورے جملے کے ساتھ ہی اس نے اونچی آواز میں کسی کو پکارا

مجھے خیال تھا کہ جنگ کی اس سرحد پر اور عالم گیر موت کے ایسے پیار میں ایک بچہ بھی غیر معمولی اہمیت کا مالک ہے۔ لیکن سپاہی نے ایک آواز ایسی دی جیسے پلٹن کا ایک نوکر بھی ہو۔ آواز کے جواب میں ایک اور لڑکا گھنی جھاڑی کے پیچھے سے لپک کر نکل آیا۔

یہ لڑکا کچھ بڑا تھا۔ اس ماحول میں بھی گالی کا حق دار سا۔ اور گھر سے نکالا ہوا سا۔ کرتے پر کئی دنوں کی مٹی تھی۔ بالوں میں ریت ریت سی، آنکھوں میں بیماری سی۔ لیکن اس کے کندھے پر میرا کیمرہ لٹکایا جا سکتا تھا اور وہی پھر میرے ساتھ کھائی میں اترنے لگا۔

کھائی میں اترتے ہی لڑکے کا پاؤں پھسل گیا اور پھسلتے ہی وہ رو پڑا۔ اور اس کا بدن کانپنے لگا۔ اس اطمینان کے ساتھ کہ کیمرے کو ضرب نہیں آئی ہے، میں نے لڑکے کو سہارا دے کر اٹھایا۔ ظاہر تھا کہ لڑکا میرے نرم لہجے پر اتنا حیران ہو گیا کہ اس کا رونا بھی بند ہو گیا اور بدن کا کانپنا بھی۔

"کیوں چوٹ لگی کہیں ؟" میں نے پوچھا۔لیکن اس نے صرف سر ہلایا۔

"پھر کیوں رونے لگا ہے تمہارا جسم کیوں ہلنے لگا تھا ؟

اس نے میرے ہاتھ کو یوں ہی پکڑ رکھا تھا اور اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو اور تھکا رہا تھا۔ اس نے جب ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تو میں نے پوچھا :۔۔۔

"بھئی لڑکے تم یہاں کیسے آگئے ؟ وہ ۔۔۔۔ وہ ۔۔۔۔ چھوٹا سا لڑکا کہاں سے آگیا۔ تم کہاں سے آگئے۔ یہاں اس جگہ ؟"

لڑکے کی بھیگی بھیگی لیکن جمی ہوئی آنکھوں میں سے پانی کی دھاریں بہنے لگیں اور چہرے کی مٹی کو کاٹتی اترتی گئیں۔ زمین کے اس غیر فطری نقشے میں، جس کے خطوط کو ڈھولک کے گیت نے اور الجھا دیا تھا، بیمار آنکھوں کا یہ پانی میرے جسم پر گرتا دکھائی دیا اور اندر اندر میری جلد بازی کی گرما گرمی ٹھنڈی ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم دونوں ایک چھوٹے ٹیلے کی اوٹ میں آگئے ہیں۔ میں نے لڑکے کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔۔۔

"کہو بیٹا ! وہ لڑکا کون ہے اور تم کون ہو ؟"

"میرا ب بھائی !" کپکپاتے ہونٹوں میں سے صرف اتنا نکلا اور پانی کی دھار موٹی ہو گئی۔

"بھائی ۔۔۔ ؟ ہاں ۔۔۔ تمہاری شکل تو ملتی ہے۔ لیکن بیٹا یہاں کیسے آگئے ؟"

لڑکے نے ایک لمحہ پیچھے کی طرف دیکھا اور اپنے میلے ہاتھوں سے پانی کی لکیروں کو مٹا کر منہ پر پونچھا سا لگایا اور پھٹی پھٹی آنکھوں والا اور کیچڑ سے لپٹا ہوا وہ چہرہ میری اپنی آنکھوں پر ہمیشہ کے لئے بیٹھ گیا ۔۔۔

"کہو بیٹا۔ کوئی نہیں دیکھ رہا ؟"

میرا بھائی ! میرا چھوٹا بھائی۔"

"ہاں۔ ہاں ! تم اور تمہارا چھوٹا بھائی۔"

ہم ۔۔۔ ہم دونوں۔ کوٹھے پر۔ کوٹھے پر سو رہے تھے۔"

"ہاں ــ ہاں !"

"بادل ــ بادل ــ بادل گرجنے لگے۔ اوپر آسمان پر۔ بادل ــ بادل نہیں تھے۔ میں نے کہا۔ بھونچال۔ بھونچال آیا .... دوڑے نیچے۔"

پھر وہ ہچکیاں لینے لگا ــــ

"گھر میں، گھر میں، کوئی نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں ــ پھر ــ پھر ــ مٹ ــ مٹ ــ مٹو کے گھر میں کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں ــ پھر ــ پھر ــ پھر ــ تائی کے گھر میں کوئی نہیں تھا ــ پھر ــ پھر ــ بازار میں کوئی نہیں تھا ــ پھر ــ پھر ــ پھر سکول میں، سکول میں ــ کوئی نہیں تھا۔ سارے گاؤں میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ہم ــ ہم بہت ڈر گئے۔ جور جور سے رونے لگے۔ بھونچال، بھونچال بہت آیا۔ میں نے کہا سپنا ہے۔ سڑک پر بیٹھ گئے۔ ماں کو آواز دی۔ بہت آواز دی۔ بہت آواز دی۔ پھر ــ پھر ــ ایک آدمی۔ شپاہی دوڑا۔ شپاہی ہمارے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ دونوں کو پھر، پھر، پھر پکڑ کر لے گیا۔ لے گیا۔ کھڈوں میں ــ کھائی کے اوپر کھڈوں میں ــ"

"کون سے کھڈوں میں ؟"

"اور شپاہی تھے وہاں، کھڈول میں اور ......"

"اچھا اچھا خندق میں ــ پھر ؟"

پھر شپاہی نے کہا ــ کہا لیٹ جاؤ، لیٹ جاو۔ ٹکڑے ہو جائیں گے ــ اور کہا ــ پھر، پھر، پھر، بھونچال نہیں تھا، سپنا نہیں تھا۔ لڑائی تھی، لڑائی ہو رہی تھی، گولے ــ گولے ــ گولے ــ"

"ہاں ہاں پھر کیا ہوا ؟"

پھر پھر ہم لیٹے رہے ــ دونوں ــ میں اور بھائی ــ دونوں۔"

لیکن تم کو ماں باپ ساتھ نہیں لے گئے ؟"

پتہ نہیں ـــ پتہ نہیں ـــ شپاہی لوگ کہہ رہے تھے، جلدی میں چلے گئے ـــ

اماں ـ بھابی ـــ تائی ـ ــ سب گئے ـــ بھاگ گئے ـــ وہ، وہ، وہ ـــ کہاں ہیں ـــ

اماں ـــ بھابی ـــ تائی ـــ وہ، وہ گاؤں والے کہاں ہیں"؟ لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور میرے ذہن میں بات صاف ہوگئی کہ دو لڑکے خوفناک بھاگم دوڑ میں وہیں رہ گئے تھے۔ مکان کی اپنی چھت پر۔ اور ماں، تائی، بھابی، جو بھی تھے وہ اپنی اپنی جان لے کر بھاگ گئے۔ یہی سمجھ کر کہ لڑکے اُن سے پہلے نکل چکے ہیں۔ نہ جانے اور کیا بات ہوگئی تھی!

"پھر۔ پھر۔ پھر کھڈے میں شپاہی کو پیاس لگ گئی۔ اُن کی بوتلوں میں پانی نہیں تھا اور ـــ اور ـــ گاؤں پاس نہیں تھا۔ پھر ـــ پھر ـــ پھر میں نے کہا۔ مجھے اٹھنے دو۔ میں میں پانی لاؤں گا۔ پاس کھائی پانی ہے۔ مجھے پتہ ہے۔ میں لاؤں گا۔ میں لاؤں گا۔ دوسرا، دوسرا شپاہی بولا۔ اس کو چپ کراؤ ـــ نہیں، نہیں کرتا چپ جانے دو ـــ مرنے دو ـــ پھر پھر شپاہی کو پیاس بہت لگی تھی، بہت لگی تھی۔ اُس کے، اس کے ہاتھ میں خون تھا۔ اس نے کہا کہ ـــ پانی لانے دو۔ دوسرا، دوسرا بولا ـــ "باہر کوئی نہیں جائے گا۔ بولا۔ بولا ـــ بولا خون کے مُنہ، مُنہ، مُنہ گیلا کرو ـــ گولی چلاؤ، چلاؤ پھر، پھر میں لیٹے لیٹے رونے لگا۔ میرا بھائی جور جور سے رونے لگا ـــ پھر پھر خون والے شپاہی نے میرے ہاتھ میں، میرے ہاتھ میں بوتل دی۔ اور اور میں کھڈ سے باہر بھاگنے لگا۔ بوتل۔ بوتل لے کر۔ دوسرا شپاہی، دوسرا شپاہی بولا ـــ رک جاؤ۔ رک جاؤ۔ رک جاؤ ـــ مرے گا۔ لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ وہیں اور پیٹ پر چلو۔ پیٹ پر، یوں یوں......"

"پھر ـــ پھر ـــ پھر میں ـــ میں تھوڑی دُور پیٹ کے بل، پیٹ کے بل چلا۔ پھر اٹھ کے دوڑا، دوڑا کھائی کی طرف۔ اسی، اسی، اسی کھائی میں ـــ"

لڑکے کے منہ پر مُردنی چھاگئی۔

"اسی، اسی کھائی میں ـــ وہاں، وہاں، وہاں پانی ہے، پانی کے پاس آیا اور اور

اور ــــ"

وہ رک گیا!

"بول بول بول بیٹے جلدی بول۔ ہاں، ہاں پھر؟"

پھر، پھر، پھر۔ وہیں دیکھا، دیکھا، پاس ہی، پاس ہی، ایک اور، ایک اور شپاہی بیٹھا ہے۔ وہاں، وہاں، وہاں ــــ اس نے بلایا ــــ اور، اور میں گیا ــــ اُس کے پاس۔ اس کی ٹانگوں میں بھی خون تھا۔ دونوں، دونوں ٹانگوں میں۔ اس نے اس نے میری توتل چھین لی۔ اور اور سارا پانی پی لیا۔ پھر ــــ پھر ــــ پھر اس نے، اس نے مجھے پکڑ لیا۔ اور ــــ اور......" لڑکے کا بدن پھر کانپنے لگا ــــ

پھر ــــ پھر ــــ پھر اس نے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا گلا پکڑ لیا۔ خوب جور سے پکڑ لیا۔ بولا ــــ بولا ــــ دشمن کے بچے ــــ لے ــــ لے لے ــــ تیرا ــــ میرا ــ میرا ــ میرا ــ گلا گھٹ گیا۔ اور، اور، اور میں نے کہا ــــ میں، میں ــــ مر گیا مر گیا ــــ مر گیا ــــ"

لڑکے کی گھگی بند گئی اور بولنے کی کوشش میں وہ توتلے سے توتلا ہوتا گیا۔ اس کے آنسوؤں کے گھونٹ گلے میں پھنستے گئے، اور گھونٹ گھونٹ اور ہچکیوں میں سے اس کی معصوم بولی کے بگڑے ہوئے ٹکڑے میرے دل میں شیشے کی طرح گھستے چلے گئے، میرا سر چکرانے لگا اور اسی چکر میں مجھے ایسا دکھائی دیا کہ ننھی سی کلی دھواں اُگل رہی ہے اور اسی دھوئیں دھوئیں میں، کھائی کا وہ حصہ اپنے آپ میرے سامنے آگیا۔ جہاں ٹھنڈا پانی تھا اور وہیں اپنی جگہ پر لڑکے کے پاس بیٹھے بیٹھے، جیسے اسی ٹھنڈے پانی کے پاس میں پہنچ گیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے مجھے ایسے لگا کہ ایک سپاہی بیٹھا ہوا ہے۔ سپاہی بالکل ویسا ہی، جیسے وہ تھے جو کھائی کے اوپر تھے۔ وہی رنگ، وہی لباس، وہی گیت، وہی گالی، بالکل ویسا ہی۔ سپاہی جس کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا ہے۔ لیکن جس کی بجھی ہوئی آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے۔

جس کے جنگ جو ہاتھ ایک چھوٹے سے لڑکے کے گلے پر فولاد بن گئے ہیں اور لڑکے کی گردن جھک گئی ہے اور پھر کھائی کی کانٹوں دار گھاس کے نیچے سے ایک بھاری پتھر سا بول رہا ہے ــــ "سالا۔ سالا، دشمن کا بچہ، دشمن کا بچہ ــ لے۔ لے۔ لے۔ سالا دشمن کا بچہ ہا"

میری اپنی آنکھوں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں میں مجھے ایسا دکھائی دیا کہ گلا دباتے دباتے سپاہی اپنا منہ بچے کے منہ کے قریب لایا اور لگتا تھا کہ ابھی دانتوں سے اُس کی ناک کو کاٹ کھائے گا۔ پھر جب پانی کی خالی بوتل سپاہی کے زخمی پیر کے نیچے آگئی اور سپاہی رُک گیا ــ "سالا، سالا دشمن کا بچہ ــ سالا، سالا، طوطا۔ سالا ناک طوطے جیسی ــ سالا طوطا ناک سالا ــ سالا ــ سالا طوطا ناک۔"

دھوئیں میں پھر مجھے کچھ ایسا دکھائی دیا کہ پتلے سے گلے پر فولاد کچھ ڈھیلا ہو گیا ــــ

"سالا طوطے کی ناک کہاں سے لایا؟"

"دیکھا کہ جھکی ہوئی گردن سیدھی ہونے لگی۔

"بول، سالے یہ طوطے کی ناک کہاں سے لایا ــ؟ بول ــ اب سالا بولتا کیوں نہیں ــــ کس گاؤں کا ہے سالے؟"

دیکھا کہ لڑکے کا سر ہلنے لگا اور گلا اپنی پوری گولائی میں بھر آیا ــــ

"سالے ــ ابھی زندہ ہے تو، بولتا کیوں نہیں۔"

دیکھا کہ لڑکا خالی بوتل کو ترس رہا ہے اور سوکھے گھونٹ نگل رہا ہے۔

"کس گاؤں سے آیا؟" پھٹا ہوا پتھر گرج سا اُٹھا۔

دیکھا کہ لڑکے نے آنسو پونچھے اور کچھ کہا ــ دیکھا کہ سپاہی کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔

"سالا ــ گاؤں کہاں ــ اس کا تو کوئلہ بھی نہیں اب؟ لیکن سالے یہ ناک کہاں سے لایا؟ ــ طوطا ناک ــ بدری طوطا ــــ"

میری آنکھوں میں دھواں اور کالا ہو گیا اور مجھے صرف لڑکے کا رونا سنائی دیا ——

پھر تیمر گرجا ——

"بدری طوطا —— ؟ تیرا باپ ؟ بدری طوطا تیرا باپ ؟ بدری طوطا تیرا باپ کہاں سے ہو گیا —— ؟"

دھواں کچھ کم ہو گیا اور مجھے سپاہی کے آنسو دکھائی دیئے۔

"بدری طوطا میرا دوست تھا۔ میں اسے طوطا کہتا تھا۔ سب اُسے طوطا کہتے تھے۔ اس کی ناک ایسی تھی جیسی تمہاری۔ بالکل ایسی۔ بالکل طوطے کی۔ تب، تب تم نہیں تھے، تمہاری ماں ہی نہیں تھی۔ بدری طوطا تھا اور ہم تھے۔ طوطا گلی دور پھینکتا۔ درختوں سے اوپر اچھالتا۔ ہم کہتے طوطا اڑ گیا۔ طوطا اُڑ گیا —— اور تم —— تم —— تم بھی طوطے ہو۔ بدری کے بچے —— میرے بچے میں تیرا چاچا ہوں۔ دیکھ میرا خون بہہ رہا ہے، میرے ہاتھوں میں گانٹھ لگانے کی طاقت نہیں۔ لگا دے —— اور دیکھ میں یہیں بیٹھا ہوں۔ اٹھ نہیں سکتا۔ لیکن دیکھ دشمن وہاں سے چلے گا۔ وہ دیکھ راستہ صاف ہے۔ پلٹن کی پلٹن کو اُڑا دوں گا۔ میرے سب آدمی مارے گئے۔ میں بدلہ لوں گا۔ جانتے ہو یہ کیا ہے۔ مشین گن !

"اُٹھ لا بوتل بھر کے۔ میں اور پی لوں گا۔ تم بھی پیو گے۔ لاؤ بھر کے بوتل ——"

دیکھا کہ تھر تھراتا کانپتا لڑکا کھڑا ہو گیا اور بوتل اٹھائے بغیر بھاگنے لگا۔

پتھر پھر پھٹ گیا —— "گولی ماروں گا طوطے —— مت جا !"

دیکھا کہ لڑکا سہم کر وہیں بیٹھ گیا اور اُسی پتھر کی آواز سے گھٹنوں کے بل آگے کھسکتا گیا اور سپاہی کی ٹانگوں پر گانٹھ لگانے بیٹھ گیا۔

میرے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے کی آواز کچھ سنبھل گئی۔ اُس کی ہچکیاں رُک گئیں۔ اُس کے آنسو سوکھ گئے اور میری آنکھوں کا دھواں چھٹ گیا۔ کھائی میں بس میں تھا اور وہ لڑکا!

"پھر —— پھر —— پھر —— تھوڑی دیر میں اوپر سے گولی چلی —— وہ —— وہ ——

وہیں پیچھے کی طرف گر پڑا۔ اور کھڈ کے دو سپاہی نیچے آگئے۔ مجھے بھی پکڑ کر لے گئے۔ اسی کھڈ میں۔"

شام کی اترتی تہوں میں کھو کر اب نہ مجھے واپس جانے کی جلدی تھی، نہ کھائی پار گاڑی کا فکر۔ لڑکے نے ابھری ہوئی مٹی کے ساتھ ٹیک لگائی اور آسمان کو چپ چاپ گھورنے لگا۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا ـــــــ

"سپاہیوں کے ساتھ میرا بھائی تھا ـــ چھوٹا ـــ وہی ان کو لے آیا۔ میرے پاس۔ پانی کے پاس ـــ جہاں وہ ـــ وہ ـــ وہ مر گیا۔ گولی سے ـــ مر گیا ـــ پانی کے پاس ـــ وہ چاچا ـــ"

کل میں مضمون بوسہ لکھتا تھا
پانی منہ میں قلم کے بھر آیا

منشی [illegible] لکھنوی شاگرد مصحفی